تاریخ پاکستان

گیارھویں جماعت کے لیے

"۔۔۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے اس اجلاس کی یہ
رائے ہے کہ کوئی آئینی منصوبہ بغیر اس کے اس
ملک میں قابل عمل اور مسلمانوں کے لئے قابل
قبول نہیں ہو گا جو مندرجہ ذیل بنیادی اصولوں
پر مبنی نہ ہو، یعنی یہ کہ حد بندی کر کے اور ملکی
تقسیم کے اعتبار سے حسب ضرورت ردوبدل
کر کے متصل واحدوں کو ایسے منطقے بنا دیا
جائے کہ وہ علاقے، جن میں مسلمان بہ اعتبار
تعداد اکثریت میں ہیں، جیسے ہندوستان کے شمال و
مغربی اور مشرقی منطقوں میں، اس طرح یک جا
ہو جائیں کہ وہ ایک خود مختار ریاست بنیں"۔

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

تاریخ پاکستان

گیارھویں جماعت کے لیے

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

تیار کردہ : پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور
منظور کردہ : وفاقی وزارتِ تعلیم حکومت پاکستان، اسلام آباد

مصنف : ڈاکٹر سیّد رضی واسطی

مدیر : سبطِ حسن
نگران طباعت : سبطِ حسن

ناشر، نظریۂ پاکستان پرنٹرز رشیدہ زہرہ ٹرسٹ بلڈنگ 10 ملتان روڈ لاہور

مطبع نظریۂ پاکستان پرنٹرز لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابتدائیہ

زیرِ نظر کتاب کو نئے نصاب کے تحت تیار کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو تیار کرتے وقت مندرجہ ذیل باتوں کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے۔

1- کتاب طلبہ و طالبات کے لیے دلچسپ ہو۔ اس سلسلے میں ہر سبق کو اس طریقے سے لکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ طالب علموں کی دلچسپی برقرار رہے۔

2- عام ڈگر سے ہٹ کر یہ کوشش کی گئی ہے کہ محض واقعات پر زور دینے کی بجائے، واقعات کے محرکات و اثرات کے مطالعے اور سمجھ پر دھیان دیا جائے۔ اس کے لیے ضروری اور بنیادی نظریات کی علحٰدہ طور پر تشریح کر دی گئی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ طالب علم اس دور کے معاشرتی، سیاسی اور انتظامی اداروں کے ارتقاء کو سمجھیں۔

3- اکثر اسباق کے آخر میں کتابیات دی گئی ہیں۔ ان سے لکھنے میں مدد لی گئی ہے مگر یہاں ان کو درج کرنے کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ طالب علم اس کتاب میں دیے گئے مواد پر اکتفا نہ کریں، بلکہ اپنے طور پر ان کتب کا مطالعہ کریں اور اس دور کے بارے میں اپنا ایک ذاتی نظریہ بنائیں۔ اس سلسلے مین طالب علم اپنے اساتذہ کرام کے تجربے اور علم سے ضرور فائدہ اٹھائیں۔ اساتذہ کرام سے بہتر کوئی بھی راہنمائی نہیں کر سکتا۔ اساتذہ کرام سے بھی گزارش ہے کہ وہ کلاس میں بحث مباحثے اور تجزیاتی اندازِ تدریس کی حوصلہ افزائی کریں۔

بورڈ ہذا نے ممکنہ طور پر ایک بہتر کتاب آپ کے مطالعے کے لیے تیار کی ہے۔ پھر بھی اس میں بہتری کی بہت گنجائش ہے۔ اس سلسلے میں کوئی استاد، والدین یا طالب علم کسی قسم کی بھی تجویز رکھتے ہوں، یا ان کو کوئی خامی نظر آئے تو انھیں اسے ایک قومی کام سمجھ کر ہماری مدد کرنی چاہیئے۔ بورڈ آپ کی ہر رائے، تجویز یا نشاندہی کو خوش آمدید کہے گا۔

(مدیر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

1

دو قومی نظریہ

"..... محمد بن قاسم جب دریائے سندھ پر خیمہ زن تھا اور راجا داہر سے لڑنے والا تھا، اس نے راجا داہر کی طرف ایک سفارت روانہ کی..... اِس سفارت میں ایک شامی امیر ، ایک مترجم اور ایک مقامی سندھی باشندہ تھا، جو قید ہونے کے بعد مسلمان ہو چکا تھا۔ محمد بن قاسم نے ان کو ہدایت دی کہ وہ اس کا پیغام دربار کے معززین اور امرا کے سامنے پیش کریں اور ان سے حتمی جواب کا مطالبہ کریں۔ جب یہ سفارت راجا داہر کے دربار میں پہنچی تو شامی امیر اور مترجم نے نہ تو دربار میں سر جھکایا اور نہ ہی حسبِ روایت کوئی احترام ظاہر کیا۔"

راجا داہر اور مترجم جس کا نام مولانا اسلامی تھا کے درمیان ایک دلچسپ مکالمہ ہوا:۔

راجا داہر: کیا تم نے کسی دباؤ کی وجہ سے راجا کے سامنے احترام ظاہر نہیں کیا؟

مولانا اسلامی: پہلے میں تمھارے مذہب سے تھا۔ اس لحاظ سے میرا یہ فرض بنتا تھا کہ میں تمھارے سامنے آداب بجا لاتا جس طرح ایک آقا کے سامنے اس کا غُلام بجا لاتا ہے۔ مگر اب میں مشرف بہ اسلام ہو گیا ہوں اور میں خلیفۂ اسلام کے ساتھ وابستہ ہوں، اس لیے میرے لیے یہ ناممکن ہے کہ میں کسی کافر کے سامنے اپنا سر جھکاؤں.....!!

مولٰنا کا یہ دلیرانہ جواب سُن کر راجا داہر نے کہا:۔

"اگر تم سفیر نہ ہوتے تو میں تمھیں قتل کرنے کی سزا دیتا۔"

اِس پر مولانا نے جواب دیا:۔

"اگر تم مجھے قتل کرنے کا تہیہ کر چکے ہو تو میں اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہوں گا۔ اِس کا جواب دینے والے موجود ہیں جو میری موت کا بدلہ لے لیں گے۔ تم کو وہ وہی لوٹا دیں گے جو تم کرو گے۔"

(ہندوستان اور پاکستان میں مسلم قوم پرستی از حفیظ ملک)

(واشنگٹن ڈی سی 1963ء صفحہ 6)

یہ واقعہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور بعدازاں مسلمانانِ ہند کے اجتماعی مزاج اور دوسری اقوام کے سامنے ان کی حیثیت اور تشخص کی دلالت کرتا ہے۔ ہر شخص جو اسلام قبول کرتا وہ اپنے آپ کو معاشرتی اور سیاسی سطح پر مسلم معاشرے اور ریاست سے وابستہ کر لیتا تھا۔ ایسی صورت میں اپنے سابقہ رشتوں کو ترک کر کے وہ اپنے آپ کو ایک نئے سماجی نظام سے جوڑ لیتا تھا۔ اِسی بنیاد پر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانانِ ہندوستان کا الگ ، اور منفرد مزاج پیدا ہوا جو ہر لحاظ سے دوسری اقوام ہند سے مختلف تھا۔

اسی تشخص کو اساس مانتے ہوئے دو قومی نظریہ اُجاگر ہوا۔ اِس نظریے کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان میں دو بڑی اقوام ہیں، ایک مسلمان اور دوسرے ہندو۔ یہ دونوں اقوام اپنے مذہبی نظریات ، اپنے رہن سہن کے انداز اور اجتماعی سوچ میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ دو قومی نظریے کی بنیاد پر ہی مسلمانانِ ہند نے اپنی آزادی کی لڑائی لڑی اور اِسی نظریے کو ایک تاریخی حقیقت مانتے کے بعد ہندوستان میں دو الگ الگ ریاستیں، پاکستان اور بھارت کے نام سے وجود میں آئیں ۔

دو قومی نظریے کے ارتقأ کے سلسلے میں مختلف ادوار کی شخصیات اور ان کے افکار کا مختصر جائزہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:۔

البیرونی (973ء – 1048ء)

البیرونی خورزم کے قریب ایک گاؤں بیرون میں پیدا ہوئے۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد خوارزم کے دربار سے منسلک ہو گئے۔ جب سلطان محمود غزنوی نے خوارزم کی حکومت کا خاتمہ کیا تو دوسرے علما کے ساتھ یہ بھی دربار غزنوی سے وابستہ ہو گئے۔ کسی وجہ سے ان کی سلطان محمود غزنوی سے ناراضگی ہوگئی تاہم اس کے بیٹے مسعود نے لبیرونی کی سرپرستی کی۔ البیرونی نے اپنی زندگی میں 114 نہایت اہم کتب تصنیف کیں۔ یہ کتب، تاریخ، ریاضی، ہیئت، جغرافیہ، طبیعیات، کیمیا اور علم معدنیات وغیرہ کے موضوعات پر ہیں۔ وہ فارسی، عربی، ترکی، خوارزی، عبرانی، یونانی اور سنسکرت کے عالم بھی تھے۔

البیرونی نے سلطان محمود غزنوی کے حملوں کے دوران ہندوستان کے سفر کیے۔ انھوں نے یہاں قیام کے دوران مقامی باشندوں کی زندگی اور افکار کا بغور مطالعہ کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے سنسکرت بھی سیکھی۔ البیرونی نے اپنے مشاہدات کو 'کتاب الہند' میں محفوظ کیا۔ اس کتاب کے مطالعے سے جہاں ہندو معاشرت کے بارے میں اہم معلومات ملتی ہیں وہیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین سماجی اور فکری بُعد اور تفریق کا بھی پتہ چلتا ہے۔

ہندو سماج اپنی تشکیل کے اعتبار سے بیرونی دنیا سے الگ تھلگ رہا اور اس کے باعث ان میں اپنی زندگی اور فکر کے بارے میں ایک خودپسندی پیدا ہو چکی تھی۔ اس کی تفصیل البیرونی نے اس طرح درج کی ہے:-

> "...... ان لوگوں کا اعتقاد یہ ہے کہ ملک ہے تو ان کا ملک، انسان ہیں تو ان کی قوم کے لوگ، بادشاہ ہیں تو ان کے بادشاہ، دین ہے تو وہی جو ان کا مذہب ہے اور علم ہے تو وہ جو ان کے پاس ہے۔ اس لیے یہ لوگ اپنے آپ کو اعلیٰ سمجھتے ہیں اور جو تھوڑا سا علم ان کے پاس ہے اس کو ہی بہت سمجھتے ہیں۔ خودپسندی میں مُبتلا رہ کر وہ جاہل رہ جاتے ہیں۔ جو کچھ جانتے ہیں اس کو بتلانے میں بخل کرنا اور غیر قوم والے

درکنار خود اپنی قوم کے نااہل لوگوں سے بھی شدت کے ساتھ چھپانا ان کی سرشت میں داخل ہے۔ اس کے علاوہ ان کے گمان میں بھی نہیں ہے کہ دنیا میں ان شہروں کے سوا دوسرے شہر اور ان شہروں کے باشندوں کے سوا دوسری جگہ بھی انسان ہیں اور ان کے ماسوا دوسرے لوگوں کے پاس بھی علم ہے۔"

(ابو ریحان البیرونی ص 108)
(مطبوعہ سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور 1971ء)

مسلمانوں کی آمد پر ہندوؤں کا ردِّعمل خالصتاً سماجی تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کے طور طریقوں اور افکار کو نہ صرف قبول نہ کیا بلکہ انھیں ناپاک یا ملیچھ کہہ کر دونوں قوموں کے درمیان ایک وسیع خلیج پیدا کر دی۔ اس سے مسلمانوں کا تشخص اِن خاص سماجی حالات میں الگ تھلگ رہا۔ البیرونی نے اِن حالات کے بارے میں اس طرح لکھا ہے:۔

"(محمود غزنوی کے حملوں سے) جو لوگ بچ رہے ان کو مسلمانوں سے سخت نفرت اور دُوری ہو گئی بلکہ یہی سبب ہے کہ ان کے علوم مفتوحہ علاقوں سے ہٹ کر بنارس اور کشمیر وغیرہ کی طرف چلے گئے۔ جہاں اب تک رسائی نہیں ہوئی ہے اور جہاں سیاسی اور مذہبی وجوہ سے اجنبیوں کے ساتھ بشدت بے تعلقی رکھی جاتی ہے۔"

(ایضاً ص 107-108)

ہندوؤں کو اُس دَور میں مسلمانوں سے اسقدر نفرت تھی کہ وہ بقول البیرونی اپنے بچوں کو مسلمانوں سے ڈراتے، مسمانوں کے لباس، رسوم، عام طریقوں اور یہاں تک کہ مسلمانوں کے برعکس ہر چیز کو اچھا سمجھتے تھے۔

البیرونی کے ان تأثرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ گیارھویں صدی عیسوی کے اوائل میں ہندوستان میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان معاشرتی سطح پر علٰحدہ علٰحدہ راہیں معین ہو چکی تھیں۔ یہ دونوں اقوام ایک سیاسی ڈھانچے میں رہتے ہوئے بھی سماجی اور مذہبی طور پر ایک دوسرے سے بالکل مختلف مزاج کی حامل تھیں۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ

سولھویں صدی عیسوی تک ہندوستان میں فکری سطح پر کئی تبدیلیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ اِن میں ایک اندازِ فکر ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی نظریات میں وحدتِ نظر پیدا کرنے کا متمنی تھا۔ اس اندازِ فکر کے داعی چند صوفیہ کرامؒ بھی تھے جو تمام باشندگانِ ہندوستان کو کسی مذہب کی تمیز کے بغیر برابر سمجھتے تھے۔ اسی زمانے میں اکبر بادشاہ نے اپنی سیاسی ضروریات کے تحت اس اندازِ فکر کو بدل کر ایک نیا طریقہ شروع کیا۔ اس میں وہ اپنی رعایا کو بغیر کسی مذہب کی تمیز کے اپنا وفادار اور مطیع رکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے اِس نئے طریقے میں داخل ہونے والے امیدوار سے بادشاہ کے لیے اپنا مال، جان اور مذہب تک قربان کرنے کا حلف لیا جاتا تھا۔ اسی طریقے کو بعدازاں 'دینِ الٰہی' کا نام دیا گیا۔ یہ طریقہ اپنی ساخت اور کارکردگی کے اعتبار سے سیاسی مقصد رکھتا تھا۔ ایسے حالات میں اسلامی تعلیمات کی روح حد درجہ متاثر ہو رہی تھی۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنے دَور کی مجموعی صورتِ حال میں اسلام کی حیثیت اور اس پر مروج اثرات کا بغور مطالعہ کیا۔ انھوں نے اسلام کو اپنی اصل حالت میں لانے اور لوگوں کے اسلام سے تعلق کو مضبوط بنا کر ہندوؤں سے الگ تشخص تعمیر کرنے پر زور دیا۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ 1564ء میں سرہند میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم آپ نے گھر سے ہی حاصل کی۔ انھوں نے قرآن پاک حفظ کیا۔ حدیث، تفسیر اور فلسفہ کی تعلیم حاصل کی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ نے تصوّف کی منازل طے کرنا شروع کیں۔ پہلے آپ نے اپنے والد محترم سے فیض حاصل کیا اور ان سے چشتیہ اور سہروردیہ سلسلوں کی خلافت حاصل کی۔ بعدازاں دہلی جا کر نقشبندیہ سلسلہ کے مرید ہو گئے۔ تھوڑے ہی عرصے میں انھیں حضرت باقی باللہؒ سے خلافت مل گئی۔

آپ نے سرہند سے اپنی اصلاحی اور تجدیدی تحریک کا کام شروع کیا۔ آپ نے خواص اور عوام ہر دو سطح پر اسلام کی حقیقی تعلیمات کے فروغ کے لیے کوششیں شروع کیں۔ آپ نے شہنشاہ اکبر کے درباریوں اور اُمرا سے تعلقات بڑھائے اور انھیں

نفاذ شریعت کی اہمیت سمجھائی۔ عوام میں تبلیغ کے لیے آپ نے اپنے مریدوں کی ایک جماعت تیار کی۔ حضرت مجددؒ اپنے مریدوں کو خط لکھتے تو وہ اس خط کی بے شمار نقول تیار کر کے اپنے اپنے علاقے میں پھیلا دیتے۔ ان خطوط کے ذریعے حضرت مجددؒ کے خیالات دور دراز کے علاقوں تک پہنچ جاتے تھے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے سب سے پہلے ان علما پر سخت تنقید کی جو اپنی ذاتی غرض مندیوں کی بنا پر بادشاہوں کو گمراہ کر کے اسلام کی حقیقی تعلیمات سے روگردانی کر رہے تھے۔ آپ ان کو 'دین کے چور' کہتے تھے۔ ان کے علاوہ آپ نے ان صوفیہ پر تنقید کی جو شرع سے ہٹ کر غیر اسلامی اور ہندووانہ اندازِ فکر اور طور طریقوں کو فروغ دے رہے تھے۔ حضرت مجددؒ کا خیال تھا کہ اسلامی تصوّف میں ہندووانہ طریقوں کو شامل کرنا بدعت ہے اور اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ وہ ایسے طریقوں کو الحاد اور بے دینی کے مترادف قرار دیتے تھے۔ آپ اسلام اور مسلمانوں کے انفرادی تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے کسی قسم کی نرمی کے قائل نہ تھے۔ انھوں نے مسلمانوں میں رائج ہندووانہ رسوم کو ختم کرنے پر زور دیا۔ آپ ایسی رسوم کو سخت نفرت سے دیکھتے تھے۔ ان رسوم میں ہندوؤں کے تہواروں میں مسلمان عورتوں کی شمولیت، بچوں کے بیمار ہونے پر ٹونا ٹوٹکا کرنا اور دیگر رسوم شامل تھیں۔ آپ چاہتے تھے کہ ہندوؤں پر جزیہ نافذ کر دیا جائے۔ واضح رہے کہ اکبر نے جزیہ ختم کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ حضرت مجددؒ چاہتے تھے کہ ہندو اکثریت کے علاقوں میں مسلمانوں کو اپنی مذہبی رسومات کے سلسلے میں درپیش مشکلات کو ختم کرنے کے لیے ضروری اقدامات کیے جائیں۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تعلیمات اور عملی کوششوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو اپنا تشخص برقرار رکھنے کے لیے حقیقی اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔ وہ صحیح اسلامی تشخص کی تعمیر میں کسی قسم کے ہندووانہ اثرات کو

ن کی تعلیمات کو اورنگ زیب کے دَور میں پذیرائی حاصل ہوئی اور راسخ الاعتقادی کا ایک سلسلہ قائم ہوا۔ اس سے مسلمانوں میں حقیقی اسلامی تعلیمات کی بنیاد پر اپنا تشخص برقرار رکھنے کی تحریک نے جنم لیا۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ

اب تک ہم نے البیرونی اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تعلیمت ور ان کے دوار میں مسلمانوں کے تشخص کی نوعیت اور احوال کا جائزہ لیا ہے۔ لبیرونی کا تعلق اس زمانے سے ہے جب ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد نسبتاً کم تھی اور ان کی یہاں پر حکومت کا دائرہ بھی محدود تھا۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے دور میں مسلم حکومت شمالی ہندوستان میں ایک مضبوط حیثیت کی حامل تھی اور اس دور میں نئے فکری رجحانت مسلمانوں کی معاشرتی زندگی پر اثرانداز ہو رہے تھے۔ ان حالات میں حضرت مجددؒ نے حقیقی اسلامی تعلیمت کو فروغ دینے کی کوشش کی اور اس کا مقصد مسلمان قوم پر غیر اسلامی اثرات کو ختم کر کے انھیں حقیقی معنوں میں اسلامی تعلیمات کے مطابق اپنی زندگی گزارنے پر آمادہ کرنا تھا۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کا دور ہندوستان میں مسلم حکومت کے زوال کا دور تھا۔ اس دور میں مسلمان قوم معاشرتی، سیاسی اور معاشی زندگی میں اپنی حیثیت اور ساکھ کھو رہی تھی۔ شاہ ولی اللہؒ نے ان تمام حالات کو نہایت گہرائی سے سمجھا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ ہندوستان میں مسلم قومیت اس وقت تک مضبوط بنیادوں پر کھڑی نہیں ہو سکتی جب تک وہ اپنی سیاسی، معاشرتی، فکری اور معاشی ضرورتوں کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں نہ ڈھال لیں۔

شاہ ولی اللہؒ 1703ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم کے مدرسے سے حاصل کی۔ بعد ازاں فریضہ حج کے لیے عرب چلے گئے۔ وہاں چودہ ماہ کے قیام کے دوران آپ نے ایک مشہور عالم دین سے تعلیم حاصل کی۔ یہیں قیام کے دوران ان میں یہ انداز فکر پختہ ہوا کہ مسائل پر وسعت نظر کے ساتھ غور کرنا چاہیے اور مختلف مکاتب فکر کے تضادات کو دُور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

1732ء میں آپ دہلی تشریف لائے۔ اس وقت مسلم سلطنت کے زوال، معاشرتی نظام کی فرسودگی اور مسلم حکومت پر مخالف قوتوں کی یلغاروں کے باعث پوری مسلمان قوم کی حالت خستہ ہو چکی تھی۔ مسلمانوں میں ایک گروہ پیداواری ذرائع پر قابض تھا اور غریب عوام کا خون چوس رہا تھا۔ حکمران طبقے کے امرا اپنے اپنے علاقوں میں خودسر ہو رہے تھے اور آزاد ریاستیں قائم ہو رہی تھیں۔

شاہ ولی اللہؒ نے حالات کا بغور تجزیہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا۔

"ہندوستان میں مسلمانوں کے اخلاقی انحطاط کا بنیادی سبب خود اسلام سے ناواقفیت ہے۔ اسلام کی بنیادی تعلیمات قرآن میں ہیں، جس کی سند کو تمام مسلمان تسلیم کر چکے ہیں۔ اس لیے قرآن کی تعلیمات پر زور دینے سے فرقہ وارانہ اختلافات کم ہونے لگتے ہیں اور اتحاد کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ چونکہ اختلافات زیادہ تر شرح و تفسیر پر مبنی ہیں، اس لیے یہ ضروری ہے کہ خود قرآن کی عام اشاعت کی جائے۔

(برِعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ ص 234-235)

اِس سلسلے میں شاہ ولی اللہؒ نے قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ اس ملک میں مختلف گروہ اپنے اپنے فقہی مکاتب کو ایک دوسرے پر ترجیح دیتے تھے۔ اِس سے نزاع کی صورت پیدا ہو جاتی۔ شاہ ولی اللہؒ نے ان مکاتب کے درمیان مصالحت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ آپ نے بدلتے حالات میں اجتہاد کی اہمیت اور ضرورت پر زور دیا۔

تصوف کے مختلف گروہوں میں مختلف باتوں پر مباحث ہو رہے تھے۔ آپ نے اس موضوع پر ایک رسالہ تحریر کیا۔ اس میں انھوں نے زور دیا کہ یہ مباحث محض الفاظ و معانی کا پھیر ہیں۔ مسلمانوں میں فرقہ واریت کو ختم کرنے کے لیے آپ نے نہایت اعتدال پسندانہ نظریات کو فروغ دیا۔ مسلمانوں کے سماجی زوال کا تجزیہ کرتے ہوئے شاہ ولی اللہؒ نے تحریر کیا ہے:

"مجھے غور کرنے سے معلوم ہوا ہے کہ ہمارے زمانے میں دو باتیں ایسی

ہیں، جن کا وجود خرابیِ تمدن کا باعث ہے۔ ایک تو یہ کہ بہت سے لوگوں نے دوسرے پیشوں کو چھوڑ کر اپنے آپ کو حکومت سے وابستہ کر رکھا ہے۔ ان کے معاش کا تمام تر بوجھ بیت المال پر پڑ رہا ہے ....
دوسری خرابی موجودہ تمدن کی یہ ہے کہ زمین داروں اور کاشت کاروں، اہلِ صنعت و حرفت اور تجار پر حکومت نے بھاری ٹیکس لگا رکھے ہیں۔ پھر طرّہ یہ کہ ان کے وصول کرنے میں ان کے ساتھ تشدّد کیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وفادار اور مطیع فرمان رعیت ان ٹیکسوں کے بوجھ تلے دبی چلی جا رہی ہے اور اس کی حالت زبوں سے زبوں تر ہوتی جاتی ہے۔ اور اس مطیع اور فرمانبردار طبقہ کے مقابلے میں رعیت کا ایک اور فریق ہے، جس نے حکومت کے اس ناجائز بوجھ اور عمال کے تشدّد سے تنگ آکر باغیانہ روّیہ اختیار کر رکھا ہے......"

(برصغیر میں مسلم فکر کا ارتقاء ص 221-222).

(مصنف قاضی جاوید ۔ نگارشات، لاہور 1982ء)

اس تجزیے کے ساتھ ساتھ شاہ ولی اللہؒ کا یہ بھی نظریہ تھا کہ کسی بھی قوم کی اجتماعی صحت کے لیے سیاسی اقتدار ناگزیر ہے۔

شاہ ولی اللہؒ کے افکار کا خلاصہ یہ ہے:

1- مسلم معاشرے کے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور فکری شعبہ جات میں زوال کی اصل وجہ قرآنِ کریم کی تعلیمات پر عمل سے گریز ہے۔ اس گریز سے مسلمانوں میں فرقہ واریت اور ذاتی غرض مندیوں کی بنیاد پر چپقلش کی فضا پیدا ہو رہی ہے۔

2- قرآنی تعلیمات کو فروغ دینے کے لیے ضروری ہے کہ تمام مسلمان اعتدال پسندی اور میانہ روی سے فروعی اختلافات ختم کر کے ہم عصر ضروریات اور تقاضوں کے مطابق اسلامی تعلیمات کو ڈھال لیں۔ اس سلسلے میں اجتہاد کے اصولوں پر عمل کیا جائے۔

3- مسلمان اس وقت تک اپنی کھوئی ہوئی ساکھ اور قومی حیثیت حاصل نہیں کر سکتے جب تک وہ ایک ریاست قائم نہیں کر پاتے۔

ان تمام مقاصد کے بغور مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ ولی اللہؒ قرآنی تعلیمات کو فروغ دے کر ایک مسلم معاشرہ تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ اس طرح مسلمان قومیت کو ایک تشخص دینے کے لیے انھوں نے مذہبی تعلیمات کو ضروری قرار دیا۔ ہندوستان میں مسلم قوم پرستی کے لیے شاہ ولی اللہؒ نے قرآنی تعلیمات کو اصل بنیاد قرار دیا۔

تجزیہ

تاریخ میں کسی بھی قوم یا گروہ کے تشخص اور انفرادیت کی تشکیل میں مندرجہ ذیل عوامل مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔

1- اُس قوم کا تاریخی ورثہ کیا ہے؟ مطلب یہ کہ اس قوم کے افراد کا سابقہ ادوار میں کس قسم کا کردار رہا اور ان پر داخلی یا خارجی طور پر کیا اثرات مرتب ہوئے۔ اس کے علاوہ ان اثرات میں اس قوم کی شعوری کوششوں اور اداروں کا کردار کیا تھا۔۔۔۔؟

2- مختلف خارجی یا داخلی تضادات میں اس قوم یا گروہ کے نظریات یا ترجیحات کیا رہیں؟ انھی نظریات اور ترجیحات سے اس قوم کی نفسیات اور مزاج ترتیب پاتا ہے۔

3- مذکورہ بالا دونوں عوامل کی بنیاد پر کسی قوم یا گروہ کے مستقبل کا نصب العین اور مقاصد استوار ہوتے ہیں۔ یہ نصب العین عملی طور پر اس قوم کی تاریخ اور مزاج کے مطابق ہی عملی شکل پاتے ہیں۔ انھی کے مطابق ہی کسی قوم کی اجتماعی قوت تکمیل پاتی ہے۔

ہندوستان میں اپنی آمد سے لے کر قیام پاکستان تک، مسلمانوں کا تاریخی ورثہ، ان کا مزاج اور مستقبل کے عزائم ایک منفرد حیثیت کے حامل رہے۔ اس کی شہادت البیرونی، حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تعلیمات اور ان کے ادوار کے رجحانات سے بخوبی ملتی ہے۔ البیرونی کا دور ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کا ابتدائی دور تھا اور اس دور میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں معاشرتی سطح پر ایک بُعد پیدا ہو چکا تھا۔ اس بُعد کے باعث دونوں اقوام کے درمیان اشتراک کے امکانات ختم ہو گئے اور مسلمانوں کے معاشرتی اداروں کا ارتقا اپنے طور پر جاری رہا۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ کا زمانہ مسلم حکومت کے عروج کا زمانہ تھا اور اس دور

میں مسلمانوں کے معاشرتی رویّوں اور ان کے فکری انداز پر مختلف تاریخی اثرات مرتب ہو چکے تھے۔ اس سے ایسی تحریکات جنم لے رہی تھیں جن میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے بعض گروہوں کے متشدّد افکار کے خلاف ردّعمل پیدا ہو رہا تھا۔ یہ تحریکات انسان دوستی کی بنیاد پر مذہبی تمیز کو ختم کرنے کی خواہاں تھیں۔ انھی تحریکوں کے زیرِاثر دونوں اقوام میں سے نکل کر ایک تیسرا گروہ پیدا ہو رہا تھا جو مذہبی حدود کو نرم یا ختم کرنا چاہتا تھا۔ انھی گروہوں کے زیرِ اثر کئی صوفیانہ سلسلے جاری ہوئے۔

حضرت مجدّد الف ثانیؒ کی تعلیمات اور علمی کاوشوں کا مرکزی خیال یہ تھا کہ ان بدلتے حالات میں جب کہ مختلف مسلم و غیر مسلم گروہ اسلام کے اساسی نظریات میں تبدیلی کے خواہاں تھے، اسلام کی حقیقی اور اساسی تعلیمات کو بعینہٖ قائم رکھا جائے۔ اس سے نہ صرف اسلام بلکہ اس کے ماننے والے مسلمانوں کی معاشرت اور فکری ڈھانچوں پر بھی اثر ناگزیر تھا۔ وہ انھی تعلیمات کی روشنی میں کسی خارجی اثر کو قبول کیے بغیر اپنے تشخص کو اسلام کی حقیقی تعلیمات کے سانچے میں ڈھال سکتے تھے۔ ایسی صورت میں بھگتی تحریک اور مذہبی حدود کو نرم کرنے والے گروہوں کے اثرات کو روکا جا سکتا تھا۔

حضرت مجدّد الف ثانیؒ کی تحریک سے عام لوگوں اور امرا پر مبنی ایک گروہ پیدا ہوا جو زندگی کے ہر شعبے میں ایک خاص نقطۂ نظر کا حامل تھا۔ اس نقطۂ نظر میں بنیادی زور اس بات پر ہوتا تھا کہ اسلام کی تعلیمات کی بنیاد پر مسلمان اپنے آپ کو دوسری اقوام سے الگ رکھیں اور اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں ہی اپنے کردار اور تشخص کو سنواریں۔ اس طبقے کو سیاسی طور پر کامیابیاں بھی حاصل ہوئیں، جن کا عروج اورنگ زیب کا عہد تھا۔

اورنگ زیب کے دور میں مسلم سلطنت خلفشار کا شکار رہی اور اس کے اداروں کو استحکام نصیب نہ ہو سکا۔ اورنگ زیب نے اپنی حکومت کو درپیش داخلی اور خارجی خطرات سے اپنی بصیرت اور محنت سے بچائے تو رکھا مگر اس کے انتقال کے ساتھ ہی نہ صرف مسلم حکومت بلکہ ہندوستان میں مسلم معاشرہ زوال پذیر ہو گیا۔ یہ حالات مسلمانوں کے لیے حد درجہ نازک تھے کیونکہ ان کو کئی اطراف سے خطرات کا سامنا تھا۔

مسلمان امرا اور جاگیردار اپنے اپنے علاقوں میں خودسر ہو رہے تھے۔ مقامی اقوام میں مسلم حکومت سے بغاوت کی کوششیں شروع ہو گئی تھیں۔ سکھوں، مرہٹوں اور جاٹوں نے ہر طرح سے مسلم حکومت کے خلاف کارروائیاں تیز تر کر دی تھیں۔ اس داخلی خلفشار میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی استعماری کوششیں مزید بڑھا دی تھیں۔

ان تمام حالات میں سب اقوام کا نشانہ مسلم حکومت اور مسلمان تھے کیونکہ حکومتی نظام کسی نہ کسی طور انھیں کے ساتھ منسوب تھا۔ ایسے میں مسلمانوں کے معاشی، سیاسی، معاشرتی، اور فکری شعبوں میں شدید قسم کی بے عملی پیدا ہو چکی تھی۔ اس دَور میں شاہ ولی اللہ نے مسلمان قوم کے احوال میں بہتری لانے کے لیے کوششیں شروع کیں۔ انھوں نے بھی اسلامی تعلیمات کی بنیاد پر ہی موجود حالات میں بہتری لانے پر زور دیا۔ اس ضمن میں ان کا خیال تھا کہ قرآن کو بنیاد بنا پر مسلمانوں کو اپنے تمام فروعی اختلافات ختم کر لینے چاہیئیں۔

اٹھارھویں صدی عیسوی میں مسلم حکومت کے زوال کے ساتھ ساتھ مسلمان قوم اور ان کے ادارے بھی انحطاط پذیر ہو گئے۔ شاہ ولی اللہؒ اسی دور میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اس اجتماعی زوال کی وجہ اسلام کی حقیقی تعلیمات سے دوری اور باہمی نفاق کو قرار دیا۔ آپ کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو سیاسی قوت حاصل کرنے کے لیے اپنے اندر یک جہتی اور استحکام پیدا کرنا ہوگا۔ یہ دونوں عناصر اس وقت تک حاصل نہیں کیے جا سکتے جب تک اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مسلمان اپنے اخلاقی مذہبی، سیاسی اور اقتصادی اداروں کو نہ ڈھال لیں۔

یاددہانی کے لیے چند نکات

★ ہندوستان میں مسلم حکومت کے مختلف ادوار میں جو شخص بھی اسلام قبول کر لیتا تھا، معاشرتی اور سیاسی سطح پر وہ اپنے آپ کو مسلم معاشرے اور ریاست سے وابستہ کر لیتا تھا۔

★ البیرونی کے عہد میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں سماجی سطح پر ایک خلیج پیدا ہو چکی تھی۔ اس سے مسلمانوں کو اپنا تشخص قائم رکھنے میں مدد ملی۔

★ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے دور میں ہندوؤں اور مسلمانوں ہر دو اقوام میں ایسے افکار جنم لے رہے تھے جو انسانی بنیادوں پر مذہبی تفریق کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ ان خیالات پر مبنی تصوف کی کئی تحاریک پیدا ہوئیں۔

★ حضرت مجدد الف ثانیؒ مذہبی تفریق کو ختم کرنے والی تحریکوں کو اسلام اور مسلمانوں کے تشخص کے لیے غیر موزوں اور غیر موافق خیال کرتے تھے۔ اس لیے انھوں نے حقیقی اسلامی تعلیمات کی بنیاد پر مسلمانوں کے کردار کو ڈھالنے کی کوشش کی۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تحریک کو اورنگ زیب عالمگیر کے دور میں عروج ملا۔

★ اورنگ زیب عالمگیر کے دور کے خاتمے کے ساتھ ہی ہندوستان میں مسلم حکومت اور معاشرے کا زوال شروع ہو گیا۔ ایسی حالت میں ہر قوم کی طرح مسلمانوں نے بھی اپنے لیے کار آمد افکار اور تعلیمات کی طرف رجوع کیا۔

★ شاہ ولی اللہؒ کا خیال تھا کہ مسلمانوں اور ان کے اداروں میں زوال کی وجہ ان میں فکری یک نفری کا فقدان ہے۔ اسی لیے انھوں نے اعتدال پسندی کو اپنی افکار کی اساس بناتے ہوئے مسلمانوں کے تمام گروہوں کو فروعی نزاع سے چشم پوشی کا مشورہ دیا۔ ساتھ ہی انھوں نے زور دیا کہ صرف قرآنی تعلیمات پر تمام لوگ اتفاق رکھتے ہیں، اس لیے انھی کو اساس مانتے ہوئے تمام اداروں میں بہتری لانی چاہیے۔

★ البیرونی، حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ تینوں بالترتیب ہندوستان میں مسلمانوں کے ابتدائی دور حکومت، دور عروج اور دور زوال سے متعلق ہیں۔ ان تینوں ادوار میں مسلمانوں کے لیے ان کی شناخت کی بنیاد اسلام اور اس کے تحت استوار ہونے والے معاشرتی رویے تھے۔ یہی باتیں انھیں دوسری ہندوستانی اقوام کے مقابل ایک ممیز مقام دیتی ہیں اور وہ بحیثیت قوم ان سے مختلف نظر آتے ہیں۔

★ ہندوستان میں مسلمانوں کے قیام کے دوران ان کا جو منفرد طرز معاشرت اور انداز فکر استوار ہوا اس کی بنیاد پر یہ نظریہ پیدا ہوا کہ ہندوستان میں کئی چھوٹی اقوام کے

ساتھ ساتھ دو بڑی اقوام رہتی ہیں۔ ان میں یک ہندو اور دوسرے مسلمان ہیں۔ ۔ دونوں اپنے رہن سہن ، سوچ ، نصب العین اور دوسرے امور زندگی میں یک دوسرے سے مختلف ہیں۔

* ہندوستان میں دو بڑی اقوام کے درمیان معاشرتی ، فکری اور تاریخی تفریق کی بنیاد پر دو قومی نظریہ استوار ہوا اور سی کی بنیاد پر بعد زاں انیسویں اور بیسویں صدی کے وسط تک قوم پرستی کی کئی تحریکوں نے جنم لیا۔

غور و فکر کے لیے چند نکات

مختصر جواب دیں۔

(i) ہندوستان میں مسلم حکومت کے باقاعدہ قیام سے پہلے محمود غزنوی کے حملوں کے زمانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان معاشرتی سطح پر کس قسم کے تعلقات استوار تھے؟ البیرونی کے خیالات کی روشنی میں تحریر کریں؟

(ii) حضرت مجدد الف ثانیؒ نے پنے دور میں ابھرتے ہوئے نئے رجحانات میں کس قسم کی تعلیمات کو اسلام ور مسلمانوں کے تشخص کے یے ضروری قرار دیا؟

(iii) مسلم معاشرے کے دور زوال میں شاہ ولی اللہؒ کس قسم کی اصلاحات کرنا چاہتے تھے۔ ان سے مسلمانوں کو اپنا تشخص برقرار رکھنے میں کس طرح مدد مل سکتی تھی؟

2

جنگِ آزادی 1857ء

"21 ستمبر 1857ء کو بہادر شاہ (ظفر) نے ہڈسن کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا۔ شہنشاہ (بہادر شاہ ظفر) کے ساتھ ایک گھٹیا مجرم جیسا سلوک کیا گیا۔ انھیں بڑی کسمپرسی کے عالم میں نہایت تکلیف دہ مقام پر رکھا گیا ..... ہر انگریز مرد اور عورت جو دہلی سے گزرتا، جب بھی اس کا دل چاہتا شہنشاہ کے تخلیے میں مخل ہو کر، ان پر حقارت آمیز نگاہ ڈالنے کے لیے، بغیر اجازت اور بغیر کسی پس و پیش کے جا گھستا.....

..... ایک عام، دیسی چارپائی پر ایک تکیے کا سہارا لیے، آلتی پالتی مارے جو شخص بیٹھا نظر آ رہا تھا، وہ عظیم انسان، سلطنت مغلیہ کا آخری نمائندہ تھا۔ میانہ قد، ستر برس سے زائد عمر کا وہ ضعیف آدمی سفید لباس میں ملبوس تھا، اور اسی کپڑے اور رنگ کا مخروطی عمامہ باندھے ہوئے تھا۔ اس کے لبوں کو مطلق جنبش نہیں ہوئی۔ نہایت خاموشی کے ساتھ وہ گم سُم زمین کی جانب نظریں کیے، رات دن بیٹھا رہتا تھا۔ لگتا تھا کہ جس ماحول میں اسے لا کر رکھ دیا گیا ہے، وہ اس سے قطعی بے نیاز اور لاتعلق ہے۔ شاہ سے کوئی تین فٹ کے فاصلے پر ایک دوسری چارپائی پر ایک محافظ بیٹھا ہوا تھا۔ دو بے حد چاق و چوبند یورپی سنتری سنگین لگائے ہوئے، دونوں جانب کھڑے تھے۔

انھیں یہ حکم دیا گیا تھا کہ اگر بادشاہ کو یہاں سے نکال کر لے جانے کی کوئی کوشش کی جائے تو وہ اپنے ہاتھوں سے بادشاہ کو گولی مار دیں۔

Evolution of Pakistan

S.S. Pirzada, Lahore 1963-PP16-17

یہ مغلیہ خاندان کے آخری تاجدار کی بے بسی کی کہانی ہے ، جس خاندان میں اکبر جیسے پُرشکوہ اور اورنگ زیب جیسے باہمت بادشاہ گزرے تھے۔ مغلیہ خاندان کے زوال میں بہادر شاہ ظفر آخری کڑی ثابت ہوا اور پھر یہاں انگریزوں کی حکومت قائم ہوگئی۔

کسی معاشرے یا قوم کا زوال محض اتفاقی نہیں ہوتا۔ یہ ایک مسلسل عمل کے نتیجے میں رونما ہوتا ہے اور اس میں خارجی عوامل کے ساتھ ساتھ داخلی حالات اور رویّوں کا بھی برابر کا حصّہ ہوتا ہے۔ یہ بات بھی طے ہے کہ اگر داخلی حالات میں توازن ہو اور معاشرتی ادارے فعال ہوں تو خارجی محرکات منفی طور پر اثر پذیر نہیں ہو سکتے۔

ہندوستان میں مغلیہ حکومت کے زوال کا عمل باقاعدہ طور پر اورنگ زیب کی وفات (1707ء) سے شروع ہوا۔ یہ عمل 1857ء کی جنگ آزادی کی صورت میں اپنے منطقی انجام کو پہنچا اور ہندوستان کی تاریخ ایک نئے دَور میں داخل ہوگئی۔ 1707ء سے 1857ء کے درمیانی عرصے میں ہندوستان میں خلفشار اور عدم استحکام غالب رہا۔ اِس دَور کے اہم رجحانات یہ تھے:۔

سیاسی حالات

اورنگ زیب کی سلطنت ایک وسیع علاقے پر محیط تھی۔ اس نے اپنی ساری عمر استحکام سلطنت کے لیے تگ و دَو میں گزار دی۔ اِس کوشش میں وہ جزوی طور پر کامیاب رہا اور سیاسی انتشار کسی قدر دب گیا۔ اورنگ زیب کے جانشین اِس وسیع سلطنت کو استحکام دینے میں ناکام رہے، جس کے نتیجے میں مرکزی حکومت کا صوبوں

کے انتظام میں عمل دخل کم ہو گیا۔

مرکزی حکومت کی انتظامی کمزوریوں کے باعث صوبوں میں سیاسی خلفشار میں اضافہ ہونے لگا۔ وہ گروہ جو اورنگ زیب کی فوجی قوت اور سیاسی بصیرت کے سامنے دم نہ مار سکتے تھے، انھوں نے اپنی سرگرمیاں دوبارہ شروع کر دیں۔ یہی نہیں بادشاہ کے اپنے پروردہ جاگیر دار اور امرا بھی اپنے اپنے مفادات کے حصول کے لیے سرگرم عمل ہو گئے۔ اس سے سلطنت کے ہر گوشے میں مرکز سے علحدگی اور خودمختار ریاستوں کے قیام کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ اودھ، حیدرآباد، بنگال اور کئی علاقوں میں خودمختار مسلم ریاستیں قائم ہو گئیں۔ مرہٹوں نے جنوبی ہندوستان اور شمالی ہندوستان کے چند علاقوں پر اپنا سیاسی اثر قائم کر لیا۔ پنجاب میں سکھوں نے ایک وسیع خودمختار ریاست قائم کر لی۔

مرکزی حکومت سے علحدگی کے بعد قائم ہونے والی ریاستوں میں جب وسعت پسندی کی خواہش نے غلبہ کیا تو ان کے درمیان مخاصمت شروع ہو گئی۔ اس صورتحال میں فوجی قوت کا عالم یہ تھا کہ پہلے جہاں بادشاہ کے طلب کرنے پر لاکھوں کا لشکر متحد ہو کر اس کی کمان میں آ جاتا تھا، اب اس قوت کی بڑی سے بڑی اکائی ایک ریاست کی مختصر فوج تک محدود ہو گئی تھی۔ بادشاہ کی قوت کا عالم یہ تھا کہ مغلیہ سلطنت کے آخری سالوں میں اس کا حلقۂ شر دہلی کے شاہی قلعہ تک محدود تھا۔

مذکورہ حالات اس بات کا ثبوت ہیں، کہ اورنگ زیب کے بعد مغل قوت ٹوٹ پھوٹ کر کئی چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ یہ تمام اکائیاں آپس کی نااتفاقیوں کے باعث کسی بھی خارجی خطرے کی صورت میں مؤثر دفاعی صلاحیت سے عاری تھیں۔

ایسے حالات کسی بھی خارجی قوت کے اثر و نفوذ کے لیے کارآمد ہو سکتے تھے.... ایسٹ انڈیا کمپنی جو اس وقت تک محض ایک تجارتی ادارہ تھی نے اپنے مقاصد کو تبدیل کرنا شروع کر دیا۔ انھوں نے مقامی تضادات سے مکمل طور پر فائدہ اٹھایا۔ کمپنی نے مقامی ریاستوں کی باہمی لڑائیوں کو ہوا دے کر، ان کی قوت کو مزید کمزور

1792
بنگال
بہار
بمبئی
مدراس
1835
اودھ
اجمیر
برطانوی تسلط
پنجاب
سندھ
جھانسی
حیدرآباد
میسور
1856
برطانوی سلطنت میں توسیع

کیا۔ اس سے مقامی گروہوں میں قوت مزاحمت ختم ہو کر رہ گئی۔

کمپنی بنیادی طور پر سامراجی عزائم کی حامل تھی، اور ان عزائم کے تحت اس کی خواہش تھی کہ ہندوستان کے تمام اہم وسائل پر اس کا تصرف قائم ہو جائے۔ ان وسائل کو انگلستان منتقل کر کے، وہ وہاں کی صنعتی ترقی کے لیے استعمال کرنے کی خواہشمند تھی۔ کمپنی نے اہم پیداواری علاقوں پر قبضے سے اپنے عزائم کی پہلی اینٹ رکھی۔ کمپنی کے مقبوضات کا سن وار خاکہ حسب ذیل ہے۔

1792ء تک ——— بہار، بنگال، مدراس اور گھورکھپور۔

1835ء تک ——— یوپی، کرناٹک، میسور، وجیانگر، کیرالہ اور کولہاپور وغیرہ۔

1856ء تک ——— اودھ، برار، وسطی ہند، جھانسی، ناگپور، آسام، پنجاب، سندھ وغیرہ۔

ہندوستان میں اپنی مقبوضات بڑھانے کے سلسلے میں انگریزوں نے جو ہتھکنڈے استعمال کیے، ان میں درج ذیل اہم تھے:

1- مقامی راجاؤں کی باہمی لڑائیوں میں وہ کسی ایک کی پشت پناہی کر کے دوسرے کو شکست دے کر بے یار و مددگار کر دیتے۔ پھر اس کو آسانی سے اپنے زیر تسلط لے آتے۔ اس پالیسی پر عمل کر کے انھوں نے بنگال، میسور، سندھ، پنجاب، اودھ اور بہت سے دوسرے علاقوں کا الحاق (1) کر لیا۔

---

1 الحاق:۔ وسعت پسندی میں عام طور پر دو پالیسیاں اپنائی جاتی ہیں، ایک، کسی ریاست یا علاقے کا لحاق کرنا اور دوسرا مکمل طور پر اس پر قبضہ کرنا ہو سکتا ہے۔ قبضے کی صورت میں کوئی بھی خارجی طاقت، مقبوضہ علاقے کے تمام تر انتظامی، سیاسی اور اقتصادی معاملات کا ذمہ سنبھال لیتی ہے۔ لحاق کی صورت میں خارجی طاقت خاص امور یا مفادات کے علاوہ باقی تمام معاملات مقامی سربراہ مملکت کے پاس رہنے دیتی ہے۔ انگریزوں نے ہندوستان میں اپنی وسعت پسندی میں عام طور پر الحاق کی پالیسی اپنائی۔ وہ کسی بھی ریاست کے حکمران کو اپنے مفادات کے تحت خاص شرائط ماننے پر مجبور کرتے اور وہاں پر اپنا نمائندہ مقرر کر دیتے تھے۔ ظاہر حکومتی معاملات کا ذمے دار

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

2- چونکہ کمپنی کا بنیادی مقصد ہندوستانی وسائل پیداوار کو اپنے استعمال میں لانا تھا، اس لیے انھوں نے مقامی سیاسی اور انتظامی ڈھانچے کو اپنی ضرورت کے تحت بدل دیا۔ اس حربے سے سابقہ سیاسی نظام اور اہم حکومتی گروہوں کو غیر مؤثر بنانا بھی ممکن ہو گیا اور سابقہ حکومتی گروہوں سے مزاحمت کا خطرہ بھی ٹل گیا۔ اس ضمن میں کئی قوانین پر عمل کیا گیا جن میں ایک کے تحت کسی بھی ریاست کے قدرتی وارثوں کو راجگی سے محروم کر دیا گیا۔ اس قانون کا براہِ راست اثر ہندو ریاستوں پر پڑا۔ اِن میں جھانسی اور کئی دوسری ریاستیں شامل تھیں۔

الحاق شدہ ریاستوں میں انگریزوں نے 'امدادی نظام' کی ایک پالیسی بھی شروع کی۔ اِس پالیسی کے تحت ان ریاستوں کو مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ اپنے خرچ پر وہاں پر متعین انگریزی فوج کے انتظام کا ذمہ اٹھائیں۔ اگر کوئی ریاست اپنے مالی حالات کے باعث ایسا کرنے سے معذوری ظاہر کرتی تو اس ریاست کے علاقوں کو کمپنی کے حوالے کرنے پر زور دیا جاتا اور ان علاقوں کی آمدنی سے انگریزی فوج کے اخراجات پورے کیے جاتے تھے۔ کسی بھی ریاست میں انگریزی فوج کی موجودگی کا مطلب ہر لحاظ سے انگریزوں کی بالادستی کو قبول کرنا ہوتا تھا۔

معاشی حالات

قدیم زمانے سے ہندوستان اپنے کثیر وسائل اور پیداوار کے باعث خودکفیل رہا۔ داخلی طور پر پیداواری تقسیم غیر مساویانہ تھی اور کسان اور مزدور اپنے پیدا کردہ وسائل سے بہت کم حِصّہ حاصل کر پاتے تھے۔ ان کی پیداوار کا زیادہ تر حِصّہ حکومتی گروہ ہڑپ کر جاتے تھے۔ عام لوگ نہایت ادنیٰ معیار زندگی رکھتے تھے۔

بقیہ حواشی

مقامی راجا ہی ہوتا تھا مگر درحقیقت اس ریاست کے تمام وسائل پر انگریز نمائندے کا ہی حکم چلتا تھا۔ اس طریقے سے انگریز مقامی معاملات میں غیر ضروری طور پر اُلجھنے کی بجائے صرف اپنے مفادات کے شعبوں تک ہی اپنا عمل دخل محدود رکھتے۔ اس پر ان کی توجہ اور قوت غیر ضروری معاملات میں نہ بٹتی تھی۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد سیاسی عدم استحکام سے اقتصادی بدحالی بھی پیدا ہوئی۔ اِس سے عام کسانوں اور مزدوروں کی حالت تو غریبی سے بھی نچلی سطح پر چلی گئی، ساتھ ہی بادشاہوں کے دَور میں خوشحال حکومتی گروہ بھی قلاش ہو گئے۔

اس ضمن میں تبدیلی اِس طرح ہوئی۔

۱۔ بادشاہوں کی آمدنی میں کمی

بادشاہوں کی آمدنی کا سب سے اہم ذریعہ زرعی پیداوار پر محصول تھا۔ زرعی زمینوں پر جاگیرداروں کی وساطت سے کاشت کاری کروائی جاتی اور ان پر جاگیرداروں کا ہی تصرف ہوتا تھا۔ سلطنت میں کچھ اراضی براہِ راست بادشاہ کے تصرف میں ہوتی تھی۔

نئی خودمختار ریاستوں کے قیام سے سلطنت کی اراضی میں کمی سے بادشاہ کی آمدنی کم ہوتی گئی ۔ ایک وقت ایسا بھی آیا ، جب انھیں مکمل طور پر اپنے زیر تصرف زمین پر انحصار کرنا پڑا ۔ مگر یہ زمینیں ان کی فوجی ، انتظامی اور ذاتی ضروریات کے لیے کافی محاصل مہیا نہ کر سکتی تھیں ۔ اس لیے انھوں نے ایسی زمینوں کو بااثر جاگیرداروں کو بیچ کر یا گروی رکھ کر اپنی ضروریات کو پورا کرنا شروع کر دیا ۔ اس طرح انیسویں صدی کے وسط تک ان کی ملکیت محض شاہی قلعہ تک ہی محدود ہو گئی ۔

اورنگ زیب کے بعد قائم ہونے والی ریاستوں کا ابتدا میں اپنے مقامی ذرائع آمدنی پر انحصار تھا ۔ آپس کی لڑائیوں کے باعث ان کے فوجی اخراجات بڑھ گئے ۔ چونکہ مقامی وسائل محدود تھے ، اس لیے راجاؤں کو بڑے بڑے تاجروں اور ساہوکاروں سے قرضہ لینے پر مجبور ہونا پڑا ۔ یہ قرضہ انھیں منقولہ یا غیر منقولہ جائداد رہن رکھ کر ہی ملتا تھا ۔

بعد ازاں جب انگریزوں نے ریاستوں میں امدادی نظام اور دوسری پالیسیوں کو نافذ کرنا شروع کیا تو پہلے سے قرضے تلے دبی ریاستوں کا کچومر نکل گیا اور انھیں اپنی تمام جائدادیں ساہوکاروں کے سپرد کرنا پڑیں ۔

II- ساہو کاروں کے ایک نئے گروہ کا غلبہ

1707ء سے 1857ء تک جو اقتصادی اُلٹ پلٹ ہوئی اس میں یسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے حلیف ساہو کاروں کو خوشحالی حاصل ہوئی ۔ ہندو ساہو کاروں کا یہ گروہ، ابتدا میں انگریزوں کے ایجنٹ کے طور پر کام کرتا تھا اور یہ مختلف علاقوں سے مصنوعات اکٹھی کر کے یا خود تیار کروا کے انگریزوں کے تجارتی مراکز تک پہنچاتا تھا ۔ اس کام میں انھیں تجارتی فائدہ ہوا اور ساتھ ہی انگریزوں کی سرپرستی سے انھیں بینکاری (BANKING) اور سرمایہ کاری (FINANCING) کے میدان میں بڑی کامیابیاں ہوئیں ۔ اس سلسلے میں جگت سیٹھوں (1) کے خاندان نے بڑی شہرت حاصل کی ۔

---

(1) جگت سیٹھ ۔ کا مطلب ہے دنیا کا ساہوکار ۔ یہ ایک خطاب تھا جو دہلی کے بادشاہ نے 1723ء میں بنگال کے ایک بہت بڑے سیٹھ فتح چند کو دیا تھا۔ اس دور میں اس سیٹھ کی بینکاری کی شاخیں ڈھاکہ اور پٹنہ کے شہروں میں تھیں۔ ان کا مرکزی دفتر مرشد آباد میں تھا۔ اس زمانے کے انگریز اور مقامی مصنف جگت سیٹھوں کی بینکاری کو بینک آف انگلینڈ کے برابر قرار دیتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان سیٹھوں کی بینکاری کا دائرہ اور سرمایہ بہت وسیع تھا اور یہ حکومت کے مالی معاملات میں بھی اہم حصہ لیتے تھے۔ اس دور میں بنگال میں سونے اور چاندی کی خرید و فروخت، مرشد آباد میں ٹکسال کا قیام، صوبائی حکومت کے لیے زمینداروں سے لگان وصول کرنا اور تمام دولت کو دوسری کرنسیوں سے تبادلے کے بعد شاہی خزانے میں جمع کرانا ان کے ذمے تھا۔ دوسرا جگت سیٹھ فتح چند کا پوتا مہتاب چند تھا۔ اس کے علی وردی خان، والئ بنگال سے بڑے اچھے مراسم تھے۔ نواب سراج الدولہ نے اس کی مذموم کارروائیوں کی وجہ سے اس کی نہ صرف بے عزتی کی بلکہ اس کو دربار میں آنے سے روک دیا۔ سیٹھ مہتاب چند نے سراج الدولہ کے خلاف انگریزوں کی سازش میں نہ صرف حصہ لیا بلکہ مالی امداد بھی کی ۔ سراج الدولہ کی موت کے بعد میر قاسم کے دربار میں اسے خاصی پذیرائی حاصل ہوئی مگر میر قاسم اس کی وفاداری کو مشکوک سمجھتا تھا۔ آخر کار اس نے جگت سیٹھ کو 1763ء میں مروا دیا۔ بعد میں بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت قائم ہونے پر، سیٹھوں کا بُرا حال ہوا۔ کمپنی نے اس پر واجب ادا کروڑوں کے قرضوں کو سیٹھوں کو واپس لوٹانے سے انکار کر دیا۔ اس سے جگت سیٹھوں کے خاندان کو تیزی سے زوال آگیا۔ تاہم بعد کی نسلوں میں جگت سیٹھ کا خطاب چلتا رہا۔ 1912ء میں یہ خطاب بھی واپس لے لیا گیا۔

ان کا مشرقی ہندوستان میں ہنڈی (1) کا کاروبار تھا ۔

III- بے روزگاری

اٹھارھویں صدی کے وسط تک ہندوستان کی معیشت اپنی کمزور ترین حالت تک پہنچ چکی تھی ۔ صوبائی خودمختاری اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے قیام سے آبادی میں روزگار کے لیے نقل مکانی کا رجحان بڑھا ۔ اس سے بڑے بڑے شہر اپنی تجارتی حیثیت کھو بیٹھے۔ ان شہروں کی منڈیاں ختم ہو گئیں ۔ شمالی ہندوستان میں آگرہ ایک اہم منڈی تھی ۔ یہاں ٹیکسٹائل کی مصنوعات کا بہت بڑا مرکز تھا ۔ 1712ء تک اس کی یہ حیثیت ختم ہو گئی۔ اسی طرح دہلی اور مرشد آباد کی تجارتی منڈیوں میں مندے کے باعث شمالی ہندوستان کے صنعتی کاریگر اور دست کاریوں کے تاجر قلاش ہو گئے ۔ پنجاب میں سکھوں کی شورش کے باعث لاہور کی طرف آنے والے تمام تجارتی راستے مخدوش ہو گئے تھے ۔

ہندوستان کے شمال مشرقی علاقوں ، بنگال ، بہار اور اڑیسہ میں مرہٹوں کی فوجی کارروائیوں کے باعث یہاں اجناس کی قلت ہو گئی ۔ ان علاقوں میں موجود تمام زرعی اور صنعتی ذرائع پیداوار کا نام ٹھپ ہو گیا ۔ یہاں ریشم اور سوت کے کاریگر اور تاجران محفوظ مقام کی تلاش میں مشرقی بنگال کی طرف بھاگ گئے ۔ چھوٹی چھوٹی بے شمار ریاستوں کے قیام سے تجارتی مال کی نقل و حمل پر جگہ جگہ محصول دینے سے مال کی قیمت بہت زیادہ بڑھ جاتی جو خریداروں کی قوت خرید سے کہیں زیادہ ہوتی تھی ۔ اس سے ریاستوں کے درمیان تجارت عملی طور پر ناممکن ہو گئی تھی ۔

ہندوستان کے زرعی میدان پیداوار میں بھی حالات دگرگوں تھے ۔ کمپنی کے نئے

---

(1) ہنڈی (BILL OF EXCHANGE) معاشیات کی اصطلاح میں اس سے مراد وہ غیر مشروط تحریری حکم نامہ ہے جس پر صرف اعتماد کی بنیاد پر کوئی فروخت کنندہ جب مال فروخت کرتا ہے ۔ خریدار مقررہ وقت میں فروخت کنندہ کے کسی اور حکم نامزد کردہ شخص یا ادارے سے رقم وصول کرتا ہے۔ ہنڈی دو قسم کی ہوتی ہے ایک کو درشنی اور دوسری کو مدتی ۔ درشنی ہنڈی کی رقم حسب طلب ادا کرنی پڑتی ہے جب کہ مدتی ہنڈی کی رقم مقررہ میعاد کے بعد واجب الادا ہوتی ہے۔

ٹیکسوں کے باعث مقامی زمینداروں نے اپنے کسانوں پر دن بدن محصول کی شرح بڑھانا شروع کر دی ۔ اس ناقابل برداشت معاشی صورتحال میں بہت سے لوگوں نے شہروں کی طرف نقل مکانی شروع کر دی ۔ شہروں میں آکر وہ نئی لگنے والی درمیانے درجے کی صنعتوں میں مزدور ہو گئے یا دوسرے شعبوں میں معمولی محنت ، مزدوری کا کام کرنے لگے ۔ اس سے شہروں میں آبادی کا دباؤ بڑھنے لگا اور نئے معاشرتی رویے پیدا ہونے لگے ۔

١٧- کمپنی کی اقتصادی ہتھکنڈے

اِن معاشی حالات میں سب سے زیادہ فائدہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو حاصل ہوا ۔ اس نے تمام ذرائع پیداوار کو اپنے کنٹرول میں کیا اور ہندوستانی سرمایہ پر اپنا تصرف قائم کر لیا ۔ اس ضمن میں کمپنی نے جو ہتھکنڈے استعمال کیے اُن کی تفصیل یہ ہے ۔

(i) کمپنی نے اپنی تجارت کو تحفظ دینے کے لیے تمام انگریزی مصنوعات پر ڈیوٹی کم کر دی اور اس کے مقابلے میں مقامی مصنوعات پر بھاری ٹیکس عائد کر دیے ۔ اس پالیسی سے مقامی مصنوعات کی پیداوار اور کھپت ختم ہو گئی اور انگریزی مصنوعات کی ہندوستان میں اجارہ داری قائم ہو گئی ۔ کمپنی کو اپنی ہندوستانی تجارت سے جو سرمایہ حاصل ہوتا تھا ، اس کی یہیں سرمایہ کاری کرنے کی بجائے ، اسے انگلستان منتقل کر دیا جاتا تھا ۔ اس سے جہاں ایک طرف ہندوستانی معیشت اپنے سرمائے سے محروم ہو رہی تھی ، وہیں ہندوستانی معیشت میں سرمایہ کاری اور وسعت کے امکانات معدوم ہو گئے ۔ ایسی صورتحال میں روزگار کے متوقع مواقع کم ہو گئے اور مقامی تاجروں ، صنعتکاروں اور صنعتی مزدوروں کی ایک کثیر تعداد بے روزگار ہو گئی ۔

(ii) کمپنی کے قائم کردہ نظام میں تمام تر اہم اور کلیدی اسامیوں پر صرف اور صرف انگریزوں کو بھرتی کیا جاتا تھا ۔ ان اہلکاروں کو انگلستان کی کرنسی میں بڑی بڑی تنخواہیں دی جاتی تھیں ۔ اس سے مقامی معیشت پر دوہرے مضر اثرات مرتب ہو رہے تھے : ایک طرف مقامی لوگوں کو روزگار سے محروم رکھا جاتا تھا اور دوسری طرف کثیر سرمایہ تنخواہوں کی صورت میں باہر منتقل ہو جاتا تھا ۔ چونکہ انگریز اہلکاروں کو

ان کی نوکری کے دوران ان کی ضرورت کی تقریباً تمام اشیاء مہیا کی جاتی تھیں ، اس لیے ان کو ادا کی جانے والی تنخواہیں عام طور پر ان کی بچت کی صورت میں ریٹائرمنٹ یا اس سے پہلے انگلستان منتقل کر دی جاتی تھیں ۔ پنشن کی رقوم کی ادائیگی بھی انگلستان میں ، اس ملک کی کرنسی میں ادا کی جاتی تھی ۔

ہندوستان کی معیشت کی تباہی سے بے روزگاری ویسے ہی بہت زیادہ ہو رہی تھی ۔ لوگ کوئی بھی کام کر کے اپنے بچوں کا پیٹ پالنے پر تیار تھے ۔ اِس دَور میں بہت سے لوگ کسی بھی راجا کی فوج میں سپاہی بھرتی ہو جاتے تھے ۔ بعد ازاں انگریزوں نے ایک پالیسی کے تحت ، جب ریاستوں کو مقامی طور پر فوج کی بھرتی کی ممانعت کر دی تو یکسر سینکڑوں لوگ بے روزگار ہو گئے ۔ واضح رہے کہ یہ لوگ کمپنی کی ملازمت بھی نہ کر سکتے تھے ۔

(iii) تجارت اور صنعتوں پر کمپنی کی اجارہ داری قائم ہو جانے کی وجہ سے ، کمپنی اپنی من مانی شرائط پر کاریگروں اور دست کاروں سے مال تیار کرواتی تھی ۔ کمپنی کے ایجنٹ منڈی کے مقابلے میں نہایت کم معاوضے اور بہت کم وقت میں مصنوعات تیار کرنے کا کہتے تھے ۔ کاریگر ، اس صورتحال میں سخت نالاں تھے مگر کمپنی کے سامنے اُف تک نہ کر سکتے تھے ۔ اگر کوئی کاریگر احتجاج کرتا تو اسے سخت سزائیں دی جاتی تھیں ۔ چونکہ کاریگروں کا کوئی بھی پرسانِ حال نہ تھا ، انھوں نے اَپنے آپ پر مسلّط ظلم کی اصل وجہ یعنی ان کے فن کو ہی ختم کر دینا مناسب سمجھا ۔ صاف ظاہر ہے کہ ان کاریگروں کو ان کے اعلیٰ فن کی وجہ سے ہی کمپنی کے ظلم سہنا پڑتے تھے ۔ اِس ضمن میں بنگال کی مشہور ململ کے کاریگروں کا ردِّعمل بڑا افسوسناک تھا ، انھوں نے اپنے انگوٹھے ہی کٹوا دیے ، جن سے وہ ململ تیار کرتے تھے ۔ واضح رہے کہ ان انگوٹھوں سے ہی وہ اپنا روزگار بھی حاصل کرتے تھے ۔ اِس طرح ظلم سے نجات حاصل کرنے کے لیے ان کاریگروں نے اپنے روزگار کے ذریعے کو بھی ترک کر دیا ۔

کاریگروں پر ظلم سے ایک اور پہلو جو سامنے آتا ہے ، وہ کاریگروں کا صدیوں

پرانے فن کو ترک کرنے سے متعلق ہے ۔ اس سے نہایت اعلیٰ دست کاریوں کا فن ہی ختم ہونے لگا ۔ کاریگروں نے اب کاشت کاری کو بطور پیشہ اختیار کرنا شروع کر دیا ۔ کاشت کاری میں غیر ترقی دادہ طریقوں کے رواج کے باعث اِس میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو کھپانے کی اہلیت اور گنجائش نہ تھی ۔ اس سے عام لوگوں کے مسائل مزید بڑھ گئے اور وہ معاشی طور پر سخت پریشان ہو گئے ۔

دیہات کی معاشی صورتحال کو بہتر کرنے کے لیے انگریزوں نے کسی طور کوئی بہتر پالیسی نہ اپنائی ۔ 1793ء میں 'دوامی بندوبست' کے نظام کو کچھ صوبوں میں نافذ کر دیا گیا تھا ۔ اس نظام کے تحت زمینوں کی کاشت کی ذمے داری ، جاگیرداروں کے سپرد کر دی گئی ۔ زمینداروں کو مستقل بنیادوں پر ایک رقم بطور مالیہ حکومت کو ادا کرنا ہوتی تھی ۔ اِس نظام میں حکومت کا براہ راست تعلق اور واسطہ زمینداروں تک محدود تھ ۔ زمیندار اپنی مرضی سے کاشت کاروں سے رقم وصول کرتے ، اور حکومتی مالیہ ادا کرنے کے بعد بقیہ رقم خود رکھ لیتے تھے ۔ اس نظام میں یہ طے نہ کیا گیا تھا کہ زمیندار ، کسانوں سے زیادہ سے زیادہ کس قدر رقم وصول کریں ۔ اس سے زمینداروں کو کھلی چھٹی مل گئی اور وہ کسانوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنے لگے ۔ بعض مقلمات پر مالیے کا تعین ، زمین کی پیداواری صلاحیت سے مطابقت نہ رکھتا تھا ۔ ایسی جگہوں پر کسانوں کو دوہری دھار سے ذبح کیا جا رہا تھا ۔

'دوامی بندوبست' کے نفاذ اور اس کے تحت زمینداروں کو کھلی چھٹی دینے کا مقصد ، ان زمینداروں کی کمپنی کے لیے وفاداریاں حاصل کرنا تھا ۔ مقامی زمیندار اپنے اپنے علاقوں میں وہاں کی زندگی کے تقریباً ہر شعبے میں اپنا اثر اور عمل دخل رکھتے تھے ۔ ان کے علاقے میں کوئی شخص بھی ، ان کے سامنے دم نہ مار سکتا تھا ۔ کمپنی نے اپنی طاقت اور اثر کو انھی زمینداروں کی معرفت دیہاتی علاقوں کے چھوٹے سے چھوٹے یونٹ تک پھیلایا ۔

3- معاشرتی حالات

انگریز ، سامراج تھے ، اس لیے انھوں نے ہندوستان پر سیاسی و انتظامی کنٹرول

کے بعد یہاں کے سرمایہ اور تمام پیداواری ذرائع پر قبضہ کرنے پر اکتفا نہ کیا۔ سامراجیت میں چونکہ کوئی قوم کسی دوسرے ملک یا قوم کو اپنی طاقت اور چالبازیوں سے اپنے اثر میں لاتی ہے ، اس لیے اسے ہمیشہ مقامی لوگوں کی مزاحمت اور ردِعمل کا خوف رہتا ہے۔ مقامی لوگوں کی قوت مزاحمت اور ان کے اداروں کو غیر مؤثر بنانے کے لیے ، سامراجی قوتیں معاشرتی سطح پر ایسا ماحول استوار کرتی ہیں ، جس میں مقامی لوگ ایک نفسیاتی خلفشار کا شکار کر دیے جاتے ہیں۔ ایسے میں وہ اپنے آپ سے ، اپنے صدیوں پرانے ریت رواج اور معاشرتی اداروں سے بے گانہ ہو جاتے ہیں۔ اس سے پوری قوم میں بے عملی کا ایک احساس پیدا ہو جاتا ہے اور ان میں زندگی کرنے کی قوت تک ختم ہو جاتی ہیں۔

انگریزوں نے اپنے سامراجی عزائم کے حصول میں معاشرتی سطح پر جو حربے اپنائے ، ان میں سے چند ایک کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

۱۔ انگریزوں کو اعلیٰ ثقافت کے نمائندے کے طور پر پیش کرنا

انگریزوں نے اپنے رویّوں اور پالیسیوں سے مقامی لوگوں کو یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ وہ مقامی لوگوں کے مقابلے میں ایک اعلیٰ تہذیب اور ثقافتی ورثے کے نمائندہ ہیں۔ ان کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ وہ ہندوستان میں اعلی تہذیبی روایات کے فروغ کے لیے آئے ہیں۔

اس تاثر کے فروغ میں ، انگریزوں کا بنیادی مقصد زندگی کے ہر شعبے میں انگریز نسل اور اس سے وابستہ لوگوں کی برتری قائم کرنا تھا۔ مقامی لوگ جب ان لوگوں کی برتری کو تسلیم کر لیں گے تو وہ انھی لوگوں کے سیاسی ، انتظامی اور معاشی اقدامات کو بھی اعلیٰ سمجھتے ہوئے قبول کر لیں گے۔ اس طرح مجموعی طور پر معاملات حکومت انگریزوں کی مرضی کے مطابق چل سکیں گے۔

نسلی اور تہذیبی برتری کے اس نظریے کے تحت جو معاشرتی تبدیلیاں آئیں ، اُن میں انگریزوں کے حلیف ایک طبقے کا پیدا ہونا سب سے اہم تھا۔ یہ طبقہ انگریزوں کے حکومتی طبقے سے قُرب پیدا کر کے ایک طرف تو اُن سے مراعات حاصل کرنے کا

خواہشمند تھا تو دوسری طرف اپنی روایات سے اپنا تعلق توڑ کر اپنے آپ کو انگریزی اندازِ معاشرت کے رنگ میں ڈھالنا چاہتا تھا۔ انگریزوں کو بھی چونکہ ہندوستان میں اپنے ایک حلیف طبقے کی ضرورت تھی، اس لیے انھوں نے اس طبقے کو مراعات بھی دیں اور انھیں اپنا سیاسی اور انتظامی اثر پھیلانے میں ایک آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا۔ بعد ازاں اسی طبقے نے مقامی روایات، لباس اور رسوم و رواج کے بارے میں کمتری کا احساس پیدا کرنے میں ایک مذموم کردار ادا کیا۔

انگریزی تہذیب کی برتری کو انگریزوں کی معاشرت کے حوالے سے اچھالا جاتا تھا۔ اس میں ان کی معاشرت میں استعمال ہونے والی اشیاء کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اب کوئی بھی شخص اپنے آپ کو حکومتی طبقے سے قریب تر لانے یا ان سے ربط و تعلق کے اظہار کے لیے ایسی اشیاء اور لباس کا استعمال کرتا تھا، جیساکہ انگریز خود کرتے تھے۔ اس نئے اندازِ معاشرت سے، انگریزی مصنوعات کی مانگ بڑھنے لگی۔ عام لوگوں میں مقامی طور پر تیار کردہ چیزوں کے مقابلے میں انگلستان کی تیار کردہ شیاء کو زیادہ بہتر اور پائدار سمجھا جانے لگا۔ اس سے "ولایتی مال" کی کھپت بڑھی اور انگریزی صنعتوں کو فائدہ ہوا۔ اس تناظر میں نسلی برتری کے نظریے کو معاشی مفادات کے حصول کے لیے استعمال کیا گیا۔

ہر غاصب، اپنی مفتوحہ قوم پر اپنی نسلی برتری ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا مقصد سیاسی اور معاشی استبداد کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ تاریخی طور پر یہ بات ثابت شدہ ہے کہ تہذیب اور ثقافت کا تعلق کسی بھی معاشرے کے حالات اور تاریخی ورثے سے ہوتا ہے اور اس کی اصلیت کے لیے یہی عناصر بنیادی ہوتے ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک علاقے کی ثقافت اور تہذیب کے سرچشمے کسی دوسرے علاقے یا کسی دوسرے گروہ سے متعلق ہوں۔ چونکہ تہذیب اور ثقافت کی استواری اور تشخص میں، وہاں کے خاص مزاج اور ورثے کا ہی اہم کردار ہوتا ہے، اس لیے کسی تہذیب یہ ثقافت کی دوسروں پر برتری یا کمتری ثابت کرنا، حقیقت کے خلاف جانے کے مترادف ہے۔ کوئی تہذیب نہ تو اعلیٰ ہوتی ہے اور نہ ہی کم تر ـــــ رسم و رواج یا

نئے نظامِ تعلیم میں انگریزوں نے عیسائی مشنری سکولوں کے قیام کو فروغ دیا۔ ان سکولوں میں عیسائیت کی مذہبی کتب کا مطالعہ لازمی ہوتا تھا اور اسے نصاب کا اہم حصہ تصور کیا جاتا تھا۔ عام لوگ پہلے ہی انگریزوں سے متنفر تھے، وہ ایسے سکولوں سے وحشت زدہ ہونے لگے، کیونکہ انھیں صاف نظر آ رہا تھا کہ اب ان کے مذاہب بھی محفوظ نہیں رہے ہیں۔ ایسے حالات میں خاص طور پر مسلمانوں میں شدید ردِّعمل ہوا اور مسلمان علما نے ان سکولوں میں تعلیم کے خلاف فتوے جاری کر دیے۔

انھی ایام میں حکومت نے کسی بھی سرکاری نوکری کے لیے انگریزی تعلیم کی بنیادی سند کو لازمی قرار دے دیا۔ مسلمانوں کے لیے یہ صورتحال دو دھاری تلوار کی طرح تھی ـــــ اگر وہ انگریزی سکولوں میں تعلیم حاصل کرتے تو انھیں ان کے خیال کے مطابق، اپنی ثقافت اور مذہب سے ہاتھ دھونا پڑتا تھا، وگرنہ دوسری صورت میں بے روزگاری کا زہر حلق سے اتارنا پڑتا تھا۔

III- عیسائیت کی تبلیغ

ایسٹ انڈیا کمپنی کے دَور میں، عیسائیت کے فروغ کے لیے خصوصی کوششیں کی گئیں۔ 1837ء میں ایک خوفناک قحط میں یتیم ہونے والے مقامی بچوں کو عیسائی مشنریوں کے سپرد کر دیا گیا تاکہ وہ ان کی پرورش ایک عیسائی کے طور پر کریں۔ اِس کے علاوہ عیسائی مشنری مقامی آبادی کی مالی مشکلات کو بھی عیسائیت کی تبلیغ کے لیے بطور ہتھیار استعمال کرتے تھے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی قوانین کے مطابق اگر کوئی شخص اپنا مذہب بدل لے تو وہ وراثت کے حقوق سے محروم ہو جاتا تھا۔ انگریزوں نے اس قانون کو بدل دیا اور تبدیلیٔ مذہب سے قانونِ وراثت کو علیحدہ کر کے عیسائی مت کے فروغ کے لیے راہیں صاف کر دیں۔

1857ء کی جنگِ آزادی سے پہلے کی بغاوتیں

ایسٹ انڈیا کمپنی کے دَور میں ہندوستانی آبادی کی اکثریت کی معاشی حالت تباہ ہو

گئی اور زندگی سے متعلق تمام اداروں میں توڑ پھوڑ ہو گئی تھی ۔ اِس صورتحال میں حکومتی طبقے کی حالتِ زار خاص طور پر ناقابلِ بیان تھی ۔ ان کی طاقت اور شان بان سب خاک میں مل گئے اور وہ ساہوکاروں کے قرضوں تلے سسک رہے تھے ۔ صدیوں پرانی زندگی کی ڈگر میں ایک ہلچل پیدا ہو گئی اور اس میں مثبت اقدار کو نظرانداز کیا جا رہا تھا ۔ اس دَور کی کیفیات کو اس دَور کے ایک شاعر محمد رفیع سودا (1713ء ۔ 1780ء) نے اِس طرح بیان کیا ہے :۔

شہر میں کیا رہا تھا امن و امان
کیسی کرتی تھی خلق خوش گزران
تھا نہ رشوت سے کوتوال کو کام
شہر میں تھا نہ چوٹٹے کا نام
اب جہاں دیکھو واں جھمکا ہے
چور ہے ، ٹھگ ہے اور اُچکا ہے

اِس تمام صورتحال میں جب کسی فرد کی عزتِ نفس ، روزگار ، مذہب ، ثقافت اور شخصی آزادیاں محفوظ نہ تھیں، ہر شخص اپنی جگہ بے چین اور مضطرب تھا ۔ وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ اس کی اس حالتِ زار کے واحد ذمے دار انگریز تھے ۔

عام حالات میں اگر لوگوں میں اضطراب ہو تو اس کے اظہار اور احتجاج کے لیے معمولی طریقے ہی کافی ہوتے ہیں ۔ اگر کوئی گروہ یہ محسوس کرے کہ اس کو شنوائی حاصل نہ ہو گی اور حکومتی طبقہ نہ صرف اس کی بدحالی کا ذمے دار ہے بلکہ وہ اس صورتحال کو بدلنے کا خواہاں بھی نہیں ، تو احتجاج ، متشدد یا مسلح بغاوت (1) کی صورت اختیار کر لیتا ہے ۔ ایسے میں معاشرے کی ہر سطح پر کسی نہ کسی صورت میں احتجاج کی صورت ظاہر ہوتی ہے ۔

---

(1) جب کوئی بھی حکومت عوام کی ضروریات اور خواہشات کا احترام ترک کر دے اوران پر جبر اور طاقت کا نظام نافذ کر دے تو ایسے میں عام لوگ سخت بے چینی اور عدم سلامتی محسوس کرتے ہیں۔ اگر یہ عدم سلامتی زندگی کے کچھ شعبوں تک محدود رہے تو لوگ کسی حد تک

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

ایسٹ انڈیا کمپنی کے دورِ حکومت میں مختلف اوقات میں مسلح بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ لوگ اپنی معاشی بدحالی سے تنگ آکر ہتھیار اُٹھا لیتے اور ایک ہیجانی انداز میں حکومتی کارندوں سے ٹکرا جاتے تھے۔ ان میں سے اکثر کو حکومت ڈاکو یا باغی قرار دے کر مروا دیتی تھی۔ تاہم عوام میں ایسے لوگوں کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ س کا اقرار ایک انگریز افسر نے بھی کیا۔ 1810ء میں اس نے کہا:

"باغی گروہوں کے لیڈروں کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، ان کو حاکم تصور کیا جاتا ہے اور حکومت کا عوام پر اتنا اثر یا اختیار نہیں کہ وہ اپنے لیے ذرا سی بھی امداد حاصل کر سکے۔"

کمپنی کے دور میں رونما ہونے والی بغاوتوں میں سے چند ایک کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے، تاکہ 1857ء میں ہونے والی جنگِ آزادی کے پس منظر کو بہتر طور پر سمجھا ج سکے۔

1- 1770ء سے 1790ء کے درمیانی عرصے میں بنگال کے کسانوں نے کئی بغاوتیں کیں۔ ن بغاوتوں میں، انھوں نے انگریزوں کی فیکٹریوں، تھانوں پر حملے کیے اور کئی نگریز اہلکاروں کو قتل بھی ۔ ان بغاوتوں میں ایک بغاوت درویش مجنون شاہ کی تھی۔ یہ بغاوت 1790ء میں ناکام ہو گئی۔ 1793ء میں جب انگریزوں نے دوامی بندوبست' کا نظام نافذ کیا تو کسانوں پر معاشی دباؤ ناقابلِ برداشت حد تک

بقیہ حواشی

ے برداشت کرتے رہتے ہیں۔ یہ معاشرہ زندگی کے تمام شعبوں نیز ... معاشی اداروں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لے اور اس صورتحال میں کسی بہتری کی دور دور تک کوئی گنجائش بھی نہ ہو، تو لوگوں کی بے چینی ایک عملی جدوجہد کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اسی جدوجہد میں شریک افراد اپنی آنے والی نسلوں کے لیے ایک بہتر ماحول اور نظام کو استوار کرنے کے لیے جتن کرتے ہیں۔ وہ اپنے زندہ رہنے یا مر جانے کو اہمیت نہیں دیتے کیونکہ ان کے لیے اس معاشرے میں زندہ رہنا اس قدر تلخ ہو جاتا ہے کہ وہ مر کر اپنے معاشرے کو بہتر کرنے کی ٹھان لیتے ہیں۔ ایسی صورت میں اس کی تحریک میں ایک اعلیٰ جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اور اس سے ایک مسلح مزاحمت جنم لیتی ہے۔

بڑھ گیا ۔ اس سے پھر ایک بغاوت ہوئی اور بہت سے سرکاری کارندوں اور
ساہوکاروں کو قتل کر دیا گیا ۔

II- 1813ء میں بنگال میں ہی ایک درویش کامران شاہ نے بغوت کی قیادت کی ۔ اس
بغاوت میں غریب کسانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ۔ 1825ء میں باغیوں نے یک
علاقے پر اپنا قبضہ بھی حاصل کر لیا اور یہاں 1833ء تک ان کا قبضہ رہا ۔

III- 1827ء سے 1831ء کے درمیانی عرصے میں نثار علی عرف تیتومیر کی قیادت میں
کسانوں نے بغاوت کر دی ۔ 1831ء میں تیتومیر لڑتے ہوئے شہید ہو گئے ۔
تیتومیر نے بنگال میں پہلی مرتبہ کسانوں کو گوریلہ انداز جنگ کی تربیت دی ۔

IV- 1831ء سے 1860ء تک حاجی شریعت اللہ اور ان کے بیٹے دودھو میاں کی قیادت
میں کسانوں کی تحریک جاری رہی ۔ اسے فرائضی تحریک کہا جاتا ہے ۔ اس تحریک
کا مقصد غریب کسانوں کو انگریزوں ، ان کے پروردہ اہلکاروں اور جاگیرداروں کے
ظلم سے نجات دلانا تھا ۔ یہ تحریک عام لوگوں میں اس قدر مقبول ہوئی کہ بہت سے
ہندو اور اچھوت کسانوں نے اسلام قبول کر لیا ۔ اِس وجہ سے انیسویں صدی کے
آخر تک بنگال میں مسلمانوں کی ایک بہت بڑی اکثریت قائم ہو گئی ۔

V- ان تحریکوں کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے حصّوں میں بھی ، جہاں انگریزی
حکومت کا کسی طور اثر تھا ، بغاوتیں ہوتی رہیں ۔ ان کی فہرست اور رونما ہونے کے
سال نیچے درج کیے جاتے ہیں ۔

1781ء ——— گورکھپور

1799ء ——— اودھ

1794ء و 1801ء ——— وجیانگر

1814ء ——— بریلی

1828ء و 1830ء ——— آسام

1829ء ——— وسطی ہند ، کولہاپور

1830ء و 1834ء ——— وجیانگر

1835ء ——— گجرات

1836ء و 1855ء ـ مدراس ، کٹک

بغاوتوں کے اس سلسلے کا نقطۂ عروج 1857ء کی جنگ آزادی کی صورت میں اُبھرا ۔ اگرچہ اس بغاوت میں فعل کردار سپاہیوں نے ادا کیا ، تاہم عام لوگ بھی اس میں برابر کے شریک تھے ۔ صرف ایک طبقے نے اس جنگ آزادی کی حمایت نہ کی اور وہ کمپنی کی حکومت کے دوران پیدا ہونے والا درمیانہ طبقہ تھا ۔ اس میں اکثر لوگ مغربی تعلیم کو حاصل کر چکے تھے اور یہ انگریزوں کے قائم کردہ ظالمانہ نظام کے خلاف اٹھنے کی بجائے اپنی ذاتی ترقیوں اور مفادات کے حصول کے خواہاں تھے ۔

1857ء کی جنگ آزادی کے واقعات

ہندوستان میں آکر کمپنی نے جہاں دوسرے شعبہ جات حکومت میں اپنے عزائم کے مطابق ترامیم کیں ، وہیں فوجی نظام کی ہئیت میں بھی اہم تبدیلیاں کی گئیں ۔ اب فوج کی کمان کلی طور پر انگریز افسروں کے پاس ہوتی تھی ، تاہم عام سپاہی مقامی لوگوں میں سے بھرتی کیے جاتے تھے۔ ان فوجیوں کی تربیت سامراجی ضروریت کے تحت مرکزی کمان کی اطاعت کی بنیاد پر کی جاتی تھی اور اس میں کسی بھی جونیئر افسر یا سپاہی کو دم مارنے کی گنجائش نہ تھی۔

فوجی نظام خواہ کتنا ہی منظم اور مرکزیت کا حامل ہو ، اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فوجیوں کا بہر طور اپنے عزیز و اقارب اور اہلِ خانہ کی حالتِ زار سے گہرا ربط و تعلق رہتا ہے ۔ کمپنی کے مقامی سپاہی اپنے خاندان کی بدحالی کو نہ صرف محسوس کرتے تھے بلکہ اس پر کڑھتے بھی تھے ۔ ایک طویل عرصے تک وہ ایک جبر کے عالم میں یہ سب کچھ برداشت کرتے رہے ، مگر ان کے دلوں میں ان کے عزیز و اقارب کو بدحال بنانے والے انگریزوں کے خلاف شدید ردّعمل بدستور موجود رہا ۔ یہ دبا ہوا ردّعمل کسی بہانے کی تلاش میں تھا ، جو کارتوسوں کے استعمال کی صورت میں انھیں مل گیا ۔

انگریزوں کے خلاف بغاوت کی فوری وجہ وہ کارتوس بنے ، جن پر گائے اور سؤر

کی چربی لگی ہوئی تھی ۔ ہوا یوں کہ 1853ء میں انگلستان سے خاص قسم کے کارتوسوں کا ذخیرہ ، ہندوستانی فوج کے استعمال کے لیے بھیجا گیا ۔ ان کارتوسوں پر سؤر کی چربی لگی ہوئی تھی ۔ بعد میں ایک فوجی اعلان میں کہا گیا کہ یہ کارتوس صرف انگریز سپاہی ہی استعمال کریں گے ، اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے جو کارتوس استعمال کرنا مقصود تھے ان پر صرف بھیڑ یا بکری کی چربی لگی ہوئی تھی ۔ مگر عام سپاہیوں کو اس بات کا مکمل یقین نہ دلایا جا سکا ۔

1856ء میں ایک نئی قسم کی بندوق 'انفیلڈ رائفل' کے استعمال کا حکم ہوا ۔ اس رائفل میں بھی چربی والے کارتوس استعمال ہوتے تھے اور استعمال سے پہلے ان کو دانت سے کاٹنا پڑتا تھا ۔ نئی رائفل کے استعمال کی تربیت کے لیے ڈم ڈم (کلکتہ) ، انبالہ اور سیالکوٹ میں مراکز کھولے گئے ۔

ان نئی ساخت کی رائفلوں کو استعمال کرنے والے سپاہیوں میں یہ بات عام ہوگئی کہ کارتوسوں پر گائے اور سؤر کی چربی لگی ہوئی ہے ۔ سؤر ، مسلمانوں کے نزدیک حرام اور گائے ہندوؤں کے لیے مذہبی طور پر مقدس تھی ۔ اس صورتحال میں ہندو اور مسلمان سپاہیوں میں کارتوسوں کے بارے میں شدید ردِّعمل پیدا ہوگیا ۔ ڈم ڈم چھاؤنی کے سپاہیوں نے کارتوسوں کو استعمال کرنے سے انکار کر دیا اور دنگا فساد برپا کر دیا ۔ اس میں ایک انگریز افسر کو زخمی بھی کر دیا گیا ۔ انگریزوں نے فوری طور پر کارروائی کی ۔ رجمنٹ کو توڑ دیا گیا ور باغی سپاہیوں کے سربراہ کو قتل کر دیا گیا ۔

سب سے زیادہ شدید صورتحال میرٹھ کی چھاؤنی میں پیش آئی ۔ یہاں ، جن سپاہیوں نے کارتوسوں کو ستعمال کرنے سے انکار کیا ، انھیں قید کر دیا گیا ۔ قیدی سپاہیوں کے ساتھیوں نے انگریز افسروں کو قتل کر کے ، قیدیوں کو رہا کروایا اور دہلی کی طرف بڑھنے لگے ۔ دہلی کے مقامی سپاہیوں نے ان کا ساتھ دیا اور ان سب نے مل کر ضعیف العمر مغل بادشاہ ، بہادر شاہ ظفر کو اپنی بادشاہت کے اعلان پر مجبور کر دیا ۔ اِس اعلان کے ساتھ ہی اودھ ، روہیل کھنڈ اور مرکزی ہندوستان کے علاقوں میں بھی بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا ۔ تاہم اترپردیش کے اکثر مقامات اور دہلی میں آزادی

کی لہر کا خاص زور تھا ۔

تحریک آزادی کے رہنماؤں کا اصل منصوبہ یہ تھا کہ ہندوستان کی اہم چھاؤنیوں میں یکبارگی فوجی بغاوتیں کر کے دہلی کو اپنا مرکز بنا لیا جائے ۔ مگر واقعتاً ایسا نہ ہوا ۔ بغاوتیں وقفے وقفے سے ہوتی رہیں اور ایک منظّم طاقت مجتمع نہ ہو سکی ۔ اس دوران انگریزوں کو جوابی کارروائی کا موقع مل گیا ۔ انھوں نے بڑی ہوشیاری سے مسلمان بغاوت کے علاقوں کو ہندوؤں سے علحدہ کر دیا اور ان دونوں کو اکٹھ نہ ہونے دیا ۔ پنجاب میں سکھ خاموش رہے بلکہ کچھ سکھ ریاستوں نے انگریزوں کی مدد بھی کی ۔ چند ماہ کی مزاحمت کے بعد دہلی میں تحریک کا زور ٹوٹ گیا اور بہادر شاہ ظفر کو قید کر لیا گیا ۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے علاقوں میں بھی معلہ ٹھنڈا پڑ گیا ۔

موجودہ پاکستان کے صوبوں میں جنگِ آزادی

1857ء کی جنگِ آزادی یو۔پی کے علاقوں میں شروع ہوئی اور اس میں زیادہ تر فوجیوں کا کردار مؤثر رہا ۔ موجودہ پاکستان کے مختلف صوبوں میں موجود انگریز فوج کے مقامی سپاہیوں نے جزوی طور پر علم بغاوت بلند کیا ۔ اس کا مختصر حال ذیل میں دیا جاتا ہے ۔

سندھ و بلوچستان

یو۔پی کی چھاؤنیوں میں دیسی سپاہیوں کی بغاوت کی خبر کے ساتھ ہی بلوچستان میں قلات اور سندھ میں جیکب آباد اور شکار پور کے علاقوں میں بغاوت شروع ہو گئی ۔ شکار پور میں موجود انگریزی فوج کے بنگالی سپاہیوں نے روپوش ہو کر مختلف علاقوں میں سپاہیوں کو بغاوت پر اکسانا شروع کر دیا ۔ انگریز حکام نے ان سپاہیوں کو پکڑ کر سزائے موت دینے کا حکم دیا اور ان کی مدد کرنے والے لوگوں کی جائیدادوں کو بحق سرکار ضبط کرنے یا سزائے موت کا حکم دیا ۔ باغی سپاہیوں کی سرکوبی کے سلسلے میں انگریزوں کو مقامی طور پر بااثر لوگوں کی مدد بھی حاصل تھی اس لیے ان سپاہیوں کو بہت جلد قابو میں کر لیا گیا ۔ کچھ بااثر لوگ انگریزوں کے خلاف تھے ان کی جائیدادوں کو ضبط کر کے سخت سزائیں دی گئیں ۔

8- ستمبر کو حیدر آباد میں باغی سپاہیوں نے سرکاری خزانے ، توپوں اور قلعوں پر قبضہ جمانے اور انگریز افسروں کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا - یہ منصوبہ وقت سے پہلے ہی فاش ہو گیا اور باغیوں کو گرفتار کر کے پھانسیاں دے دی گئیں - کراچی میں بھی ایک فوجی نے اس قسم کی کارروائی کا منصوبہ بنایا مگر اسے بھی پکڑ کر اسے اس کے ساتھیوں سمیت پھانسی دے دی گئی

صوبہ سرحد

1857ء میں افغانستان کے بادشاہ سے انگریزوں نے دوستی کا معاہدہ کر لیا اور اس کے بعد انھیں افغانستان کی طرف سے کسی قسم کی مداخلت کا کوئی خطرہ نہ تھا - اس صوبے میں جنگ آزادی کے اثر سے پہلے ہی انگریزوں نے حساس علاقوں میں حفاظتی اقدامات کر لیے مگر اس کے باوجود یہاں نہایت خفیہ طور پر بغاوت کا جذبہ موجود تھا - اس کی شہادت فقیر کے بھیس میں ایک انقلابی سے ملنے والے ایک خط سے ہوئی - اس خط میں مقامی فوجیوں کو انگریزوں کے خلاف اُٹھ کھڑا ہونے کا پیغام دیا گیا تھا - اس انقلابی کو سرسری سماعت کے بعد پھانسی دے دی گئی -

21 — مئی کو نوشہرہ چھاؤنی میں بغاوت ہوئی- بغاوت کو دبانے کے لیے فوری کارروائی کی گئی اور اس سلسلے میں کئی قبائل نے انگریزوں کی مدد بھی کی - سپاہیوں میں خوف و ہراس پیدا کرنے کے لیے ایک صوبیدار میجر کو بغاوت کے الزام میں پوری چھاؤنی کے سامنے سزائے موت دے دی گئی - اس کے باوجود حریت پسند سپاہیوں نے چھاؤنی سے نکل کر سوات کی پہاڑیوں کا رخ کیا - انگریز فوج نے بڑی سرعت سے ان کا پیچھا کیا - سخت جنگ ہوئی ، 150 حریت پسند مارے گئے اور اتنے ہی گرفتار ہوئے - گرفتار شدہ سپاہیوں میں سے 40 کو توپوں سے اڑا دیا گیا - ان کے علاوہ اور بھی علاقوں میں بغاوتیں ہوئیں مگر اجتماعی قوت کے نہ ہونے اور غیر موزوں حالات کے باعث یہ کامیاب نہ ہو سکیں - ان بغاوتوں میں ملوث حریت پسندوں کو قتل کر دیا گیا اور بہت سوں کو مقامی آبادی نے پکڑ کر انگریزوں کے حوالے کر دیا -

صوبہ پنجاب

پنجاب میں جنگ آزادی کی خبروں کے پہنچنے کے ساتھ ہی انگریز حکام نے دیسی فوجی دستوں سے ہتھیار واپس لے لیے ۔ اس ضمن میں لاہور میں میر چھاؤنی قابل ذکر ہے ۔ یہاں فوجی دستوں کے اردگرد توپیں کھڑی کر کے ان سے ہتھیار رکھوا لیے گئے ۔ ان حفاظتی اقدامات کے باوجود سیالکوٹ ، جہلم ، راولپنڈی اور ملتان کی چھاؤنیوں میں جزوی طور پر بغاوتیں ہوئیں جن کو دبا دیا گیا ۔

تجزیہ

1857 ء کی جنگ آزادی ، مقامی نظام حکومت کے زوال کا نقطۂ آخر تھا ۔ اس کے بعد برطانیہ نے ہندوستان پر اپنی نوآبادیاتی حکومت قائم کر کے ، یہاں کے وسائل کو اپنی معاشی ترقی میں استعمال کرنا شروع کر دیا ۔

1707 ء سے 1857 ء کے درمیانی عرصے میں جو تاریخی دھارے اہم نظر آتے ہیں ، ان کی بنیاد پر یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ یہ دور ایک زوال پذیر معاشرے اور ایک ترقی پذیر قوت کے درمیان ٹکراؤ کا عہد تھا ۔ انگلستان اسی دور میں یورپ میں صنعتی ترقی کا نقیب بنا اور یہ صنعتی ترقی ، اقوام عالم میں اسے تہذیبی برتری دلانے میں ایک بنیادی محرک کا کام انجام دے رہی تھی ۔ انگلستان کا حکومتی طبقہ اپنی صنعتی ترقی کو مثبت اقدار کے فروغ کے برعکس اپنی ذاتی غرض مندیوں اور مفادات کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا ۔ اس تناظر میں انھوں نے اپنے ملک میں صنعتی ترقی کے لیے ضروری خام مال کے حصول کے لیے کوششیں شروع کر دیں ۔ اس طرح خام مال کی ترسیل اور خام مال کے ذخائر پر اپنا تصرف یقینی بنانے کے لیے نوآبادیاتی نظام کی عالمی پالیسی کو فروغ دیا گیا ۔ نوآبادیاتی نظام کو ایک سیاسی فکر کی حیثیت حاصل تھی اور اس کے تحت زندگی کے تمام شعبوں کی تنظیم نو کی جاتی تھی ۔ اس تنظیم نو کا واحد مقصد وسائل پیداوار پر مکمل تصرف اور نوآبادیاتی ملک کے باشندوں کو نفسیاتی طور پر مفلوج کرنا ہوتا تھا کہ وہ نوآبادیاتی طاقت کے خلاف مزاحمت نہ کر سکیں ۔

ہندوستان میں انگریزی نوآبادیات کا نظام تدریجاً بڑے مؤثر طریقے سے نافذ کیا

کیا۔ یہاں پر انگریزوں کی چالیں نہایت مؤثر رہیں اور مقامی قوت اِس کے خلاف مجتمع نہ ہو سکی۔ مقامی قوت اپنے مجموعی زوال کے باعث نہ صرف مختلف اکائیوں میں بٹ چکی تھی بلکہ اس میں زوال کا عمل بڑی تیزی سے رُوپذیر ہو رہا تھا۔ ہندوستان کے نظام حکومت اور اِس کے حلیف حکومتی گروہ کا خاتمہ ہو رہا تھا اور اس کی جگہ ایک نیا طبقہ جنم لے رہا تھا۔ اس طبقے کی طاقت کا محور کمپنی کے پاس تھا اور اس کے باقی دو عناصر ؛ انگریزوں کے بھی خواہ جاگیردار اور ہندو ساہوکار تھے۔ طاقت کا یہ محور سابقہ نظام کے خاتمے کے ساتھ ساتھ نوآبادیاتی نظام کے استحکام میں مصروف کار ہو گیا۔

انگریزوں نے اپنی جدید ترقی کے وسائل کو نوآبادیاتی نظام کے فروغ کے لیے ایک آلۂ استبداد کے طور پر استعمال کیا۔ اس کو اپنی تہذیبی برتری کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا۔ اس سے مقامی وسائل اور اداروں پر ان کا تصرف ہمہ جہتی صورت اختیار کر گیا۔ چونکہ مقامی ادارے اپنی ساخت اور فعالیت کے اعتبار سے غیر مؤثر ہو رہے تھے ، اس لیے انگریزوں کی ترقی پذیر تہذیب نے ان پر اپنا قبضہ جما لیا اور مقامی لوگ ان کے پنجۂ استبداد میں پھنس گئے۔

یاد دہانی کے لیے اہم نکات

- 1707ء سے 1857ء تک کے درمیانی عرصے میں ہندوستان میں عدم استحکام کا دَور غالب رہا۔
- مغل حکومت کی مرکزی قوت میں کمزوری کے باعث صوبوں میں خودمختاری کا رجحان شروع ہو گیا۔
- مرکز سے علیحدہ ہونے والی ریاستوں میں وسعت پسندی کے باعث ، ان کے درمیان شدید ٹکراؤ کی حالت پیدا ہو گئی۔ اس سے ہندوستان کی سیاسی قوت چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں تقسیم ہو گئی اور یہ تخریب میں ضائع ہونے لگی۔
- ہندوستان کی اندرونی خلفشار سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے فائدہ اٹھاتے ہوئے ، اپنے نوآبادیاتی عزائم پر عمل شروع کر دیا۔

- ایسٹ انڈیا کمپنی نے جہاں جہاں اپنا سیاسی قبضہ کر لیا تھا، وہاں کے اقتصادی اور معاشرتی نظام کو بھی اپنے عزائم کے مطابق ڈھال لیا، تاکہ وہ مکمل طور پر ہندوستانی وسائل کو اپنے استعمال میں لا سکیں۔ خاص معاشرتی رویوں کو فروغ دینے کا مقصد ہندوستان میں اپنا وفادار طبقہ پیدا کرنا اور مقامی آبادی کی قوت مزاحمت کو ختم کرنا تھا۔

- اپنی وسعت پسندی کے ابتدائی ایام میں کمپنی نے الحاق کی پالیسی پر عمل کیا، تاکہ وہ اپنی قوت صرف ان گوشوں پر مرکوز رکھ سکیں، جہاں ان کے اہم مفادات وابستہ تھے۔

- 1707ء سے 1857ء تک کے عرصے میں ہندوستانی اقتصادیات میں نہ صرف نئے طبقے پیدا ہوئے بلکہ اس کا مجموعی سرمایہ اور اختیار کمپنی کو منتقل ہو گیا۔ کمپنی نے ہندوستانی دولت کو انگلستان کی صنعتی ترقی میں استعمال کیا۔

- کمپنی کی اقتصادی پالیسیوں کے ابتدائی دور میں ساہوکاروں کا ایک گروہ پیدا ہوا، ان میں جگت سیٹھ بہت مشہور ہوئے۔ یہ بنگال کی ریاستی معیشت میں اہم کردار ادا کرتے تھے۔ بعد ازاں انگریزوں نے ان کے اثر کو بھی ختم کر دیا۔

- کمپنی کی اجارہ دارانہ پالیسیوں سے مقامی صنعتیں ختم ہو گئیں، اور صنعتی کاریگروں اور تاجروں کی ایک بہت بڑی تعداد معاشی طور پر سخت بدحالی کا شکار ہو گئی۔ ان میں اکثریت نے یہ کام ہی ترک کر دیا۔

- کمپنی نے اپنی اجارہ داری اور انگریزی مصنوعات کے فروغ کے لیے ترجیحی پالیسی پر عمل کیا۔ اس سے ہندوستان میں بے روزگاری بڑھی اور اقتصادی بے چینی میں اضافہ ہوا۔

- انگریزوں نے اپنے سامراجی عزائم کے حصول کے لیے معاشرتی سطح پر نسلی امتیاز اور دوسرے حربوں کو فروغ دیا۔ ان کا مقصد مقامی آبادی کو نفسیاتی سطح پر مفلوج کرنا اور اپنی برتری قائم کرنا تھا۔

- کوئی تہذیب یا ثقافت اپنے ورثے کے اعتبار سے دوسری تہذیب سے نہ ہی اعلیٰ

ہوتی ہے اور نہ ادنیٰ ۔ اس کا تعلق اس علاقے اور وہاں کے لوگوں سے ہوتا ہے اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے علٰحدہ نہیں کیا جا سکتا ۔ مادی ترقی کی بنیاد پر لامحالہ تقابل کیا جا سکتا ہے مگر اس میں مثبت انداز رکھنا ضروری ہے ۔ ایک ملک کی مادی ترقی کو ذریعۂ استبداد نہیں بنایا جا سکتا ۔

- 1857 ء کی جنگ آزادی ، مقامی باشندوں کا انگریزوں کے خلاف مزاحمت کا آخری حصّہ تھا ۔ اِس سے پہلے بھی کئی بغاوتیں ہوئیں اور وہ کم و بیش ناکام رہیں ۔

غور و فکر کے چند نکات

(الف) - ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے نوآبادیاتی عزائم کو پورا کرنے کے لیے 1707 ء سے 1857 ء تک جو کارروائیاں کیں ان کا واقعاتی جائزہ لیں؟

2- "ہندوستان ایک زوال پذیر معاشرہ تھا اور یہ انگریزوں کے ترقی پذیر معاشرے کے مقابل اپنی حیثیت مؤثر طور پر استوار نہ کر سکا ۔" تجزیہ کریں اور اپنے دلائل کے حق میں ضروری حقائق بھی درج کریں ۔

3- سلامت علی 1748 ء میں بنگال میں پیدا ہوا۔ اس کے دادا کو علی وردی خاں نے ملازمت سے سبکدوش کر دیا اور اس صدمے سے ان کا انتقال ہو گیا ۔ سلامت علی کے والد نے اپنی جائیداد بیچ بیچ کر زندگی کے دن گزارے مگر ان کی زندگی میں ہی ان کا گھرانہ قلاش ہو گیا ۔ دکھ سے انھوں نے دنیا ترک کر کے ایک خانقاہ میں بسیرا کر لیا اور یہیں 1768 ء میں ان کا انتقال ہو گیا ۔ اب بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی اقتصادی اجارہ داری قائم ہو چکی ہے ۔ سلامت علی اپنی زندگی کے بارے میں سخت پریشان ہے ۔ اُس وقت کے سیاسی اور اقتصادی حالات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس کے سامنے کون سے امکانات ہو سکتے ہیں ؟ آپ سب دوست باہم مل کر ان حالات اور امکانات کے مطابق حل تلاش کریں ۔

(ب) مختصر جواب دیں ۔

(1) اورنگزیب کے انتقال کے بعد حکومت کی قوت کس طرح چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں

تقسیم ہوئی ؟

(ii) ایسٹ انڈیا کمپنی ، ہندوستان میں کیونکر نوآبادیاتی نظام نافذ کرنا چاہتی تھی ؟

(iii) ایسٹ انڈیا کمپنی نے کن حربوں کو استعمال کر کے مقامی سرمائے اور وسائلِ پیداوار پر اپنا قبضہ کیا ؟

(iv) جگت سیٹھ کون تھے ؟

(v) ہنڈی سے کیا مراد ہے ؟

(vi) کن حربوں کو استعمال کر کے ، کمپنی نے مقامی صنعتی کاریگروں کو معاشی طور پر برباد کیا ؟

(vii) دوامی بندوبست کے تحت غریب کسانوں پر معاشی بوجھ کیونکر بڑھ گیا ؟

(viii) امدادی نظام کیا تھا ؟ اس سے کمپنی کو کیا فائدہ حاصل ہوا ؟

(ix) کمپنی نے معاشرتی سطح پر سامراجیت کو پھیلانے کے لیے کون سے طریقے اور پالیسیاں اپنائیں ؟

(x) نسلی برتری کی پالیسی سے 'ولایتی مال' کی کھپت کیونکر بڑھ گئی؟

(xi) کمپنی کے دور میں تعلیمی پالیسی کے اہم خدوخال کا تذکرہ کریں ؟

(xii) مسلح بغاوت کیوں ہوتی ہے ؟

(xiii) 1857ء سے پہلے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں ہونے والی بغاوتوں کی تفصیل بیان کریں ۔

(xiv) 1857ء کی جنگ آزادی کے واقعات اور ناکامی کی وجہ بیان کریں ۔

ت۔ نیچے دیے گئے بیانات میں سے جو درست ہے ، ان کے سامنے ✓ کا نشان لگائیں۔

1- کسی معاشرے یا قوم کا زوال محض اتفاقی نہیں ہوتا، بلکہ زوال ایک مسلسل عمل ہوتا ہے۔

2- اٹھارھویں صدی عیسوی میں مرکزی طاقت کے کمزور ہونے کے باوجود مختلف ریاستیں مل کر ایک عظیم الشان اتحاد بنا لیتی تھیں۔

3- انگریز ، ہندوستان میں اعلیٰ تہذیب کے فروغ کو اپنا پہلا اور آخری مقصد سمجھتے تھے۔

4- کمپنی کی وسعت پسندی کے ساتھ ساتھ سابقہ حکومت کے اہم گروہ اور خود بادشاہ بھی سخت اقتصادی مشکلات کا شکار ہونے لگے۔

5- کمپنی کے ایجنٹ مقامی کاریگروں سے مصنوعات خرید کر ان کو معاشی خوشحالی دینا چاہتے تھے۔

6- نسلی امتیاز کی پالیسی سے ، انگریزوں سے منسوب مصنوعات کی کھپت میں اضافہ ہوا۔

7- انگریزی تہذیب مادی ترقی کے اعتبار سے مقامی تہذیب کے مقابلے میں زیادہ بہتر اور مضبوط تھی۔

8- انگریزی ادب کی وسط درجے کی ایک کتاب ، ہندوستانی ادب کے اہم تر ذخیرے کے مقابلے میں اعلیٰ مقام کی حامل ہے۔

9- کمپنی کے دورِ وسعت میں مقامی آبادی خاموش تماشائی بنی رہی اور ان کی طرف سے کسی قسم کی کوئی مزاحمت نہ کی گئی۔

10- 1957 کی جنگ آزادی عدم تنظیم کے باعث ناکام ہوگئی۔

(د) نیچے ایک بیان کے ساتھ اس کی چند وجوہات دی گئی ہیں۔ یہ وجوہات اپنی جگہ پر درست ہیں تاہم ان میں کوئی ایک سب سے اہم اور بنیادی نوعیت کی ہے۔ ان تمام وجوہات پر کلاس میں بحث کریں اور سب سے بہتر پر ✓ کا نشان لگائیں۔

1- ایسٹ انڈیا کمپنی کی کامیاب وسعت پسندی میں سب سے اہم وجہ :

(الف) مقامی طور پر مرکزی قوت کا غیر مؤثر ہونا تھا۔

(ب) صوبوں کا آپس میں لڑ کر اپنی قوت ضائع کرنا تھا۔

(ج) انگریزوں کا موقعے کی مناسبت سے مؤثر پالیسیاں بنانا تھا۔

2- انگریزوں کا ہندوستان میں اپنا قبضہ جمانے کا سب سے اہم مقصد :

(الف) اپنی نسلی برتری کو فروغ دینا تھا۔

(ب) مقامی وسائل کو مکمل طور پر اپنے تصرف میں لانا تھا۔

(ج) انگلستان میں صنعتی ترقی کے لیے خام مال کی ترسیل کرنا تھا۔

3- کمپنی کی حکومت کے دَور میں:

(الف) ہندوستان کا سیاسی نظام ختم ہوگیا۔

(ب) ہندوستانی معیشت پر مقامی لوگوں کا اختیار ختم کر دیا گیا۔

(ج) ہندوستان کا زوال پذیر معاشرہ اپنے منطقی انجام کو پہنچ گیا۔

کتابیات

طلبہ و طالبات سے التماس ہے کہ وہ 1707ء سے 1857ء کے دَور کے بارے میں مزید وضاحت کے لیے مندرجہ ذیل کتب کا مطالعہ کریں۔

1- اسبابِ بغاوتِ ہند ۔ مصنف سر سید احمد خان
(اردو اکیڈمی ، سندھ ، کراچی)

2- برّعظیم پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ ۔ اشتیاق حسین قریشی

3- کمپنی کی حکومت ۔ باری علیگ

4- The Rise and Fall of the East India Company
By Ramkrishna Mukherjee (Book Traders, 1976 Lahore.)

5- A History of the Freedom Movement
Vol II, Part I
Pakistan Historical Society, 1960

3 برطانوی حکومت کے قیام کے بعد ہندوستان کے حالات

پس منظر

ایسٹ انڈیا کمپنی 1600ء میں ملکۂ برطانیہ کی اجازت سے بنائی گئی تھی۔ اس کمپنی کا کام مشرقی ممالک سے تجارت کرنا تھا۔ کمپنی کا انتظام اور دوسرے امور کی نگرانی ایک بورڈ آف ڈائریکٹرز کرتی تھی۔ اس بورڈ میں کمپنی کے حصے دار، تاجر اور حکومت برطانیہ کے نمائندے شامل ہوتے تھے۔

کمپنی نے تقریباً ایک سو سال تک اپنی کارروائیاں صرف تجارتی امور تک محدود رکھیں تاہم 1707ء کے بعد، جب ہندوستانی سیاست میں انتشار بڑھنے لگا تو کمپنی نے بھی اپنے مقاصد کو جارحانہ انداز پر استوار کرنا شروع کر دیا۔ ان عزائم میں، کمپنی کو خاصی کامیابی حاصل ہوئی اور اس نے ہندوستان کے داخلی تضادات اور کمزوریوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ بیسویں صدی کے وسط تک کمپنی نے قریباً پورے ہندوستان پر اپنا اثر و نفوذ قائم کر لیا تھا۔

چونکہ کمپنی کے مفادات میں سب سے اہم، مقامی وسائل پر اپنا تصرف قائم کرنا تھا، اس لیے مقامی آبادی نے اس کے خلاف شدید ردعمل ظاہر کیا۔ عام لوگ، کمپنی کے منتظمین کو شدید نفرت سے دیکھتے تھے اور اپنی حیثیت کے مطابق ان کے خلاف عملی جدوجہد بھی کرتے تھے۔ کئی مقامات پر ایک طویل عرصے تک بغاوتیں بھی ہوئیں اور ان میں کئی کو جزوی کامیابیاں بھی میسر آئیں۔ انہی بغاوتوں کا نقطۂ عروج 1857ء کی جنگ آزادی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس بغاوت کو سختی سے کچل دیا گیا، اور اس کے

ساتھ ہی ہندوستان پر کمپنی کی بجائے ملکۂ برطانیہ اور برطانوی پارلیمنٹ کی حکومت قائم ہو گئی۔

1857ء کے بعد ہندوستانی سیاست اور معیشت کی صورتحال حسب ذیل رہی:۔

1- انڈین ایکٹ 1858ء

اس ایکٹ کے تحت ہندوستان پر حکومت کرنے کا اختیار ، کمپنی کی بجائے براہ راست برطانوی حکومت کے پاس چلا گیا ۔ ہندوستان کے امور طے کرنے کے لیے ایک وزیر ہند کا تقرر کر دیا گیا۔ یہ وزیر ، برطانوی کابینہ کا ایک رکن شمار کیا جاتا تھا۔ وزیر ہند کی مدد کے لیے ایک کونسل قائم کر دی گئی ، جس کے اراکین کی تعداد پندرہ ہوتی تھی۔ ان میں سے اکثر لوگ وہ تھے جنھوں نے کم از کم دس برس ہندوستان میں سرکاری خدمات انجام دی ہوں یا جو ہندوستان میں رہے ہوں۔ ہندوستان میں وائسرائے یا گورنر جنرل ، پریذیڈینسیوں (1) کے گورنر اور سپریم کونسل کے عام ممبران کی تقرری ملکہ برطانیہ کریں گی۔

برطانوی حکومت کے ہندوستان پر براہِ راست تسلّط سے یہاں کے نداز حکومت میں بنیادی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ کمپنی نے اپنی حکومت کی بنیاد سیاسی اور فوجی قوت کے ستعمال پر رکھی تھی اور ان کا مجموعی انداز مقامی اداروں اور آبادی کو بدحال کرنے پر مبنی تھا۔ برطانوی حکومت کے زیر اثر نداز حکومت کا نمایاں پہلو آئینی اور پارلیمانی ہو گیا تاہم حکومت کے مقاصد بدستور سامراجیت پر مبنی رہے۔(2) اس نظام میں نہایت محدود سطح پر مقامی نمائندوں کو شامل کیا گیا اور خود اختیاری کا عمل نہایت سُست رہا۔

---

(1) پریذیڈنسی ، کسی علاقے کی سیاسی انتظامی تقسیم کو کہتے ہیں۔ انگریزوں نے خاص انتظامی ضرورتوں کے تحت کچھ علاقوں کو پریذیڈنسی قرار دے دیا اور یہاں پر گورنر کو انتظامی سربراہ مقرر کیا جاتا تھا۔

(2) ہندوستان میں برطانوی طرز حکومت کے قیام سے پہلے یہاں پر بادشاہی نظام حکومت رائج تھا۔ اس نظام میں تمام تر انتظامی ، قانونی اور عدالتی طاقت کا سرچشمہ بادشاہ کی ذات ہوتی

انگریزوں نے آکر، ہندوستان پر کئی سو سالوں سے قائم مسلمان بادشاہوں کی حکومت کا خاتمہ کیا۔ 1857ء کی جنگ آزادی مسلمانوں کے حکومتی گروہ کی طرف سے آخری مزاحمت تھی، جو ناکام رہی۔ اس کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں کو بڑی بے دردی سے قتل کیا اور ان کی معاشی زندگی کو سخت مشکل میں ڈال دیا۔ 1858ء میں ہندوستان پر براہِ راست برطانوی حکومت کے تسلط کے بعد یہاں کی تمام قومیتوں میں سب سے زیادہ مسلمانوں کے مفادات پر شدید ضرب لگائی گئی۔ مسلمانوں کے بارے میں ابتدا سے ہی، انگریزوں کے خیالات معاندانہ تھے۔ 1843ء میں گورنر جنرل نے لکھا تھا:۔

> "میں اس حقیقت سے اپنی آنکھیں بند نہیں کر سکتا کہ یہ (مسلمان) قوم بنیادی طور پر ہماری دشمن ہے اور ہمارے لیے صحیح پالیسی یہ ہے کہ ہندوؤں سے بنائی جائے۔"

چونکہ انگریزوں نے مسلمانوں سے اقتدار چھینا تھا، صاف ظاہر ہے کہ مسلمان انگریزوں کو اچھا نہ سمجھتے تھے۔ اس کے برعکس ہندو، پہلے بھی مسلمانوں کے محکوم تھے مگر انگریزوں کے زیرِاثر انھیں ترجیحی سیاسی حیثیت ملنے سے، انھیں زندگی میں

تھی۔ بادشاہ، اپنے حلیف جاگیرداروں اور امرا کی مدد سے حکومتی معاملات چلاتا تھا۔ اس نظام میں عام لوگوں کی رائے کو ہندوستان میں وقعت نہ دی جاتی تھی۔ برطانوی طرز حکومت پارلیمانی نظام سیاست پر استوار تھا۔ اگرچہ یہاں بھی مرکزیت بادشاہ کو حاصل تھی مگر اس کی حیثیت محض روایتی اور رسمی تھی۔ حکومتی معاملات کلی طور پر عوام کے نمائندے ہی چلاتے تھے۔

برطانوی طرز حکومت کو جب ہندوستان میں نافذ کیا گیا تو اس کی کارکردگی کو برطانیہ کے مقابلے میں محدود رکھا گیا۔ اس کی ایک وجہ ہندوستانی عوام میں اس نظام سے متعلق آگاہی کی کمی اور دوسرے عدم تجربہ کو قرار دیا جاتا ہے تو دوسری طرف انگریز اس نظام کو اس حد تک نافذ کرنا چاہتے تھے کہ جس سے ان کے مفادات متاثر نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں برطانوی پارلیمانی نظام خاص قیود میں آگے بڑھا اور ہندوستانی عوام کی اس میں شمولیت نہ ہونے کے برابر رہی۔ بادشاہوں کی طرح انگریزوں نے بھی ہندوستان میں بااثر لوگوں کا ایک طبقہ پیدا کیا اور انھیں مراعات دے کر اپنا وفادار رکھا۔ انھی کی مدد سے انھوں نے اپنے حکومتی معاملات کی نگرانی کی۔

بہتر مواقع کی توقع پیدا ہو گئی۔ مسلمان ، انگریزوں سے نفرت کے باعث انگریزی حکومت کی پالیسیوں سے بھی دور رہتے تھے اور اس میں شمولیت کے لیے ضروری تقاضے بھی پورا کرنے سے احتراز کرتے تھے۔ ان تقاضوں میں سب سے اہم انگریزی عہد میں تعلیم جدید کو اپنانا سرفہرست تھا۔ چونکہ انگریز ، ہندوؤں کو مسلمانوں کے مقابلے میں بہتر شریکِ حکومت تصور کرتے تھے، اس لیے کمپنی کی حکومت کے دور میں ہی ہندوؤں میں سے ایک طبقے نے انگریزی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دی اور اٹھارھویں صدی عیسوی تک ان کی ایک کثیر تعداد باقاعدہ طور پر حکومتِ برطانیہ میں شرکت اختیار کر چکی تھی۔

ہندوؤں نے انگریزی حکومت کے قیام کے عمل کے ساتھ ساتھ اپنی علیحدہ شناخت کو منوانے کے لیے ہندو قوم پرستی کی تحریک شروع کر دی تھی۔ اس تحریک میں ہندوؤں کے قدیم ورثے اور عقائد کو نئے ڈھنگ سے پیش کیا گیا۔ بعض امور میں مسلمانوں کے مخالف نظریات کو بھی فروغ دیا گیا، اور اس سلسلے میں ہندوستان میں مسلمان بادشاہوں کے چند اقدامات پر سخت نکتہ چینی کی گئی۔ وہ ان بادشاہوں کی ہندوؤں سے متعلق پالیسیوں کو استحصال قرار دیتے تھے۔ دوسری جانب انگریزوں کے ہندوستان میں آنے کو ، بعض بنگالی ہندو مفکرین نے حق بجانب قرار دیا اور ان کی اعانت کو ضروری قرار دیا۔

اس صورتحال میں مسلمانوں کو ایک طرف انگریزوں کی عدم توجہی اور دوسری طرف ہندوؤں کی غیر مفاہمانہ پالیسیوں کا سامنا تھا۔ اس صورتحال کی اشتیاق حسین قریشی نے اس طرح وضاحت کی ہے:

"ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان زیادہ یگانگت یا جذبے کا اتحاد بھی نہ ہوا تھا ۔ کوئی حکمران قوم اپنی محکوم نسل کی محبت اس حد تک حاصل کرنے کی امید نہیں کر سکتی۔ مسلمان جو کچھ بہتر سے بہتر حاصل کر سکتے تھے وہ انھوں نے حاصل کیا۔ جب تک ان کی حکومت جاری رہی، وہ آبادی کے بڑے بڑے طبقوں میں اپنی حکومت کو پسند کرانے میں کامیاب

رہے اور جب ان کی حکومت خاتمے پر آئی تو اس وقت بھی ان کے خلاف غصے کے جذبات مشتعل نہیں ہوئے۔ مسلمانوں کا خود بھی یہ مقصد نہیں تھا کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ مکمل مل کر ایک ہو جائیں۔ ان کے اس تردد نے کہ وہ اپنی ہستی کو برقرار رکھیں اور ہندوؤں کی اس خواہش نے کہ وہ الگ تھلگ رہیں یکساں طور پر دونوں قوموں کو ایک دوسرے کے اندر تحلیل ہو جانے اور ایک قوم بن جانے سے روکا۔"

(برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ ص 306,305)

اسی تناظر میں مسلمان مفکرین نے بھی بدلتے حالات میں مسلمان قوم میں خاص افکار اور تحریکات کو فروغ دیا۔ ان مفکرین میں شاہ ولی اللہؒ، حاجی شریعت اللہؒ، سید احمد شہیدؒ اور دیگر مشاہیر کرام شامل ہیں۔ انگریزی حکومت کے دوران مسلم قوم پرستی اور ہندو قوم پرستی کی تحریکات نے شدت اختیار کی، اور یہی تناظر بعدازاں دونوں اقوام اور ان دونوں کے انگریزی حکومت کی طرف رجحانات اور رویوں کے لیے اساس بنتا ہے۔

1858ء کے بعد ہندوستان میں نیا اقتصادی ڈھانچہ استوار کیا گیا۔ اس میں بنیادی مقاصد ہندوستانی وسائل کو برطانوی صنعتوں کی ضروریات کے مطابق بڑھانا، ان کی ترسیل اور نقل و حمل کو موثر بنانا اور ہندوستان کو خام مال کی ایک منڈی کے طور پر ترویج دینا تھا۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے پیداواری علاقوں میں نہروں کی کھدائی، ریل کی پٹڑیاں بچھانا اور نئی منڈیاں قائم کرنا تھے۔ انگریز ہندوستانی خام مال کو برطانیہ کی فیکٹریوں میں بھجواتے اور پھر اس تیارشدہ مال کو فروخت کر کے زرمبادلہ کماتے تھے۔ ہندوستان کو بھی برطانوی مال کی کھپت کے لیے بہت بڑی منڈی سمجھا جاتا تھا۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ انگریز ہندوستان کو ایک صنعتی معیشت (1) کے طور پر ترقی نہ دینا چاہتے تھے۔ وہ ہندوستان کے زرعی اور معدنی وسائل کو اپنے استعمال میں

---

(1) دنیا میں صنعتی انقلاب کے معنے ہے، بتدریج طور پر زرعی پیداوار سے منسلک صنعتوں کو فروغ حاصل ہو۔ مثال کے طور پر دستکاری کے بجائے مشینوں کے ذریعے، بہت کم محنت سے زیادہ مقدار میں تیار کیا جاتا تھا۔ یہیں سے صنعتوں کا محور دوسرے میدانوں میں بڑھ

نہ چاہتے تھے۔ اس لیے صنعتی ترقی پر زور دینے کی بجائے، خام مال کو برطانیہ بھیجو دیا جاتا تھا تاکہ وہاں کی فیکٹریوں اور صنعتوں میں اضافہ ہو۔

بیسویں صدی کے وسط تک ہندوستان کی معیشت میں عدم توازن رہا۔ حکومت برطانیہ نے صرف ان علاقوں کو محدود ترقی دی جہاں سے خام مال مہیا ہو سکتا تھا۔ باقی علاقوں میں عام کسانوں کی حالت حد درجہ خراب رہی۔ ہندوستانی آبادی کی زیست کا انحصار زرعی پیداوار پر ہی تھا اور اس میں آبادی کے اضافے کے تناسب سے ضروری ترقی نہ ہونے کے باعث شدید بحران پیدا ہوئے۔ اس کی نشاندہی ان قحطوں کے بکثرت وقوع پذیر ہونے سے کی جا سکتی ہے۔ 1860ء سے 1879ء کے درمیانی عرصے میں [illegible] قحط پڑے۔ ان میں 1876-78ء کے قحط میں تقریباً 50 لاکھ سے زیادہ افراد لقمۂ اجل بنے۔ اس کے بعد 1896ء تا 1908ء کے درمیانی عرصے میں تین بڑے قحط پڑے۔ ان قحطوں کی بنیادی وجہ صرف اجناس کی کمی نہ تھی بلکہ اجناس کی مناسب تقسیم نہ ہونے کے باعث صورتحال سنگین ہوئی۔ حکومت برطانیہ نے 1883ء میں ایک ایکٹ کے تحت صوبوں میں اجناس کی تقسیم کے نظام کو بہتر بنانے کی کوشش کی، مگر اس پر مؤثر طور پر عمل نہ کیا گیا۔ تاہم قحطوں کی شدت پر قابو پا لیا گیا مگر حکومتی پالیسیوں کے عدم توازن کے باعث ایک انگریز مؤرخ کے بقول جنس کے خوفناک قحط آنے کی بجائے کسی حد تک قابل برداشت نوکریوں کے قحط کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اور معدنی وسائل پر منحصر صنعتوں کو فروغ ملا۔

بیسویں صدی کے وسط تک یورپ میں صنعتی انقلاب اپنے عروج پر تھا۔ اس انقلاب سے نئی مشینوں کی مدد سے بہت سی پیداوار بہت کم وقت میں ممکن ہو گئی۔ ایسی صورت میں خام مال کی بھی عام حالات سے زیادہ مقدار میں ضرورت ہوتی تھی۔ برطانیہ میں مقامی طور پر خام مال نہ ملنے کے باعث اس کے حریف فرانس کی معاشی ترقی اس سے کہیں زیادہ ہو گئی تھی۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے برطانیہ نے افریقہ اور ایشیا میں نوآبادیات قائم کر کے وہاں کے وسائل کو اپنے تصرف میں لانا شروع کر دیا۔

برطانوی معیشت میں اس سے پہلے زیادہ زور ایسی اشیاء کی تیاری پر دیا جاتا تھا جن سے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل ہو سکے۔ ایسی معیشت کو صنعتی معیشت کہتے ہیں۔

1858ء سے بیسویں صدی عیسوی کی ابتدا تک زراعت پیشہ لوگوں کی معاشی حالت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس عرصے میں بہت سی زرعی زمینیں قرضوں کی عدم ادائیگی کے باعث ساہوکاروں کے ہاتھ میں چلی گئیں۔ اکثر کسان اور زمیندار پیداوار میں کمی اور مارکیٹ میں کم قیمت ملنے کے باعث اپنے ضروری اخراجات بھی پورے نہ کر پاتے۔ اس صورتحال میں وہ ساہوکاروں سے اپنی زمینیں رہن رکھ کر قرضے لیتے۔ انھیں قرضوں پر ساہوکار کو سود در سود ادا کرنا پڑتا تھا، جو ان کی استطاعت سے کہیں باہر ہوتا تھا۔ آخر معمولی سی قانونی چارہ جوئی کے بعد ساہوکار کے حق میں زمینیں قرق ہو جاتی تھیں۔ ایک انگریز مورخ کے سروے کے مطابق انیسویں صدی کے آخری تین چار عشروں میں 742 خاندانوں میں سے 566 بری طرح اُدھار کے چنگل سے پھنسے ہوئے تھے۔ 1866ء تا 1874ء کے درمیانی عرصے میں 88,000 ایکڑ اور 95-1890ء کے درمیانی عرصے میں 3 لاکھ 38 ہزار ایکڑ اراضی مہاجنوں اور ساہوکاروں کے ہاتھ قرضہ جات کی وصولی کے سلسلے میں فروخت ہوئی۔ ان حالات میں صدیوں سے کاشت کاری کرنے والے خاندان، اپنی خاندانی زمینیں فروخت کرنے پر مجبور ہو گئے اور انھیں مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالنا پڑا۔ اس سے دیہات میں غیر حاضر زمینداری کا بھی رجحان زور پکڑنے لگا۔ غیر حاضر زمینداری سے مقامی معاشرت میں انتشار کے ساتھ ساتھ پیداوار میں بھی کمی واقع ہو جاتی ہے۔ صدیوں سے اکٹھے رہنے والی دیہاتی آبادی میں باہر سے آنے والے مالکوں کو سخت نفرت سے دیکھا جاتا تھا کیونکہ وہ ان کی زمینوں کو غصب کرتے تھے۔ کم توجہ دینے کی وجہ سے پیداوار میں بھی کمی ہو جاتی تھی۔ واضح رہے کہ غیر حاضر زمینداروں کے معاشی وسائل محض زرعی پیداوار تک محدود نہ تھے۔

سر سید احمد خاں

"ایک بار سر سید نے محض ایک اجنبی مسافر انگریز سے جو ایک ڈاک بنگلے میں ٹھہرا تھا، چندہ طلب کیا۔ اُس نے بہت روکھے پن سے یہ جواب دیا کہ آپ کو اس کام کے لیے صرف اپنی قوم سے (چندہ) مانگنا چاہیے۔ سر سید نے کہا "بے شک ہم کو قوم کی پست ہمتی (کے باعث) غیروں

کے سامنے ہاتھ پسارنا پڑتا ہے۔ مگر یاد رکھنا چاہیے کہ اگر یہ انسٹی ٹیوٹ (علی گڑھ سکول) بغیر انگریزوں کی اعانت کے قائم ہوگیا، تو انگریزوں کے لیے کوئی ذلت کی بات اس سے زیادہ نہ ہوگی کہ وہ باوجودیکہ ہندوستان کی حکومت سے بے انتہا فائدے اٹھاتے ہیں مگر ہندوستانیوں کی بھلائی کے کاموں میں مطلق شریک نہیں ہوتے۔" وہ انگریز یہ سن کر شرمندہ ہوا اور اسی وقت ایک نوٹ بیس روپے کا سر سید کی نذر کیا۔"

(حیاتِ جاوید ص 222)

انیسویں صدی کے آخری نصف حصے میں سر سید احمد خان جیسا ہمدرد، باعمل اور صاحبِ بصیرت رہنما مسلمانانِ ہندوستان کو نصیب نہیں ہوا۔ انھوں نے انگریزی حکومت سے مسلمانوں کی زندگی پر مرتب ہونے والے ثمرات کا نہ صرف محتاط تجزیہ کیا، بلکہ اُس صورتحال میں موزوں ترین اقدام بھی کیے۔ انھوں نے مسلمانوں کی سماجی، تعلیمی اور سیاسی میدان میں رہنمائی کی۔ انھی کوششوں کی بنیاد پر، بعد میں مسلمان قوم پرستی کی تحریک مضبوط اور مؤثر ہوئی۔

انگریزی استعماریت کے قیام اور بعد ازاں استحکام کے دور میں مسلمانوں میں ہر صاحب علم اپنی قوم کی حالت پر نہ صرف پریشان تھا بلکہ وہ اپنے تئیں اِن حالات کا تجزیہ کر کے اپنا حل پیش کر رہا تھا۔ مجموعی طور پر اس دور میں دو قسم کے نظریات زیادہ واضح نظر آتے ہیں۔ ایک کا خیال تھا کہ انگریزوں کی ظالمانہ پالیسیوں کے اثرات کو صبر سے جھیلا جائے اور ساتھ ہی ساتھ قوم کی اخلاقی تربیت کی جائے۔ اسلامی تعلیمات کو بنیاد بنا کر ایک اسلامی معاشرہ تعمیر کیا جائے، جس کا سیاسی نظام بھی اسلامی رُوح کے مطابق ہو۔ اس گروہ کے رہنماؤں کا خیال تھا کہ اسلامی تعلیمات کے نفاذ کے سامنے سب سے بڑی رکاوٹ ہندوستان میں انگریزوں کا وجود ہے۔ ہندوستان، جب انگریزوں کے وجود سے پاک ہو جائے گا تو خودبخود یہاں موزوں حالات پیدا ہو جائیں گے

دوسرے گروہ کا خیال تھا کہ موجودہ حالات میں مسلمانوں کی زندگیوں میں سدمتی

لانے کے لیے سب سے پہلے فوری اور بنیادی نوعیت کے مسائل کی طرف توجہ مبذول
کرنی چاہیے۔ اس ضمن میں وہ انگریزوں کی مسلمانوں سے مخاصمت کو کم کرنے پر زور
دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انگریزوں کی مسلم دشمنی میں کمی سے مسلمانوں کو ملازمتیں
ملنا شروع ہو جائیں گی اور ان کی معاشی حالت بھی نسبتاً بہتر ہو جائے گی۔ اسی بنیاد پر
مسلمانوں کی معاشرتی اور سیاسی ساکھ بہتر ہوگی اور وہ اپنے مستقبل کے لیے بہتر طور پر
تیار ہو سکیں گے۔ اس قسم کے نظریات کا حامل گروہ مجموعی طور پر، مسلمانوں میں
باعمل اور حالات کے مطابق تبدیلیاں لانے پر زور دے رہے تھے۔ ان رہنماؤں میں
سب سے مؤثر تحریک سرسید احمد خان نے شروع کی۔

سرسید احمد خان 17- اکتوبر 1817ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے آباؤ اجداد شاہ جہان
کے عہد میں افغانستان سے ہندوستان آئے۔ اس سے پہلے وہ عرب سے ایران اور پھر
ایران سے افغانستان چلے آئے تھے۔ سرسید کے خاندان کا تعلق ایک طویل عرصے تک
مغلیہ دربار سے رہا اور یہاں وہ مختلف اہم عہدوں پر متمکن رہے۔ مغلیہ دربار سے ان
کا تعلق اکبر شاہ دوم (بہادر شاہ ظفر کے والد) تک برقرار رہا۔

والد کے انتقال کے بعد سرسید نے ایسٹ انڈیا کمپنی میں نوکری کر لی۔ 1857ء
کی جنگ کے دوران وہ بجنور میں ایک سب جج کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔

اس عہد میں مسلمانوں کی مجموعی حالت حد درجہ خراب تھی۔ انگریزوں نے 1857ء
کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کے کردار کو بہانہ بنا کر، ان پر سخت مظالم توڑے اور
ان کے لیے معاشی مشکلات پیدا کرنا شروع کر دی تھیں۔ سب سے افسوسناک بات یہ
تھی کہ اس نازک حال میں کوئی شخص مسلمانوں کی حقیقت پسندانہ رہنمائی بھی نہ کر رہا
تھا۔ سرسید ان حالات میں سخت مایوس ہوئے اور انھوں نے ملک چھوڑ دینے کا فیصلہ
کر لیا۔ بعد میں انھیں خیال آیا کہ وہ دوسروں کی طرف نگاہیں اٹھانے کی بجائے خود ہی
اپنی قوم کی بہتری کے لیے کیوں نہ عملی ہو جائیں۔ اسی خیال کے بعد انھوں نے
وطن چھوڑنے کا خیال ترک کر دیا اور پوری تندہی سے اپنی قوم کے لیے کام شروع
کر دیے۔

سر سید احمد خاں نے اپنی زندگی کا ایک اہم حصہ مسلمانوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں بہتری لانے پر صرف کیا۔ ان کی خدمات کے مرکزی مقاصد یہ تھے۔

1- مسلمانوں کو نئے تقاضوں کے مطابق تعلیم حاصل کرنے کی طرف مائل کرنا۔

2- ہندوستان میں بسنے والی دوسری اقوام اور حکمران جماعت سے بہتر تعلقات استوار کرنا اور اس ضمن میں غلط فہمیوں کو ختم کرنا۔

3- نئے تقاضوں کے تحت مسلمانوں کے معاشرتی رویوں کی اصلاح کرنا۔

تعلیمی خدمات:

عام طور پر تعلیم سیکھنے کا مقصد کسی فرد کی ذاتی تہذیب اور اس کی پیشہ ورانہ تربیت ہوتا ہے۔ جب کسی معاشرے میں زیدہ سے زیادہ لوگ تعلیم یافتہ اور سمجھ دار ہوں گے تو اس قوم کے مجموعی رویے بھی بہتر ہو جائیں گے۔ ان کے عام رویوں میں بھی سمجھ اور تہذیب کا عنصر جھلکے گا۔

تاریخ میں یہ بات دیکھنے میں آئی ہے کہ ہمیشہ حاکم قوم کے طے کردہ تعلیمی اور تہذیبی اصولوں اور انداز تعلیم کو ہی ایک آئیڈیل سمجھا جاتا ہے۔ محکوم لوگوں کو یہ باور کروا دیا جاتا ہے کہ انھی طریقوں پر چل کر ہی انھیں بہتر زندگی میسر آ سکتی ہے۔

ہندوستان میں انگریزوں کے آنے اور ان کی حکومت قائم ہونے کے بعد تمام تہذیبی نظریات بدل گئے۔ انگریز، دنیا بھر میں صنعتی انقلاب کے نقیب تھے اور اسی کے تحت حاصل کی ہوئی قوت کو وہ نوآبادیاتی نظام میں ایک آلۂ استبداد کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔ ان کے مقابلے میں ہندوستانی تہذیب اور یہاں بسنے والوں کا اجتماعی مزاج قدامت پرستانہ تھا اور اس کے تحت ان کی زندگی کے مختلف شعبوں میں کارکردگی سست اور روایتی تھی۔

اس وقت تہذیبی معیار سائنسی (1) طریقوں اور ٹیکنالوجی (2) کو قرار دیا جا چکا

---

(1) سائنس، بنیادی طور پر، کائنات میں موجود مختلف چیزوں، کیفیتوں، حالتوں اور انسانی ماحول کے تجزیاتی مطالعے کا نام ہے۔ مثال کے طور پر کائنات کیسے وجود میں آئی ہے؟ گیند جب اچھالی جائے تو وہ زمین کی طرف ہی کیوں آتی ہے، ایک سوئی پانی میں ڈوب جاتی ہے مگر

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

تھا اور اس ضمن میں تمام تر ضروری علوم کا خزانہ انگریزی زبان میں تھا۔ ان حالات میں جب ترقی کے معیار بدل چکے تھے، ضروری تھا کہ نئے تقاضوں کو اپنی وراثت اور تہذیب سے ہم آہنگ کر کے آگے بڑھا جائے۔

دوسری طرف صورتحال یہ تھی کہ انگریز جن کا تعلق نئے علوم سے تھا اور جو اس کے مہتمم بھی تھے، مسلمانوں کو نئے تہذیبی عمل میں اپنے ساتھ نہ رکھنا چاہتے تھے۔ وہ اپنی رعایا میں ہندوؤں کو مسلمانوں پر ترجیح دیتے تھے۔ انگریز مسلمانوں کو ہندوستان کے سابقہ حاکم اور 1857ء کی جنگ آزادی میں ان کے کردار کے باعث 'ناپسندیدہ قوم' قرار دے چکے تھے۔ انگریز مؤرخ اور ذمے دار افسران کو بھی اس کا شدت سے احساس تھا۔ اس ضمن میں ایک انگریز نے اس طرح وضاحت کی ہے:۔

"انگریزوں نے مسلمانوں کو اپنا اصلی دشمن اور سب سے خطرناک حریف سمجھا اور وہ ان پر خونخوار درندوں کی طرح ٹوٹ پڑے۔ جنگ آزادی کی ناکامی مسلمانوں کے لیے سب سے زیادہ تباہ کن ثابت ہوئی۔ مسلمانوں میں ہندوؤں پر روایتی برتری کا جو کچھ بھرم باقی تھا، اس کا خاتمہ ہوگیا اور وقتی طور پر بیرونی حاکم کا بھی ان پر اعتماد اٹھ گیا۔"

عام مسلمانوں میں بھی، انگریزوں کی پالیسیوں کے باعث شدید ردِعمل موجود تھا، وہ بجا طور پر اپنی تمام مصیبتوں کی اصل وجہ انگریزوں کو سمجھتے تھے۔ اسی تناظر میں

بقیہ حواشی

ایک بڑا جہاز پانی میں تیر سکتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح انسان اور انسانی ماحول سے متعلق مختلف احوال اور کیفیت کے حقیقی اور بے لاگ مطالعے کو بھی سائنس کہا جاتا ہے۔ مجموعی طور پر سائنس ایک طرز زندگی اور سوچ کا ایک ڈھنگ ہے جس پر عمل کر کے ہر فرد غیر ضروری تعصبات اور بے عقل رویوں سے دُور چلا جاتا ہے۔

(۲) کائنات کی مادی اشیا اور کیفیت کو سمجھنے کے لیے سائنسی طریقے اپنائے جاتے ہیں۔ ان طریقوں کی مدد سے جو نظریات قائم ہوتے ہیں، ان کو کلیوں کی شکل دے دی جاتی ہے۔ انہی کی بنیاد پر پھر نئی مصنوعات اور جدید آلات استوار کیے جاتے ہیں۔ نئی مصنوعات اور آلات کی تیاری کا حقیقی طریقہ ٹیکنالوجی کہلاتا ہے۔ مثال کے طور پر نیوٹن نے عمل اور ردِعمل کا اصول دریافت کیا کہ اگر ایک گیند کو دیوار پر مارا جائے تو وہ پلٹ کر واپس آتا ہے۔ اسی اصول پر راکٹ اڑانے کی ٹیکنالوجی استوار ہوئی۔

انگریزوں اور ان سے وابستہ تمام چیزوں سے وہ شدید نفرت کرتے تھے۔ ان میں انگریزی لباس، تعلیم اور انداز معاشرت بھی شامل ہیں۔ انگریزی تعلیم سے نفرت کا یہ عالم تھا کہ 1875ء میں صرف 20 مسلمان گریجوائیٹ تھے جبکہ اس وقت ہندو گریجوائیٹ کی تعداد 846 تھی۔ 1845ء میں پورے ہندوستان میں انگریزی سکولوں میں ساڑھے سترہ ہزار طالب علم تھے جن میں مسلمانوں کی تعداد صرف ایک ہزار چھ سو تھی۔ 1861ء میں کلکتہ یونیورسٹی کے داخلے کے امتحان میں آٹھ سو انچاس طالب علم تھے جن میں سے صرف 26 مسلمان تھے۔ اسی سال تیرہ لڑکوں نے بی۔ اے پاس کیا، جن میں صرف ایک لڑکا مسلمان تھا۔

مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی مذکورہ صورتحال کا ان کے روزگار کے حصول پر بھی اثر یقینی تھا کیونکہ سرکاری اداروں میں نوکری کے لیے انگریزی تعلیم کا سرٹیفکیٹ ضروری تھا۔ 1871ء میں انگریز حکومت کے ملازموں کی تعداد 2141 تھی، جن میں سات سو گیارہ ہندو اور صرف بانوے مسلمان تھے۔

اس صورتحال میں سرسید کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو اپنی حیثیت منوانے کے لیے خود اعتمادی حاصل کرنے پر زور دینا چاہیے۔ یہ خود اعتمادی دورِ جدید زندگی میں جدید تعلیم کے بغیر ممکن نہ تھی۔ انھوں نے ایک مرتبہ اس مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:۔

> "کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ہم سیاسی معاملات پر بحث کریں تو ہمارے قومی مسائل میں بہتری آئے گی۔ مجھے اس سے اتفاق نہیں، میرے خیال میں قومی خدمت کا صرف ذریعہ یہی ہے کہ تعلیم کو فروغ دیا جائے۔ ہماری قوم کو بھی دوسرے امور چھوڑ کر صرف اور صرف تعلیم کی ترویج پر زور دینا چاہیے۔ جب ہم بہتر طور پر اپنی تعلیمی حیثیت ٹھیک کر لیں گے تو ہماری پس ماندگی خود بخود کم ہو جائے گی۔"
>
> (حیاتِ جاوید مصنفہ مولانا الطاف حسین حالی)

سرسید نے اس نظریے کو اپنی کوششوں کے لیے بنیاد بنایا اور اسی سمت با عمل

سرگرمیاں شروع کر دیں۔ 1859ء میں مراد آباد میں ایک مدرسہ کھولا ، 1859ء میں تعلیم کی افادیت پر ایک پمفلٹ شائع کیا اور 1864ء میں غازی پور میں ایک مدرسہ قائم کیا۔ یہ سب سرسید کی ابتدائی کاوشیں تھیں۔ تعلیم کے بارے میں بہتر آگاہی اور انگریزی تعیلم کے تقابلی مطالعے کے لیے آپ 1869ء کو انگلستان گئے۔ یہاں آپ نے سترہ ماہ قیام کیا اور بہت سے مدارس اور تعلیمی معاملات کا جائزہ لیا۔

انگلستان سے واپس آکر آپ نے ایک کمیٹی تشکیل دی، جس کا مقصد ایک پرائمری سکول قائم کرنا تھا۔ 1875ء میں علی گڑھ (بھارت کے صوبہ اترپردیش کا شہر) میں ایک پرائمری سکول قائم کیا گیا۔ سرسید اس مدرسے کو ایک کالج بنانے کی فکر میں تھے۔ کالج کی تعمیر کے لیے زمین اور بھاری رقوم کی ضرورت تھی۔ یہ رقوم کہاں سے حاصل کی جائیں؟ سرسید کے سامنے اب سب سے بڑا سوال یہی تھا۔ مسلمانوں میں ایک گروہ تو سرسید کے نظریات کا مخالف تھا اور اِس بارے میں بڑی شدّت سے عام لوگوں میں ان کے خلاف جذبات پیدا کر رہا تھا۔ دوسری جانب بقول حالی مسلمان قومی جدوجہد کے لیے چندے دینے کے عادی بھی نہ تھے، ماسوائے یہ کہ ان پر دباؤ ہو یا انھیں حکومتی احکام کا ڈر ہو۔ سرسید نے شدید مخالفت اور مسلمانوں کی عدم دلچسپی کے باوجود ناممکن کو ممکن بنا دیا۔ انھوں نے ہر مکتبۂ فکر اور ہر درجے کے لوگوں سے چندہ مانگا۔ دوستوں سے مسلسل چندہ مانگتے ، ان کے ایک رفیق مولانا حالی نے ان کی سوانح عمری میں لکھا ہے:۔

> "سرسید کے دوست (چندہ) دیتے دیتے تھک گئے مگر وہ مانگتے مانگتے نہ تھکے ۔ وہ ایک آرٹیکل میں لکھتے ہیں کہ "ہمارا تو یہ حال ہو گیا ہے کہ ہمارے دوست بھی ہم سے ملتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کچھ سوال نہ کر بیٹھیں۔ ہماری صورت ہی اب سوال ہو گئی ہے۔ میں نے ایک دوست سے کہا کہ بھائی ، میری قسمت میں بھیک مانگنا لکھا تھا، سو اس نکھے کی برماتا ہوں۔ مگر شکر ہے کہ اپنے لیے نہیں بلکہ قوم کے لیے......"
>
> (حیاتِ جاوید)

حیات جاوید میں ایک اور جگہ لکھا ہے کہ سر سید جہاں کہیں سفر کرتے، اپنے حباب کو کہتے کہ انھوں نے دعوت پر جو روپیہ خرچ کرنا ہے وہ انھیں نقد دے دیں۔ سر سید اس رقم کو کالج کے چندے میں شامل کر لیتے تھے۔ سر سید کو اپنی قوم کی بہتری کے لیے کوشش کرنے کی لگن تھی اور اس کے لیے انھوں نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔

1877ء میں علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی گئی، 1878ء میں کلاسیں شروع ہوگئیں۔ اس وقت کالج میں دو شعبے تھے۔ ایک شعبۂ انگریزی، جس میں یونیورسٹی کے کورسز اور ایک میں عربی اور فارسی میں مختلف علوم پڑھائے جاتے تھے۔ عربی اور فارسی کے شعبہ میں بہت کم طالب علم داخلہ لیتے تھے کیونکہ اس زمانے میں یہ علوم روزگار کے حصول میں مددومعاون نہ سمجھے جاتے تھے۔

کالج میں ہر روز پہلے پیریڈ میں اسلامی تعلیمات پر لیکچر دیا جاتا تھا، اس پیریڈ میں حاضر ہونا لازمی تصور کیا جاتا تھا۔ کالج کے تمام مسلمان طلبہ کو پانچوں وقت کی نماز ادا کرنا ضروری تھا، بصورتِ دیگر جرمانے کی سزا دی جاتی تھی۔

مجموعی طور پر علی گڑھ کالج میں تعلیم و تربیت کا پہلا اور آخری مقصد مسلمان قومیت کو اجاگر کرنا تھا۔ اس ضمن میں حقیقی علوم کے ساتھ ساتھ ظاہری شناخت پر بھی توجہ دی گئی۔ کالج کے طلبہ کے لیے ترکی طرز کے کوٹ اور ٹوپی کو پہننا ضروری قرار دیا گیا۔

آہستہ آہستہ پورے ہندوستان اور خاص طور پر بنگال اور پنجاب کے مسلمانوں نے اپنے بچوں کو علی گڑھ بھجوانا شروع کر دیا۔ 1893ء کے اعداد و شمار کے مطابق مسلمانوں کو تعلیم یافتہ کرنے میں علی گڑھ کی کارکردگی خاصی حوصلہ افزا رہی۔ علی گڑھ، شمالی صوبہ جات اور اودھ کے علاقوں میں مسلمان گریجوائیٹ طلبہ کی تعداد میں 11.2 سے 17.6 فیصد اضافہ ہوا۔

سر سید، کالج کی کارکردگی کو مزید بہتر بنانے کے لیے کوششیں کر رہے تھے۔ وہ کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دلوانا چاہتے تھے مگر یہ کام ان کی زندگی میں ممکن نہ ہو سکا۔ 1920ء میں علی گڑھ کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دے دیا گیا۔

علی گڑھ کالج کو مسلمانوں کی تعلیم وتربیت میں ایک مرکز کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ سر سید یہاں پر دی جانے والی تعلیمی سہولتوں کو مسلمانوں کے لیے ناکافی سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس مقصد کے لیے زیادہ سے زیادہ مدرسے کھولے جائیں۔ دوسری طرف وسائل کی شدید کمی کے باعث ایسا کرنا بھی ممکن نہ تھا۔ اسی تناظر میں انھوں نے مسلمانوں میں تعلیمی ضروریات ور تعلیم کی افادیت کو اجاگر کرنے کے لیے 1886ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد رکھی۔ اس ادارے کے اہم مقاصد حسبِ ذیل تھے:۔

1- مسلمانوں میں جدید تعلیم کو عام کیا جائے۔
2- روایتی تعلیم میں قومی ضروریات کے مطابق ضروری ترامیم کر کے انھیں نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے۔

کانفرنس نے اپنی عملی سرگرمیوں کے ضمن میں مندرجہ ذیل طریقے اپنائے:

ایک یہ کہ کانفرنس کا سالانہ اجلاس ہر سال ایک مختلف شہر میں منعقد کیا جاتا تھا۔ ان اجلاسوں میں ملک بھر سے مسلمان ماہرینِ تعلیم جمع ہوتے اور تعلیمی مسائل اور ان کے حل پر مباحث کیے جاتے تھے۔

دوسرے، اِن اجلاسوں میں مختلف کمیٹیاں تشکیل دی جائیں جو مختلف علاقوں میں مسلمانوں کو درپیش تعلیمی، تجارتی، صنعتی، زراعتی اور دوسرے مسائل پر اپنی رپورٹ تیار کرتی تھیں۔ اپنی کارکردگی اور طریقۂ کار کے اعتبار سے یہ کانفرنس محض تعلیمی مقصد تک ہی محدود نہ رہی بلکہ اس نے مسلمانوں کی جتماعی مشکلات کی طرف توجہ دینا شروع کر دی۔ اس طریقۂ کار سے مسلمانوں میں حالات کے بارے میں شعور بھی بڑھا اور اِن حالات کو بدلنے کے لیے ان میں آگاہی بھی پیدا ہوئی۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے زیرِاثر کراچی، اور حیدرآباد دکن میں مسلمانوں کے کئی ادارے کھولے گئے۔ پنجاب میں اسی کانفرنس سے متاثر ہو کر انجمن حمایت اسلام کی بنیاد رکھی گئی۔ ان اداروں کی وساطت سے نوخیز مسلمان دانشوروں اور کارکنوں کو ایک پلیٹ فارم میسر آیا اور انھوں نے مسلمانوں کے لیے عملی کام کیے۔

معاشرتی خدمات

سرسید کا ذہنی اور شعوری اُفق جدید صنعتی انقلاب اور سائنسی ترقی سے حد درجہ متاثر تھا۔ وہ اس بات کو پورے وثوق سے محسوس کر رہے تھے کہ صنعتی انقلاب اور سائنسی سوچ نے تمام پیداواری ذرائع کی ہیئت تبدیل کر دی ہے اور یہ عمل بڑی تیزی سے روایت پسندی (۱) کو ختم کر رہا ہے۔

نئے حالات میں روایتی طریقۂ استدلال کی بجائے سائنسی اندازِ فکر کو بنیاد سمجھا جاتا تھا۔ اس طرزِ استدلال میں معاملات زندگی کو ٹھوس محرکات اور نتائج کے تناظر میں سمجھا جاتا ہے۔ س کے برعکس ہندوستانی مسلمانوں کا سوچنے کا انداز روایتی تھا اور نئے حالات سے ہم آہنگ ہونے کے لیے ان میں آمادگی کا بھی فقدان تھا۔ مسلمانوں کے مقابلے میں ہندو ۔ بڑی تیزی اور انہماک سے جدید علوم اور طرزِ استدلال کو اپنا رہے تھے اور مستقبل کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اپنی صلاحیتوں میں اضافہ کر رہے تھے۔

سرسید اپنے ہم عصر حالات کا مکمل احساس کرتے ہوئے مسلمانانِ ہندوستان میں مکمل خوداعتمادی پیدا کرنے کے خواہاں تھے۔ اس ضمن میں انھوں نے اپنے رسالے تہذیب الاخلاق میں اس طرح لکھا:۔

---

(۱) مخصوص پیداواری ذرائع میں ایک مدت تک مسلسل رہنے سے ایک گروہ کے رویے روایت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ ان رویوں کے مسلسل جاری رہنے اور ان پر عمل سے لوگ ان رویوں کو اپنی زندگی کا حصہ سمجھنے لگتے ہیں۔ یہی رسوم ، رواج اور روایت کی اساس ہے۔
چونکہ انسانی زندگی پیہم بدلتی رہتی ہے اور پیداواری ذرائع میں بھی تبدیلی کا عمل جاری رہتا ہے، اس لیے انسانی رویوں میں بھی غیر محسوس طور پر تبدیلی آتی رہتی ہے۔ تبدیلی کے اس عمل میں لوگ خودبخود اپنے آپ کو ڈھالتے رہتے ہیں۔ اگر نئے حالات اور نئی ضروریت کے تحت تبدیلی کو ماننے کی بجائے غیر ضروری طور پر روایت پر سختی سے عمل کرنا شروع کر دیا جائے تو یسی صورت میں لوگوں کے رویوں میں بحرانی صورت پیدا ہوتی ہے۔ روایت پر سختی سے کاربند رہنا رویت پسندی کے زمرے میں آتا ہے۔ روایت پسندی میں عدم توازن سے معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی اداروں کا عمل سست ہو جاتا ہے۔

"ہم نے تمام معاملاتِ زندگی میں بلکہ امورِ مذہبی میں بھی ہزاروں رسمیں غیر قوموں کی بسبب اختلاط اور ملاپ اختیار کر لی ہیں مگر جب ہم چاہتے ہیں کہ ہم اپنے طریقِ معاشرت اور تمدن کو اعلیٰ درجہ کی تہذیب پر پہنچائیں تاکہ جو قومیں ہم سے زیادہ مہذب ہیں وہ ہم کو بہ نظرِ حقارت نہ دیکھیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی تمام رسوم و عادات کو بہ نظرِ تحقیق دیکھیں اور جو بُری ہوں ان کو چھوڑ دیں اور جو قابلِ اصلاح ہوں ان میں اصلاح کریں۔"

سرسید کا خیال تھا کہ مسلمان قدامت پسندانہ (1) رسوم اور روایات کو ترک کر کے، سائنسی طرزِ استدلال کو اپنائیں۔ اس ضمن میں ہر قسم کی فکری آزادی کو فروغ دینا بھی ضروری تھا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اگر کوئی قوم اپنے اجتماعی فکر میں آزادی کو نہ اپناتی ہو تو اس میں مضبوط تہذیبی اقدار کا پیدا ہونا مشکل ہوگا۔

سرسید عام رہن سہن کے طریقوں میں بھی تبدیلی لانا ضروری خیال کرتے تھے۔ چنانچہ آپ نے تہذیب الاخلاق میں لکھا:۔

"ترکوں کا تمام لباس بجز ٹوپی کے بالکل یورپین ہے۔ سب نے زمین

---

(1) تمام مخلوقات میں، یہ اعزاز صرف انسان کو ہی حاصل ہے کہ وہ اپنی زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کی مسلسل کوشش کرتا رہتا ہے۔ ہزاروں برس کی مسلسل محنت اور کوشش کے بعد اس نے غاروں کی جانوروں سی، بے بس زندگی کو آج ایک حیران کن روپ دے دیا ہے۔ اس ارتقا میں انسان کی جس قوت نے سب سے زیادہ کردار ادا کیا، وہ اس کی تخلیقی صلاحیت ہے۔ اگر اپنے ارتقا میں کسی درجے پر، انسان قناعت کر لیتا تو زندگی وہیں رک جاتی۔ انسان اپنے سابقہ تجربات اور کارناموں کی بنیاد پر ہی نئی راہیں تلاش کرتا ہے۔ زندگی میں بہتری کے لیے کوشش کرتے رہنا سائنسی سوچ کا حامل ہونا ہی ہے اور سابقہ کارناموں پر قناعت کر لینا یا انھی کو بار بار پیش کرتے رہنا، قدامت پرستی کہلاتا ہے۔ مجموعی طور پر، چونکہ زندگی میں ترقی کا عمل چلتا رہتا ہے اور یہ کسی ایک گروہ کے روکنے سے رُک نہیں پاتا، اس لیے قدامت پرستانہ خیالات یا اس کے پیروکار خود ہی زمانے کی رفتار میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں ترقی پسند قومیں انھیں اپنا محکوم بنا لیتی ہیں۔

پر بیٹھنا بالکل چھوڑ دیا ہے، میز و کرسی پر بیٹھتے ہیں۔ میز پر چھری کانٹوں سے کھانا کھاتے ہیں۔ ان کے مکان کی آراستگی اور طریقہ بالکل یورپینوں کا سا ہے۔ جب ترک اپنی ہمسایہ قوموں ۔ فرنچ اور انگریزوں سے مل کر بیٹھتے ہیں تو ہم جولی معلوم ہوتے ہیں اور امید ہے کہ روز بروز اور زیادہ مہذب ہوتے جائیں گے۔ پس ہندوستان کے مسلمانوں سے بھی ہم یہی چاہتے ہیں کہ اپنے تعصبات اور خیالاتِ خام کو چھوڑ دیں اور تربیت اور شائستگی میں قدم بڑھائیں۔"

مذکورہ امور کے علاوہ ، سرسید نے مندرجہ ذیل امور پر خصوصی توجہ دینے پر زور دیا:۔

1- تمام تر معاشرتی اور مذہبی ضعیف الاعتقادیوں کو ترک کر دیا جائے۔
2- حقیقی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ بچوں کی تربیت کے لیے وسیع پیمانے پر اہتمام کیے جائیں۔
3- عورتوں کو تعلیم دی جائے اور معاشی طور پر مردوں کا ہم پلہ بنانے کے لیے انھیں دست کاری کے فنون سکھائے جائیں۔

چونکہ اُس دور میں مذہبی معاملات کا عام زندگی کے رویوں پر اثرانداز ضروری تھا، اس لیے سرسید نے مسلمانوں کے مذہبی اعتقادات میں اصلاح کی کوشش بھی کی ۔ اُن کا خیال تھا کہ کچھ ایسے اعتقادات خاص تاریخی پس منظر میں مسلمانوں کے مذہبی عقائد میں شامل ہو گئے ہیں ، جو اسلام کی حقیقی روح کے منافی ہیں۔ سرسید نے اپنی مذہبی خدمات میں ایک طرف عیسائی معترضین کے اعتراضات کے مدلل جواب دیے اور دوسری طرف اسلامی عقائد کی جدید علوم کی روشنی میں تفسیر کرنے کی کوشش کی۔ مولنا الطاف حسین حالی نے سرسید کی مذہبی خدمات کے مقاصد کا اس طرح تجزیہ کیا ہے:۔

"چونکہ مفتوح قوم کو فاتح قوم کے ساتھ قومی تعصبات ضرور باقی رہتے ہیں اور وہ قومی تعصبات مسلمانوں میں مذہبی تعصبات کے لباس میں ظہور کر رہے تھے جس سے حکمران قوم کی نظر میں مسلمانوں کا اعتبار

روز بروز کم ہوتا جاتا تھا اور ان کا مذہب سلطنت کے حق میں خطرناک خیال کیا جاتا تھا اور مسلمانوں کی ہر بُری بات ان کے مذہب کی طرف منسوب کی جاتی تھی اور فقہا کے فتوے جو دنیوی ترقی کے مانع ہوتے تھے وہ قومی تعصبات پر مبنی ہوتے تھے اور مسلمانوں کی پولیٹیکل حالت کو بھی اس سے بہت کچھ تعلق تھا، اس لیے سرسید نے مذہبی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔"

(حیات جاوید)

سرسید کے مذہبی نظریات اور ان پر مبنی اُن کی تصانیف سے اس عہد کے علما نے اتفاق نہ کیا۔ تعلیمی خدمات میں ان کے قریبی ساتھیوں نے بھی سرسید کے مذہبی اصلاح کے نظریات کی پذیرائی سے احتراز کیا۔

سیاسی نظریات

سرسید کے سیاسی نظریات ہندوؤں اور انگریزوں کی پالیسیوں کے بدلنے کے ساتھ ساتھ بدلتے گئے۔ اِس ارتقا میں وہ مجموعی طور پر اعتدال پسند رہے۔ ان کے سیاسی نظریات کے مختلف مراحل حسب ذیل ہیں۔

1- سرسید نے سب سے پہلے یہ ضروری خیال کیا کہ مختلف وجوہ کی بنیاد پر مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کے دل میں مخاصمت کے جذبات کو کم کیا جائے۔ اِس سلسلے میں انھوں نے ایک کتابچہ 'رسالہ اسبابِ بغاوت ہند' تحریر کیا۔ اس رسالے میں جنگ آزادی 1857ء کے بارے میں عمومی اور مسلمان قوم کے حوالے سے خصوصی محرکات کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا۔ سرسید نے اس رسالے میں اپنی تحقیق سے یہ ثابت کیا کہ جنگ آزادی کا مسلمانوں کو واحد ذمے دار ٹھہرانا نہ صرف غیر مناسب، بلکہ غیر حقیقت پسندانہ بھی ہے۔ انگریزوں اور مسلمانانِ ہند کے درمیان پیدا شدہ غلط فہمیوں کو دور کرنے کی غرض سے انھوں نے ایک کتابچہ 'ہندوستان میں وفادار مسلمان' بھی تحریر کیا۔

2- سرسید ابتدا میں ہندو مسلم اتحاد کے قائل تھے، آپ نے اس ضمن میں کہا تھا:

"ہم نے متعدد مرتبہ کہا ہے کہ ہندوستان ایک خوبصورت دُلہن ہے اور ہندو اور مسلمان اس کی دو آنکھیں ہیں۔ اس کی خوبصورتی اس میں ہے کہ اس کی دونوں آنکھیں سلامت اور برابر رہیں۔ اگر ان میں ایک برابر نہ رہی تو وہ خوبصورت دُلہن بھینگی ہو جائے گی اور اگر یک جاتی رہی تو کانی ہو جائے گی۔"

(سرسید کے آخری مضامین)

سرسید، ہندو مسلم اتحاد کے ساتھ ساتھ، انگریزوں اور دیگر ہندوستانی اقوام میں حدت نظر کے قائل تھے۔ اس کی وضاحت انھوں نے اس طرح کی:۔

"مجھ کو یقینِ واثق ہے کہ جب تک قومی امتیازات کو ملک کے قانون میں دخل ہوگا، اس وقت تک دونوں قوموں (انگریز و ہندوستانی) کے درمیان میں اصلی دوستانہ خیالات کی ترقی میں مزاحمتیں قائم رہیں گی۔ زندگی میں سوشل خوشی اور موافقت، پولیٹیکل ہمسری سے، ایک ہی قانون کے زیرِ حکم رہنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اب وہ زمانہ آگیا ہے جب کہ ہندوستان کے تمام باشندے خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، یوروپین ہوں یا یورشین اِس بات کو سمجھنے لگے ہیں کہ وہ ہمسر رعایا ہیں اور ان کے پولیٹیکل حقوق یا کانسٹی ٹیوشنل رتبہ میں قانون کی نگاہ میں کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہیے۔"

(مجموعہ لیکچر۔ سرسید)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"قوم کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے۔ یاد رکھو کہ ہندو، مسلمان اور عیسائی بھی جو اس ملک کے رہنے والے ہیں، اس اعتبار سے سب ایک قوم ہیں۔ جب یہ سب گروہ ایک قوم کہے جاتے ہیں تو ان سب کو ملکی فائدے میں جو ان سب کا ملک کہلاتا ہے، ایک ہونا چاہیے۔ اب وہ زمانہ نہیں ہے کہ صرف مذہب کے خیال سے ایک ملک کے

باشندے دو قومیں سمجھی جائیں۔"

(مجموعہ لیکچر سرسید ص 167)

سرسید ہندوستانی حالات میں قوم کے معانی اور قومی معاملات میں ان کے کردار کو خاص انداز سے دیکھتے تھے۔ مگر اس تمام صورتحال میں وہ مسلمانوں کے سیاست میں عملی حصہ لینے کے سخت خلاف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو اپنی کوششیں جدید تعلیم سے آراستہ کرنے پر صرف کرنا چاہییں۔ تعلیم کے بغیر مسلمان جدید طرز کے قومی اور سیاسی ماحول میں مؤثر حصہ نہ لے سکیں گے۔ بلکہ اس میں اس بات کا خدشہ تھا کہ وہ ہندوؤں کے غلام بن جائیں جو تعلیمی اور معاشی اعتبار سے ان سے بہتر اور مضبوط حیثیت رکھتے تھے۔

2- 1867ء میں بنارس کے ہندو رہنماؤں نے عدالتوں میں اردو زبان اور رسم الخط کو موقوف کرانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ وہ اردو کی جگہ دیوناگری رسم الخط کو رائج کروانا چاہتے تھے۔ اِس موقع پر سرسید نے ہندوستانی قوم کے بارے میں اپنے نظریات میں ترمیم کر لی۔

اِس ضمن میں سرسید خود اپنا ایک واقعہ اس طرح قلم بند کرتے ہیں:

"انھی دِنوں میں جب کہ یہ چرچا (اردو ہندی تنازعہ) بنارس میں پھیلا، ایک روز مسٹر شیکسپیئر سے جو اس وقت بنارس کے کمشنر تھے، مَیں مسلمانوں کی تعلیم کے بارے میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے۔" آخر انھوں نے کہا:

"آج پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے۔" میں نے کہا،

"اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دِل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے، آگے آگے اِس سے زیادہ مخالفت اورعناد ان لوگوں کے سبب سے جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں، بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔"

انھوں نے کہا،

"اگر آپ کی یہ پیش گوئی صحیح ہوئی تو نہایت افسوس ہے؟"

میں نے کہا

"مجھے بھی افسوس ہے مگر اپنی پیش گوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔"

(حیاتِ جاوید)

1885ء میں کانگرس قائم کی گئی (تفصیل اگلے باب میں ملاحظہ کریں) کچھ ہی عرصے میں اس جماعت پر ہندوؤں کا غلبہ ہوگیا تو کانگرس کے پلیٹ فارم سے ایسے مطالبات پیش کیے جانے لگے جن سے مسلمانوں کے مفادات کو سخت نقصان پہنچ سکتا تھا۔ کانگریس کے اہم مطالبات اور ان پر سرسید کا ردِّعمل حسب ذیل ہے:

1- کانگرس کے ہندوستان میں مخلوط انتخاب کے طریقہ کو رائج کرنے کے مطالبے پر سرسید نے کہا:

"وہ (ہندو) برطانوی دارالعوام کی نقل کرنا چاہتے تھے۔ اب آئیے ہم ذرا وائسرائے کی اس کونسل کا تصور کریں جو اس انداز سے تشکیل دی جائے گی اور یہ بھی فرض کر لیں کہ تمام مسلمان رائے دہندگان مسلم امیدوار کو ووٹ دیتے ہیں اور سارے ہندو ایک ہندو امیدوار کو ۔ یہ بات یقینی ہے کہ ہندو اراکین چار گنا زیادہ ووٹ حاصل کریں گے، اس لیے کہ ان کی آبادی چار گنا زیادہ ہے۔ چنانچہ ہم علم ریاضی سے ثابت کر سکتے ہیں کہ ہندو کے لیے چار ووٹ ہوں گے اور مسلمان کے لیے صرف ایک۔ تو پھر آخر کس طرح مسلمان اپنے مفادات کا تحفظ کر سکیں گے۔ اس کی مثال بالکل پانسے کے کھیل کی طرح ہوگی، جس میں ایک آدمی کے پاس تو چار پانسے ہو گے اور دوسرے کے پاس ایک۔"

(جمیل الدین احمد ص 24)

کانگرس کی اسی تجویز پر سرسید نے تنقید کرتے ہوئے کہا کہ کانگرس کی یہ تجویز ایسے ملک کے لیے ہے، جہاں دو مختلف قومیں مل کر آباد ہیں۔ ان کی رائے میں ہندوستان ایسا ملک تھا جو جمہوری پارلیمانی طرز انتخاب کے لیے موزوں نہ تھا۔

2- کانگرس کا دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ اعلیٰ ملازمتوں کے امتحانات انگلستان کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں بھی منعقد ہونے چاہئیں۔سرسید نے ہندوستانی ماحول میں ایسے مطالبے کی منظوری کو اعلیٰ ملازمتوں میں ہندوؤں کی بالادستی قائم کرنے کے مترادف قرار دیا۔ چونکہ ہندو تعلیمی لحاظ سے مسلمانوں سے کہیں آگے تھے ، اس لیے اعلیٰ ملازمتوں کے امتحانات میں یقیناً وہ بہتر کارکردگی دکھا سکتے تھے۔ سرسید نے اس قضیے کی وضاحت اس طرح کی :

"دیگر یہ کہ 'انگلستان' مقابلے کے امتحان کے لیے مناسب ہے جہاں ایک قوم کے لوگ ہوں یا ملک میں مختلف قومیں بستی ہوں لیکن آپس میں مل کر بمنزلہ ایک قوم کے ہو گئی ہوں جیسے انگلینڈ اور سکاٹ لینڈ ۔ مگر ہمارے ملک کی جس میں مختلف قومیں آباد ہیں یہ حالت نہیں ہے۔ ایک طرف ہندو ، دوسری طرف مسلمان اور تیسری طرف پارسی ہیں ۔ اگر آپ کے نزدیک یہ سچ ہے کہ یہ قومیں ایسے ہی آپس میں مل گئی ہیں کہ سب کو ایک قوم سمجھ لیا جائے تو بدشبہ میں ضرور کہوں گا کہ ہندوستان میں مقابلہ کا امتحان ہونا چاہیے اور اگر یہ نہیں ہے تو ہمارا ملک مقابلے کے امتحان کے قابل نہیں ہے۔ تیسری صورت مقابلہ کے امتحان کی یہ ہے کہ گویا ایک ملک میں مختلف قومیں رہتی ہوں۔ مسلمان پیچھے ہیں اور اس صوبہ (بنگال) کے ہندو بنگالیوں سے کم ہیں"۔

(حیاتِ جاوید)

تجزیہ

ہر شخص اپنی ذات اور اپنے قریبی حلقۂ اثر میں بسنے والے لوگوں کو پیش آنے والے مسائل کے بارے میں سوچ بچار کرتا اور اُن کا اپنی بساط کے مطابق حل بھی تلاش کرتا ہے۔ کچھ لوگ اپنے غور و فکر کو محض ذاتی معاملات تک محدود نہیں رکھتے بلکہ اپنے آپ کو پوری قوم اور معاشرے کی ایک اکائی سمجھتے ہوئے، ذاتی مسائل کو بھی اجتماعی تناظر میں سمجھنے اور ان کے حل کی کوشش کرتے ہیں۔ اس انداز فکر سے ان

کی حیثیت اور مقام پورے معاشرے کے لیے اہم ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ بجا طور پر اپنی قوم اور معاشرے کے راہنما ہوتے ہیں۔

کوئی فرد ایک خاص تاریخی عہد میں پیدا ہوتا ہے، اسی عہد میں وہ اپنے آپ کو زندگی کے لیے تیار کرتا ہے ور پھر اسی دَور میں اس کی زندگی کی تگ و دو ہوتی ہے۔ ہر فرد کی تشکیل بہر طور اس دَور کے رجحانات اور اثرات سے ہوتی ہے۔ اگر کوئی فرد انیسویں صدی کی اوائل میں زندہ رہا ہو تو، اس کی شخصیت کو بیسویں صدی کے آخری دَور کے معیار کے مطابق نہیں پرکھا جا سکتا۔ وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ انسانی شعور اور کارکرگی میں تبدیلی آ جاتی ہے۔ اِس لیے کسی بھی تاریخی شخصیت کے درست مطالعے کے لیے ضروری ہے کہ اس کو اس کے ہم عصر رجحنات اور معیاروں پر ہی پرکھا جائے۔ دوسری صورت میں درست تائژ جاننے کی بجائے اس شخصیت کا مطالعہ الجھ کر رہ جائے گا اور اس کے بہتر کام بھی برے لگیں گے۔

سرسید احمد خان کی شخصیت کا مطالعہ کرتے وقت ان کے ہم عصر تضادات اور تاریخی رجحنات کو محوظ رکھنا اشد ضروری ہے۔ بعض مؤرخین نے ان کا مطالعہ موجودہ شعور کے زیر اثر کرنے کی کوشش کی ہے اور سرسیّد کی ذات اور ان کی خدمات پر بہت سے اعتراضات جمع کر دیے ہیں۔

سرسید جس دور میں پلے بڑھے، اس میں مسمانان ہندوستن کی اجتماعی اور انفرادی ضروریات ور ان سے متعلق شعبہ جات زندگی سخت مشکل سے دوچار تھے۔ یہ حالات نہ صرف حوصلہ شکن بلکہ اندوہناک حد تک نقصان دہ تھے۔ ایسے حالات میں کسی ایک فرد کا حالات کو سمجھنا اور پھر ان حالات میں بہتری لانے کے لیے کوشش کرنا، سخت قوتِ ارادی کا متقاضی تھا۔ سرسیّد احمد خان بھی ابتدا میں ہی چھوڑ بیٹھے تھے مگر انھوں نے اپنے آپ کو اپنی قوم کا ایک حصہ سمجھتے ہوئے، اس کو مصیبت میں چھوڑ کر چلے جانا مناسب نہ سمجھا اور کسی اور کی مدد کا انتظار کیے بغیر خود ہی قوم کی بہتری کے لیے سرگرمیاں شروع کر دیں۔

سرسیّد کے تمام تر کارناموں میں مرکزی حیثیت مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کو

حاصل تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ محض اتفاقی نہ تھا بلکہ ان کو ایک ترقی پذیر قوم سے واسطہ پڑا اور جس کی قوت اور حکمتِ عملی کا وہ مقابلہ نہ کر سکے۔ اس تناظر میں سب سے ضروری اور بنیادی کام قوم کی اجتماعی حیثیت اور شعور کو بڑھا وا دینے کا تھا۔ جب قوم کا شعور بہتر ہوگا ، اس کے اندر قوت مدافعت بھی بڑھے گی اور وہ ہندوستان کی دوسری قوموں کے مقابلے میں اپنی حیثیت اور مقام منوا سکیں گی۔

تعلیم کی ضرورت اس لحاظ سے بھی اہم تھی کیونکہ ہندوستان میں مسلمانوں کے مقابل سب سے بڑی قوم ہندوؤں کی تھی۔ کمپنی کے دَور میں انھوں نے تعلیمی طور پر اپنے آپ کو بہتر بنا لیا تھا بلکہ ان میں ایک تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ پیدا ہو رہا تھا جو فعال شعور رکھتا تھا اور ہندو قوم پرستی کو فروغ دے رہا تھا۔ ہندوؤں کے اس طبقے کا اندازِ فکر باعمل اور حالات سے مطابقت رکھتا تھا جبکہ مسلمان بدستور قدامت پرست تھے اور اپنے آپ کو حقیقی حالات سے قطع نظر ماضی پرست بنا رہے تھے۔ مسلمانوں کے حقیقی حالات سے ہم آہنگ نہ ہونے میں اگرچہ انگریزوں نے بھی کردار ادا کیا تھا، پھر بھی ضرورت اس بات کی تھی کہ مسلمان ، ان کو درپیش تلخ صورتحال کو نہ صرف سمجھیں بلکہ اس کو بہتر کرنے کے لیے بھی کوشش کریں۔

سرسید کی تعلیمی سرگرمیوں کا مرکزی نقطہ جدید سائنسی سوچ اور طرزِ استدلال تھا۔ ان کے خیال میں اس وقت زندگی میں ترقی کے لیے ایسا طرز استدلال اشد ضروری تھا۔ اِسی کو بنیاد مانتے ہوئے انھوں نے معاشرتی اقدار میں ضروری ترامیم کرنے پر زور دیا۔ اِس میں عام عادات سے لے کر سماجی رویوں کو بھی شامل کیا گیا تھا۔

چونکہ مسلمانوں کی اکثریت ، اس ... میں سخت معاشی بدحالی کا شکار تھی اس لیے ان کے لیے تعلیمی اخراجات برداشت ... ممکن نہ تھے۔ ان کے بچے بہت کم عمری میں ہی فکر معاش سے دوچار ہو جاتے تھے۔ ویسے بھی غربت اور تعلیم کے فقدان کے باعث ان کا شعور بدستور قدامت پرستانہ رہا۔ سرسید کی تعلیمی کوششوں کا فوری اثر مسلمانوں کے اعلیٰ اور درمیانے طبقے کے لوگوں پر ہوا۔ یہ دونوں طبقے اپنی سماجی حیثیت کے باعث

وقتی ضروریات کو سمجھتے تھے اور اس ضمن میں تعلیم کی افادیت سے بھی بخوبی آگاہ تھے۔ تاہم ابھی تو ابتدا تھی، بعد میں آہستہ آہستہ اعلیٰ اور درمیانے طبقوں کے ساتھ ساتھ اکثریتی طبقہ میں بھی تعلیم کی افادیت کا احساس بڑھنے لگی۔ بعد ازاں اعلیٰ اور درمیانے درجے کے تعلیم یافتہ لوگوں نے ہی مسلمانانِ ہندوستان کے لیے سیاسی اور معاشرتی نصب العین معین کیے۔

سرسید پر کچھ مؤرخین کا اعتراض ہے کہ انھوں نے انگریزوں سے غیر ضروری طور پر ضرورت سے زیادہ مفاہمت کا رویہ اختیار کر لیا تھا۔ ایسا فیصلہ دینے سے پہلے ایسے مؤرخ، 1857ء سے پہلے اور بعد میں انگریزوں کے مسلمانوں کے تئیں جذبات اور پالیسیوں کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ اس دور میں انگریزوں سے براہ راست ٹکراؤ کی کیفیت پیدا کرنے کا مطلب ان کی مسلمانوں پر ظالمانہ کارروائیوں کو تیز تر کرنا تھا۔ مسلمانوں کی اپنی اجتماعی طاقت ختم ہو چکی تھی، ان کے تمام طبقات معاشی طور ہندو ساہوکاروں کے ہاتھوں بک چکے تھے۔ ہندوؤں اور انگریزوں کے درمیان، مسلم دشمنی کے معاملے میں اتحاد تھا اور یہ دونوں مل کر مسلمانوں کو مکمل طور پر ختم کرنا چاہتے تھے۔ ایسے حالت میں فوری طور ضرورت اس بات کی تھی کہ ہندوؤں اور بالخصوص انگریزوں کی طرف مفاہمانہ رویّوں کو فروغ دے کر ان کی مخاصمت کو کم کیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ مسلمان اپنے آپ کو تعلیمی اور معاشرتی طور پر بہتر بنا کر ایک مضبوط قوم کی صورت میں ابھریں۔ ایسا ہو جانے سے وہ انگریزوں اور دوسری اقوام پر اپنی حیثیت منوانے کے بھی قابل ہو جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید فوری طور پر مسلمانوں کے سیاست میں شامل ہونے کے بھی حق میں نہ تھے۔ اسی تناظر میں سرسید کی سرگرمیوں کی روح اور حقیقی مقاصد پر یہ واقعہ بہتر طور پر دلالت کرتا ہے۔

مولانا محمد علی نے ایک انگریز سے اپنے ایک مکالمے کا ذکر کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ جبکہ میرے بھائی (شوکت علی) سرکاری ملازمت میں تھے۔ ایک تجربہ کار انگریز نے ان سے دریافت کیا کہ تمھارے خیال میں برطانوی حکومت کا ہندوستان میں سب سے بڑا باغی کون ہے؟ میرے بھائی نے کچھ نام لیے مگر ان کو اس نے تسلیم

دیا ور اس انگریز نے کہ وہ باغی اور غدار، وفاداروں کے وفادر، سر سید احمد خان کے علاوہ کوئی اور نہ تھا۔ جب میرے بھائی نے اس فیصلے کے خلاف احتجاج کیا تو اس نے کہا "کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ نوجوان جو علی گڑھ میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، تقریباً اسی طرح ہمارے نوجوان تعلیم حاصل کرتے ہیں، جو اپنی منفرد زندگی گزارتے ہیں، انگریزوں سے بھی سبقت لے جاتے ہیں۔ وہی نوجوان جب اعلیٰ ملازمتوں پر فائز ہونے کے لیے اور ہندوستان سول سروس کے عہدہ دار بننے کے لیے اپنی درس گاہ سے باہر نکلیں گے تو گویا وہ چاپلوسی سے اور خوشامدانہ انداز میں انگریزوں کی خدمت کریں گے؟ نہیں، مسٹر شوکت علی یہ ممکن ہے! ہندوستان میں برطانوی حکومت کے دن گنے جا چکے ہیں اور یہ تمہارا وفادار سر سید احمد خان، درحقیقت ایک چالاک ترین باغی ہے۔"

سر سید احمد خان پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کو عملی سیاست میں حصہ لینے سے منع کیا۔ اس سے دوسری قوموں کے مقابلے مسلمانوں میں سیاسی شعور نسبتاً کم ہوا۔ حقیقی صورت حال یہ ہے کہ اس عہد کے سیاسی منظر میں مسلمانوں کے اپنے سیاسی، اقتصادی اور سماجی ادارے غیر موثر ہو چکے تھے۔ مسلمان انگریزی حکومت کے زیر اثر پیدا ہونے والے اداروں سے مناسب تشخص حاصل نہیں کر پائے تھے۔ ایسے ماحول میں ہندو موثر طور پر عملی سیاست کر رہے تھے۔ اس ضمن میں انھیں انگریزوں کی جزوی سرپرستی بھی حاصل تھی۔ اگر مسلمان سیاست میں سرگرم ہوتے تو ہندو ان کا سیاسی استحصال کر سکتے تھے۔ سر سید احمد خان نے بجا طور پر مسلمانوں کو تعلیم حاصل کرنے اور اپنے آپ کو اقتصادی اور سماجی طور پر بہتر بنانے کا مشورہ دیا۔ اس سے ان کی سیاسی پوزیشن بھی بہتر ہو سکتی تھی اور ان میں فشاری گروہ (PRESSURE GROUP) بھی پیدا ہو سکتا تھا جو سیاست میں کارآمد کردار ادا کر سکتا تھا۔ ویسے بھی سیاسی طاقت بغیر شعور کے بغیر نہیں بن سکتی اور یہ شعور تعلیم کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔

سر سید، اپنی تمام تر مفاہمت کے باوجود، مسلمانوں کی حالت سے بے خبر نہ تھے۔ اس ضمن میں ان کے قوم کے بارے میں نظریات کے ارتقا کا مطالعہ ضروری ہے۔

ابتدا میں وہ ہندوستان میں بسنے والی تمام اقوام کو ایک قوم سمجھتے تھے مگر بعدازاں ہندوؤں کے رویے میں تبدیلی کے تناظر میں انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو علٰحدہ علٰحدہ قوم قرار دیا اور یہ پیش گوئی بھی کی کہ یہ دونوں قومیں آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے الگ راہیں منتخب کریں گی۔

سرسید کے بارے میں صحیح اور محققانہ تجزیہ حالی نے اس طرح بیان کیا۔

"اگرچہ سرسید کی تمام لیاقتوں کا اصل مخرج ان کی غیر معمولی قابلیت اور استعداد تھی مگر ان کی قابلیت کو قوت سے فعل میں لانے والی زمانے کی ضرورتیں اور ان ضرورتوں کا پورا پورا احساس اور قوم میں ضرورتوں کے رفع کرنے ولوں کا قحط تھا، جس نے سرسید کو اس معمار کی طرح، جو تعمیر کے لیے آپ ہی اینٹیں پکائے، آپ ہی مسالہ تیار کرے، آپ ہی پاڑ باندھے، آپ ہی ٹوکری ڈھوئے، آپ ہی نقشہ بنائے اور آپ ہی عمارت چنے۔ 'یک سرو ہزار سودا' کا مصداق بنا دیا تھا۔"

(حیاتِ جاوید)

واقعاتی تسلسل

سرسید کی پیدائش	17- اکتوبر 1817ء
نائب منشی کی حیثیت سے ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازمت	1839ء
آثار الصنادید کی اشاعت	1847ء
رسالہ اسباب بغاوت ہند	1858ء
مراد آباد میں مدرسے کا قیام	1859ء
لائل محمڈن آف انڈیا کی اشاعت	1860ء
شمال مغربی صوبوں میں قحط	1860ء

غازی پور میں تعلیم کے بارے میں رسالے کی اشاعت	1863ء ———
غازی پور میں مدرسے کا قیام	1864ء ———
علی گڑھ میں آمد	1864ء ———
بنارس میں تبادلہ	1867ء ———
لندن کو روانگی	1869ء ———
تہذیب الاخلاق کا اجرا	1870ء ———
علی گڑھ کالج کی بنیاد	1875ء ———
حکومتی ملازمت سے ریٹائرمنٹ	1876ء ———
قرآن حکیم کی تفسیر کی اشاعت	1876ء ———
محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس	1886ء ———
وفات	1898ء ———

یاد دہانی کے لیے اہم نکات

* سر سید احمد خاں جس دور میں پیدا ہوئے، اس میں انگریزوں کی پالیسیوں ور نو آبادیاتی عزائم کے باعث مسلمان معاشی طور پر سخت بدحال ہو چکے تھے۔ اس دور میں ان کی حیثیت ایک زوال پذیر قوم سی تھی، جس کے تمام دارے اپنی کارکردگی اور اثر کھو چکے تھے۔

* مسلمانوں سے انگریز حکومت کا برتاؤ سخت مخاصمانہ تھا۔ وہ ماضی میں ہندوستان میں ان کی حکومت اور برتری کے تناظر میں انھیں دبا کر رکھنا چاہتے تھے۔ ان کو خدشہ اور خوف رہتا تھا کہ مسلمان ن کے مقابل نہ کھڑے ہو جائیں۔

* ہندوستان میں انگریزوں کی سامراجی پالیسیوں کے باعث غیر ہموار معیشت کو فروغ مل رہا تھا۔ ایسے میں اکثریتی لوگوں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی حالت اندوہناک حد

تک خراب ہو گئی تھی۔

* انگریزوں کے ہندوستان میں نوآبادیاتی تسلط کے زمانے میں سرسید نے شعور سنبھالا۔ انھوں نے اپنے اردگرد کے حالات کا محققانہ تجزیہ کیا اور مسلمانوں کی مجموعی صورتحال کو بہتر کرنے کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔

* سرسید کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے سب سے اشد ضروری یہ ہے کہ وہ جدید علم حاصل کریں اور اپنے تمام معاشرتی رویّوں کو انھی جدید تقاضوں کے مطابق ڈھالیں۔

* سرسید نے مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے لیے علی گڑھ میں کالج تعمیر کیا۔ یہاں سے تعلیم حاصل کرنے والوں نے بعد ازاں مسلمان قوم پرستی کی تحریک میں اہم کردار ادا کیا۔

* سرسید ابتدا میں ہندوستان میں بسنے والی تمام قومیتوں کو ایک قوم سمجھتے تھے۔ بعد ازاں ہندوؤں کے مسلمانوں کی تئیں روّیہ بدلنے سے انھوں نے مسلمانوں کے لیے علٰحدہ راہ کی نشاندہی کی۔

* سرسید فوری طور پر مسلمانوں کے سیاست میں حصّہ لینے کے حق میں نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو فوری طور پر اپنے آپ کو ایک مضبوط قوم بنانے کے لیے تعلیمی اور معاشرتی طور پر اپنی استعداد کو جدید تقاضوں کے مطابق کرنا چاہیے۔

غور و فکر کے لیے چند نکات

(الف)

1- 1858ء کے بعد بیسویں صدی عیسوی کے اوائل تک، انگریزوں کی پالیسیوں کے باعث ہندوستانی معیشت کی عمومی حالت کیا تھی۔ اس حالت زار کا ذمہ دار کون تھا؟ تجزیہ کریں۔

2- انیسویں صدی کے آخری نصف حصّے میں مسلمانانِ ہند کی [illegible] حالت زار کے تناظر میں کیا سرسید احمد خان کی تعلیمی اور معاشرتی خدمات [illegible] نہج پر تھیں؟ تجزیہ

کریں۔

3۔ اگر آپ سرسید کے قریبی ساتھیوں میں سے ہوتے تو آپ سرسید کی شخصیت اور ان کی خدمات کے بارے میں کیا تاثرات رکھتے؟ اپنے احساسات تحریر کرنے کے لیے الطاف حسین حالی کی کتاب حیاتِ جاوید کا ضرور مطالعہ کریں۔

(ب) مختصر جواب دیں۔

(i) 1858ء میں برطانوی حکومت نے ہندوستان پر براہِ راست حکومت کے لیے کس قسم کا انتظامی ڈھانچہ استوار کیا؟

(ii) انگریز، مسلمانوں کو کیوں دبا کر رکھنا چاہتے تھے؟

(iii) انگریز، ہندوستان کو ایک صنعتی معیشت کے طور پر کیوں نہیں ترقی دینا چاہتے تھے؟

(iv) ساہوکار کیونکر زرعی اراضی پر اپنا تصرّف جما رہے تھے؟

(v) انگریزی استعماریت کے دَور میں مسلمانوں میں دو مکاتبِ فکر پیدا ہوئے، ان کے نظریات کا مختصر جائزہ پیش کریں؟

(vi) سرسید نے ترکِ وطن کا فیصلہ کن حالات کے باعث کیا، اور پھر انھوں نے یہ فیصلہ کیوں ترک کر دیا؟

(vii) سائنسی طرزِ استدلال سے کیا مراد ہے۔ اس کے اہم اجزا کی وضاحت کریں؟

(viii) انیسویں صدی کے آٹھویں عشرے تک مسلمانوں کی تعلیمی حالت کیا تھی؟

(ix) سرسید مسلمانوں میں تعلیم کے فروغ کے لیے اتنا زور کیوں دے رہے تھے؟

(x) علی گڑھ کالج میں کس قسم کی تعلیم و تربیت پر زور دیا جاتا تھا؟

(xi) محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اہم مقاصد اور طریق کار کی وضاحت کریں؟

(xii) روایت پسندی سے کیا مراد ہے؟

(xiii) سرسید مسلمانوں میں کس قسم کی معاشرتی تبدیلیں لانے کے خواہاں تھے؟ ان کی تحریروں کی روشنی میں تجزیہ کریں۔

(xiv) مسلمانوں کے مذہبی اعتقادات میں، سرسید کے نزدیک کس قسم کی تبدیلی کی

ضرورت تھی؟

(xv) سرسید مسلمانوں کو کیوں سیاست سے دُور رکھنا چاہتے تھے؟

(xvi) سرسید کے سیاسی نظریات کا ارتقا بیان کریں؟

(xvii) ہندوستان میں مخلوط انتخاب پر سرسید کے نظریات کیونکر مسلمانوں کے حق میں تھے؟

(xviii) سرسید، 'انگریزوں کے سب سے بڑے مخالف تھے' تجزیاتی نوٹ لکھیں؟

(ج) نیچے دیے گئے بیانات میں جو درست ہیں، ان کے سامنے ✓ کا نشان لگائیں۔

(i) ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کے داخلی تضادات اور کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر اپنی وسعت پسندی کو فروغ دیا۔

(ii) 1857ء کی جنگِ آزادی مقامی لوگوں کی پہلی اور آخری مزاحمت تھی۔

(iii) 1858ء کے بعد بھی ہندوستان کے معاملات پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہی کنٹرول رہا۔

(iv) ہندوستان میں اپنے تسلط کے بعد، انگریز تمام ہندوستانی قومیتوں کو ایک نظر سے دیکھتے تھے۔

(v) ہندوؤں نے انگریزی حکومت کے قیام کے عمل کے ساتھ ساتھ، اپنی شناخت کو منوانے کے لیے ہندو قوم پرستی کی تحریک شروع کر دی تھی۔

(vi) 1858ء کے بعد ہندوستان میں، جو اقتصادی نظام قائم کیا جا رہا تھا، اس میں ہندوستانی دولت اور وسائل پر مقامی لوگوں کا اختیار ختم ہو گیا۔

(vii) ہندوستان میں انگریزی دَور میں رونما ہونے والے قحطوں کی وجہ ناقص نظام ترسیل کے علاوہ اجناس کی کمی بھی تھی۔

(viii) سرسید احمد خاں کی تعلیمی کوششوں سے مسلمانانِ ہند کو بدلتے حالات میں نئے علوم کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔

(ix) سرسید احمد خاں کی کوشش تھی کہ مسلمان قدامت پرستی کے رویّوں کو ترک کر کے انگریزی طرز زندگی اپنا لیں۔

(x) سرسید کی خدمات کے نتیجے میں مسلمانوں میں یک باشعور طبقہ پیدا ہوا، جس نے

بعد ازاں مسلمانوں کی رہنمائی کا فریضہ ادا کیا۔

(د) نیچے ایک بیان کے ساتھ اس کی چند وجوہات دی گئی ہیں۔ یہ وجوہات اپنی جگہ پر درست ہیں تاہم ان میں کوئی ایک سب سے اہم اور بنیادی نوعیت کی ہے۔ ان تمام وجوہات پر کلاس میں بحث کریں اور سب سے بہتر پر ✓ کا نشان لگائیں۔

1- ہندوستان میں، انگریزوں کے تسلّط کا سب سے اہم مقصد :

(الف) ہندوستانی وسائل پیداوار کو برطانوی صنعتی ترقی کے لیے استعمال کرنا تھا۔

(ب) ہندوستان میں سامراجی نظام قائم کر کے یہاں کے ہر شعبے پر اپنا اختیار اور تصرف قائم کرنا تھا۔

(ج) ہندوستانی ثقافت پر اپنی تہذیبی برتری قائم کرنا تھا۔

2- سرسید کی کوششوں کا بنیادی مقصد :

(الف) مسلمانوں میں نئے حالات کے مطابق خود آگاہی پیدا کرنا تھا۔

(ب) مسلمانوں کو جدید تعلیم کی ضرورت کا احساس دلانا تھا۔

(ج) مسلمانوں اور انگریزوں کے مابین غلط فہمیوں کو دور کرنا تھا۔

کتابیات

یہ باب لکھتے وقت مندرجہ ذیل کتب سے مدد لی گئی۔ طلبہ و طالبات سے گزارش ہے کہ مزید وضاحت کے لیے ان کا ضرور مطالعہ کریں۔

1- حیات جاوید از مولٰنا الطاف حسین حالی مطبوعہ آئینۂ ادب ، انار کلی لاہور۔ 1966ء

2- برعظیم پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ، مصنفہ ۔ اشتیاق حسین قریشی ۔ مترجم ہلال احمد زبیری، کراچی یونیورسٹی ۔ کراچی 1982ء

3- مسلمانوں کا روشن مستقبل، مؤلفہ ۔ سید طفیل احمد منگلوری علیگ ، مطبوعہ : حماد الکتبی ۔ شیش محل روڈ ، لاہور 1945ء

A History of Freedom Movement Vol. II, Part II –4
Pakistan Historical Society, Karachi 1961

4

ہندوستان میں مسلم وہندو احیأ کی تحریکیں

ہندوستان میں انگریزوں کے اثر و نفوذ کے قیام کے بعد انیسویں اور بیسویں صدی میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں بہت سی احیأ کی تحریکوں نے جنم لیا۔ ان تحریکوں کے مقاصد اور سرگرمیوں کو درست طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت کو سمجھ لیا جائے۔

مسلمان بادشاہوں کے دور میں اگر کوئی حکمران بہتر سیاسی نظریات کا حامل ہوتا اور وہ اپنی رعایا کو یک نظری سے دیکھتا تو ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین گروہی یگانگت برقرار رہتی تھی۔ بصورت دیگر حکمران کی عدم توازن پر مبنی پالیسیوں سے اگر ایک گروہ کو زیادہ پذیرائی مل جاتی تو دوسرا یقینی طور پر اپنے آپ کو نظرانداز محسوس کرتا۔ ایسے میں وہ احتجاج تو نہ کر سکتا تھا، تاہم یک مخاصمت کا احساس ضرور رہتا۔

مسلمان بادشاہوں کے دور میں، مسلمان حکومتی گروہ اور عام ہندوؤں کے درمیان حکومتی سطح پر یک بُعد ضرور برقرار رہا۔ اس کی نوعیت سرکاری اور رسمی تھی۔ انگریزوں کی آمد کے بعد حکومتی گروہ میں تبدیلی سے مختلف قومیتوں میں معاشرتی تعلقات کی نوعیت میں تبدیلی رونما ہوئی۔ اب مسلمان بحیثیت مجموعی، ہندوؤں کی طرح انگریزوں کے محکوم تھے۔ انگریز ان دونوں اقوام پر اپنی تہذیبی برتری قائم کرنے کی غرض سے مختلف حربے استعمال کر رہے تھے۔ ان میں عیسائیت کا فروغ اور اشاعت بھی شامل تھی۔ بہت سے عیسائی مشنری اداروں نے سکول کھولنا شروع کر دیے۔ ان سکولوں میں عیسائیت کے نظریت کی بالادستی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ بچوں کی تربیت

اس ڈھنگ سے کی جاتی تھی کہ وہ انگریزوں کے وفادار بن جائیں۔ وہ انگریزوں کی پیش کردہ تہذیب ور ان کے انداز معاشرت سے متاثر ہوں اور مرعوب ہو کر اسکو اپنالیں۔ ایسے ماحول میں بچے اپنی مقامی روایات اور رسوم سے اپنے آپ کو منسلک کرنے میں عار محسوس کرنا شروع کر دیتے تھے۔

انگریزوں کے پیدا کردہ نئے معاشرتی رجحانت میں مسلمان اور ہندو دونوں برابر طور پر اپنی رویات اور مذاہب کو ازسرِ نو، نئی طاقت کے ساتھ پیش کرنے کے متمنی تھے۔ انھیں نئے ماحول میں اپنی شناخت کو برقرار رکھنے کے لیے تجدید نو کی ضرورت پیش آ رہی تھی۔ اس چیلنج کے ماحول میں مختلف دانشوروں نے اپنے اپنے انداز میں حل تلاش کرنے کی سعی کی اور باعمل تحریکات کو شروع کیا۔ ان تحریکات کی نظریاتی ہیئت کی اقسام اس طرح ہیں۔

1- ہم عصر مسائل کے حقیقت پر مبنی حل تلاش کرنے کی بجائے ماضی کے شاندار ادوار کی طرف رجوع کیا گیا اور ماضی کے تقاضوں کو ہم عصر مسائل کے حل کے لیے بطورِ جواز پیش کیا گیا۔ یعنی یسی تحریکوں کے نظریات کی بنیاد ماضی کے اصولوں اور طریق کار پر رکھی گئی اور انھی سے ہم عصر مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان تحریکات میں ماضی کے شاندار ادوار کے احیا پر بھی زور دیا گیا تھا۔

ایسی تحریکات اپنی سرگرمیوں اور مزاج کے اعتبار سے خالصتاً مذہبی تھیں۔ ایسی تحریکوں سے مذہبی جذبات کو بڑھاوا ملا اور مختلف قومیتوں اور مذہبی گروہوں میں کشیدگی بڑھی۔

2- دوسری قسم کی تحریکات، اول الذکر کے مقابلے میں حقیقتِ احوال سے قریب تھیں اور ان میں ہم عصر مسائل کو، ہم عصر حقائق اور تقاضوں کی روشنی میں ہی حل کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ ان کی سرگرمیاں باعمل ہوتی تھیں اور مقاصد میں اپنی اپنی قوم کی حیثیت اور مقام کو بہتر بنانا شامل تھا۔ ایسی تحریکوں کو نوعیت بنیادی طور پر سیاسی تھی۔

ہندوؤں کی مذہبی تحریکات

ہندوستان میں ، انگریزی مقبوضات کی ابتدا مشرقی اور شمالی ہندوستان سے ہوئی۔ انھی علاقوں میں خاص طور پر بنگال میں انگریزی اثرونفوذ سے ابتدائی طور پر کوئی خاص ردِعمل نہ ہوا۔ مقامی معاشرہ اپنی تاریخی سُست روی اور جمود کا شکار تھا۔ ان علاقوں میں انگریزی سوچ کی ترویج کا سب سے اہم ذریعہ انگریزی طرزِ تعلیم تھا۔ 1817ء میں کلکتہ میں ہندو کالج قائم ہوا۔ بعدازاں کلکتہ ، بمبئی اور مدراس میں بھی ایسے کالج اور سکولوں کے قیام سے ایک نیا پڑھ لکھا طبقہ پیدا ہونے لگا۔ یہ طبقہ کسی قدر انگریزی فکر اور ثقافت سے متاثر تھا اور مقامی ثقافت اور اندازِ معاشرت کو کم تر سمجھتا تھا۔ ایسے ماحول میں سب سے زیادہ مقامی مذہبی اور معاشرتی اعتقادات کو نشانہ بنایا گیا۔ نیا طبقہ ہر معاملے کو عقل اور سائنسی فکر کے پیمانوں پر پرکھنے کو ضروری خیال کرتا تھا جبکہ روایتی انداز میں توہم پرستی پر زور دیا جاتا تھا۔ بلکہ روایتی سوچ میں کسی بھی مذہبی رہنما کی بات کو بغیر کسی تصدیق کے نہ صرف درست تسلیم کر لیا جاتا تھا بلکہ اس پر عمل درآمد کو ہی قسمت سمجھا جاتا تھا۔

ایسے ماحول میں روایتی اعتقادات ، تضادات اور عدم تاثر کا شکار ہونے لگے۔ بعض دانشور نئے ماحول میں ان اعتقادات پر اور بھی سختی سے کاربند ہو گئے اور کچھ نے نئے اور پرانے خیالات میں توازن قائم کرنے کی کوشش کی۔

برھمو سماج

ہندوؤں میں سماجی اور مذہبی اصلاح کے ضمن میں برھمو سماج کی تحریک کو اولیت حاصل ہے۔ یہ تحریک 1828ء میں شروع کی گئی۔ اس تحریک کے بانی راجہ رام موہن رائے تھے۔ (1) یہ تحریک نظریاتی تھی اور اس میں مذہبی اور معاشرتی مسائل کو فکری سطح

---

(1) راجہ رام موہن رائے 1772ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ایک برھمن تھے جو بنگال کے حاکم سراج الدولہ کے دربار میں ملازم تھے۔ راجا رام موہن نے ابتدا میں عربی اور فارسی زبانوں کو سیکھا ۔ ان دونوں زبانوں میں انھیں بہت مہارت تھی۔ راجہ رام موہن کی اسلامی تصوف اور

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

پر جانچنے کی کوشش کی گئی تھی۔ بنیادی طور پر یہ ہندو نشاۃ ثانیہ کی تحریک تھی، ور اس کا مقصد ہندو معاشرے کو جدید تقاضوں کے ہم آہنگ بنانا تھا۔ اِس تحریک کے بانی ہندو مذہب میں دیوی اور دیوتاؤں کے اساطیری نظام اور ویدوں کے اساسی نظریات کے خلاف تھے۔ وہ مذہبی نظریات میں وحدانیت کے قائل تھے۔

راجا رام موہن رائے کے انتقال تک برھمو سماج ایک فکری تحریک رہی۔ ان کے بعد تحریک میں فعالیت آئی اور اس نے ہندوؤں میں مروجہ غیرانسانی رسومات کو ختم کرنے پر زور دینا شروع کر دیا۔ تحریک کے رہنماؤں کا یہ بھی خیال تھ معاشرتی شعور میں اس وقت تک حرکت نہیں لائی جا سکتی جب تک خواتین معاشرتی مسائل اور ضرورتوں کو نہ سمجھیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے برھمو سماج نے عورتوں کی تعلیم پر خصوصیت سے توجہ دینے پر زور دیا۔

ہندوؤں میں خاوند کے انتقال کے بعد بیوہ کو دوسری شادی کی اجازت نہ تھی، بلکہ کئی علاقوں میں بیواؤں کو ان کے خاوندوں کی چتا میں ہی جلا دیا جاتا تھا۔ یہ رسم ان طبقوں میں زیادہ تر ادا کی جاتی تھی جہاں عورت کو جائداد میں حصہ ملتا تھا اور عورتوں کی دوسری شادی کی صورت میں جائداد خاندان سے باہر بھی جا سکتی تھی۔ برھمو سماج نے اس رسم کو سراسر غیر انسانی قرار دیا اور اس کے خلاف بھرپور تحریک چلائی۔ ہندو مذہب میں وہ طبقہ جو ایسی رسومات کے پردے میں اپنے لیے معاشی سہولتیں حاصل کرتا اور علاقے میں اپنا اثر قائم کرتا تھا، برھمو سماج کی اس تحریک سے سخت جزبز ہوا۔ اس طبقے نے اِس تحریک کی بھرپور مخالفت کی۔

فلسفہ میں گہری دلچسپی تھی اور ان علوم کا ان کے خیالات پر خاصا اثر ہوا۔ وہ مسلمانوں کے انداز عبادت اور اس کی سادگی سے حد درجہ متاثر تھے۔ وہ ہندو انداز عبادت کو غیر مناسب اور پیچیدہ تصور کرتے تھے۔ اس ضمن میں انھوں نے ہندووانہ انداز عبادت اور مذہبی رسوم کے خلاف ایک رسالہ بھی تحریر کیا۔

راجا رام موہن مالیہ کے محکمے میں ملازم رہے اور ریٹائرمنٹ کے بعد انھوں نے اپنے نظریات کی اشاعت کا کام شروع کر دیا۔ عیسائیت کا مطالعہ کرنے کے لیے انھوں نے برطانیہ کا دورہ کیا اور یہیں پر ان کا 1833ء میں انتقال ہو گیا۔

چونکہ عوام الناس پر مذہبی گروہ کا صدیوں پرانا اثر تھا اور وہ اس گروہ کی نافذ کردہ رسوم کو ہی حقیقت سمجھتے تھے، اس لیے انھوں نے تحریک کے خیالات پر توجہ نہ دی۔ اس تحریک کا پڑھے لکھے لوگوں پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ 1901ء تک اس تحریک کے باقاعدہ ممبران کی تعداد 4050 سے زیادہ نہ تھی۔

آریا سماج

برھمو سماج کی تحریک، اگرچہ ایک مقبول تحریک نہ بن سکی اور اس نے محض پڑھے لکھے لوگوں کے ایک مختصر گروہ کو ہی متاثر کیا، تاہم مجموعی طور پر ہندو قوم کا خیال رکھنے والوں میں یہ احساس ضرور پیدا ہو گیا کہ اس دور میں ہندو مذہب اپنی ہیئت اور کردار کی وجہ سے ہندو معاشرے کی ترقی اور ان کی انگریزی حکومت میں کارکردگی کو متاثر کر رہا ہے۔ اسی پیغام سے متاثر ہو کر ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں بہت سی تحریکات نے جنم لیا۔ ان میں ایک کا نام 'آریا سماج' تھا۔

آریا سماج کی تحریک بنیادی طور پر ایک اصلاحی تحریک تھی اور اس کے اساسی نظریات کم و بیش برھمو سماج سے ملتے جلتے ہی تھے۔ تاہم اپنی سرگرمیوں کے اعتبار سے یہ تحریک زیادہ مؤثر اور فعال تھی۔ اس تحریک کی ابتدا 1875ء میں بمبئی میں ہوئی مگر اس کو زیادہ تر مقبولیت پنجاب، اترپردیش اور راجستھان میں ملی۔ اس کے بانی سوامی دیانند سرسوتی (1) تھے۔ آریا سماج کی تحریک نے ہندوؤں میں مذہبی اور بالخصوص معاشرتی سطح پر قوم پرستانہ شعور کی ترویج کی۔

آریا سماج کے خیالات اور سرگرمیوں کا زیادہ تر اثر ہندوؤں میں موجود درمیانے

---

(1) سوامی دیانند 1824ء میں کاٹھیاواڑ (بھارت کی ایک ریاست گجرات کا اہم شہر) کے قریب ایک علاقے میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک رجعت پسند برہمن گھرانے سے تھا۔ اوائل عمر سے ہی ان کا مروجہ مذہبی اعتقادات سے یقین اٹھ گیا اور انھوں نے راہبانہ زندگی اختیار کر لی۔ بعد ازاں راہبانہ اطوار سے بیزاری ہو گئی اور آپ نے اپنی علمی استعداد بڑھانے کے لیے بڑا طویل اور گہرا مطالعہ کیا اور بہت سی کتب تصنیف کیں۔ 1865ء میں وہ ایک مذہبی رہنما کے طور پر ابھرے۔ کہا جاتا ہے کہ مذہبی علوم میں وہ اعلیٰ استعداد کے مالک تھے۔ سوامی دیانند کا انتقال 1883ء کو ہوا۔

طبقے میں ہوا۔ یہ درمیانہ طبقہ انگریزوں کی ہندوستان میں آمد کے بعد پیدا ہو رہا تھا۔ یہ طبقہ نئے ماحول سے مطابقت اور انگریزی تعلیم حاصل کر کے ، سرکاری نوکریاں حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ انگریزوں کے قائم کردہ معاشی نظام میں 'درمیانے آدمی' کی حیثیت سے دولت کمانا چاہتا تھا۔ اِس گروہ کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہندو نظام تھا، جو معاشرتی درجہ بندی ، دقیانوسی خیالات اورغیر سائنسی اندازِ فکر کے باعث انھیں نئےماحول سے ہم آہنگ ہونے سے روک رہا تھا۔

آریا سماج کی تحریک نے ہندوؤں میں مروجہ سماجی رسوم اور روایات پر شدید تنقید کی ۔ اس ضمن میں آریا سماج نے تعلیمی ترقی پر زور دیا اور بہت سے سکول اور کالج کھولے۔ عورتوں کی تعلیم کے لیے ادارے بھی کھولے گئے۔

آریا سماج نے ہندوستان کے دوسرے مذاہب خاص طور پر عیسائیت اور اسلام کے تئیں مخاصمانہ رویہ اختیار کیا۔ ان دونوں کے بارے میں آریا سماج کے خیالات غیر رواداراانہ تھے۔ ایسے خیالات کی ترویج کےلیے سوامی دیانند نے 'ستیارتھ پرکاش' کے نام سے ایک کتاب تحریر کی۔ اس کتاب میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ جو لوگ ماضی میں کسی بھی وجہ سے اسلام یا عیسائیت کو قبول کر چکے ہیں، اگر وہ چاہیں تو پھر ہندومت کو قبول کر لیں۔ واضح رہے کہ قدامت پرست ہندو ، ہندومت میں دوبارہ واپسی کے قائل نہ تھے۔

آریا سماج کے خیالات اور سرگرمیوں سے ہندوستان کے شمال اور مغربی علاقوں میں مذہبی انتہا پسندی اور مخاصمت کو فروغ ملا ۔ اِس فرقہ وارانہ ماحول میں 1882ء میں گاؤکشی کے خلاف ایک تنظیم کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس تنظیم نے مسلمانوں کے خلاف نفرت آمیز پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ کچھ انتہا پسند ہندوؤں نے متشدد سرگرمیاں شروع کر دیں، جس کے نتیجے میں ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے اور بہت سی انسانی جانیں اِس کی نذر ہو گئیں۔

مسلم اصلاحی تحریکات

پس منظر

ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کے دَورِ حکومت میں فکری سطح پر کئی مکاتب سرگرم تھے۔ ایک کا تعلق حکومتی اور دوسرے کا ان کے مخالف طبقات سے تھا۔ حکومتی طبقے کو اپنی سیاسی ضرورت کے تحت خاص فکری جواز کی ضرورت رہتی تھی اور اس کی بنا پر ان کی حکومتی حکمتِ عملی استوار کی جاتی تھی۔ حکومتی طبقوں کے مخالف ، اپنی سیاسی پیش قدمی اور حصول اقتدار کے لیے کسی دوسرے فکر کا سہارا لیتے تھے اور اسی کی بنیاد پر حکومتی گروہ کی پالیسیوں کی مخالفت اور اپنے مفادات کی تشہیر کرتے تھے۔ ہندوستان میں عام لوگوں کی وابستگی تصوّف کے افکار سے رہی۔ اِسی سے تعلق کی بنیاد پر انھیں نفسیاتی سکون میسّر آتا تھا۔ اِس ضمن میں صوفیہ کرامؒ اور مشائخ کرامؒ کا کردار بڑا واضح نظر آتا ہے۔

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد اور خود مسلم حکومت میں داخلی خلفشار کے باعث ، فکری طور پر بہت سے رجحانات ابھرنا شروع ہو گئے۔ چونکہ اب معاشرتی ، سیاسی اور اقتصادی سطح پر بحرانی کیفیات ابھر رہی تھیں، اس لیے فکری تحریکات کا انداز بھی بدل گیا۔ حکومتی یا غیر حکومتی وابستگی کے برعکس ، اس دَور میں ابھرنے والی تمام تحریکوں کا بنیادی مقصد درپیش مسائل کے تناظر میں بہتر اور مؤثر افکار کو فروغ دینا تھا ۔ ابتدا میں ایسی فکری تحاریک کا محور محض علاقائی رہا۔

اٹھارھویں صدی عیسوی کے نصف تک ہندوستان میں قائم شدہ مسلم اداروں کی کارکردگی اور حیثیت حد درجہ مخدوش صورتحال اختیار کر چکی تھی۔ اِس صورتحال میں خارجی عوامل کے ساتھ ساتھ داخلی عوامل کا کردار بھی خاصا گہرا تھا۔ ان داخلی عوامل کے ذمہ دار خود حکومتی گروہ کے لوگ تھے۔ چونکہ اِس زوال کی صورتحال میں تمام مسلمان بحیثیت قوم متاثر ہو رہے تھے، اس لیے ضرورت اِس بات کی تھی کہ مسلمان قوم کے اجتماعی اداروں اور ان میں مسلمانوں کے انفرادی کردار کا ازسرِنو تجزیہ کیا جائے۔ اِس کا

مقصد پوری صورتحال کو سمجھنے اور باعمل نتائج تک پہنچنا تھا تاکہ مسلمان قوم کو بدلتے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے نئی طاقت اور صلاحیت دی جاسکے۔

انگریزی استعمار کے بعد ہندوستان میں مسلمان قوم کی حیثیت کو بہتر بنانے میں سب سے پہلے شاہ ولی اللہؒ نے ٹھوس فکری بنیادوں پر کام شروع کیا۔ انھوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کی مجموعی حالتِ زار اور ان کے معاشرتی، مذہبی اور سیاسی معاملات کے ساتھ ساتھ کسی حد تک اقتصادی اداروں کی ہیئت اور کارکردگی کا تجزیہ کیا اور بہتری کے لیے کئی اقدامات تجویز کیے۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے شاہ ولی اللہؒ کے کارناموں کا تجزیہ اِس طرح کیا ہے:

"۔۔۔۔ شاہ ولی اللہؒ کا عقیدہ بھی اسلام کی ہمہ گیر نوعیت پر تھا ۔۔۔ وہ یہ خیال کرتے تھے کہ اسلام کے اخلاقی پس منظر کے بغیر عمرانیات، معاشیات اور سیاسیات کے ذریعے انسانی زندگی کا بلند ترین مقصد حاصل کرنا ممکن نہیں ہے ۔۔۔ اس وجہ سے وہ ممکن نہ سمجھتے تھے کہ ملّت کے غیر اسلامی رسوم و اعمال اور جادۂ حق سے تجاوزات کا علاج کیے بغیر اس کی سیاسی قوّت کو بحال کیا جاسکے۔ شاہ ولی اللہؒ یہ سمجھتے تھے کہ ایک قوم کی صحت کے لیے سیاسی اقتدار ناگزیر ہے۔ ان کی قوم کو سیاسی قوّت کے زوال سے جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا، وہ ان مصائب کی طرف سے اپنی آنکھیں بند نہیں کر سکتے تھے، اس لیے انھوں نے نظم و نسقِ حکومت میں قلیل المیعاد اصلاحات کی وکالت کی۔ یہ وکالت اسی انہماک کے ساتھ کی، جس سے کہ غیر اسلامی رسوم و عقائد کو ترک کرنے کی تلقین کی۔" (ص 246-247)

شاہ ولی اللہؒ نے جس کام کو شروع کیا، وہ یقیناً محنت طلب تھا اور اس کے لیے وسیع مطالعے اور گہری بصیرت کی ضرورت تھی ۔ شاہ ولی اللہؒ نے یہ کام غیر معمولی کامیابی سے انجام دیا۔ دوسری طرف یہ بھی بات درست ہے کہ ہندوستان میں مسلم قوم بدستور روبہ زوال رہی اور وہ خارجی خطرات کا کماحقُّہ، مقابلہ نہ کر سکی۔ تاہم شاہ ولی اللہؒ کے افکار اور ان کی عملی کوششوں سے مسلمانوں میں ایک ایسا گروہ ضرور پیدا ہوگیا، جس نے

نہ صرف شاہ ولی اللہؒ کے افکار کی اشاعت کی بلکہ انھی افکار کی روشنی میں دو پہلوؤں پر عملی کوششیں جاری رکھیں:

1- مسلمانوں کی معاشرت میں اخلاقی سطح پر بہتری لانا اور ان کو غیر ضروری اور فروعاتی معاملات سے قطع نظر قرآنِ حکیم اور رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی تعلیمات کی حقیقی اور بنیادی روح کی طرف راغب کرنا۔

2- مسلمان قوم کی دوسری قوموں کے مقابل معاشرتی اور سیاسی صورتحال میں بہتری لانے کے لیے عملی کارروائی کرنا۔

شاہ ولی اللہؒ کے افکار کو فکری سطح پر ان کے بڑے بیٹے شاہ عبدالعزیزؒ نے آگے بڑھایا۔ انھوں نے علمی اور دینی معاملات میں گرانقدر خدمات انجام دیں۔ شاہ ولی اللہؒ کے افکار کو سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ نے ایک عملی شکل دی اور اسلام دشمن قوتوں کے خلاف ایک تحریکِ جہاد شروع کی ۔ شاہ ولی اللہؒ کے کچھ شاگردوں نے ان کے تعلیمی نظریات کے زیرِاثر مسلمانانِ ہندوستان میں تعلیم کو فروغ دینے کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ ان میں مولانا مملوک علی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مولنا مملوک علی دہلی کالج میں پڑھاتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں مولنا محمد قاسم نانوتوی بھی تھے۔

دارالعلوم دیوبند

مولنا محمد قاسم ، نانوتہ (ضلع سہارنپور ، بھارت) کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے 1867ء کو اپنے گاؤں کی ایک مسجد میں ایک چھوٹا سا مدرسہ کھولا۔ اس مدرسے میں سب سے پہلے طالب علم مولنا محمود حسن[1] تھے۔ اس مدرسے کا نام دیوبند تھا۔ اِس مدرسے کے قیام کے مقاصد حسبِ ذیل تھے۔

1- مسلمانوں میں دینی تعلیم کو فروغ دیا جائے۔

---

(1) مولانا محمود حسن 1851ء کو بریلی (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ آپ نے دارالعلوم دیوبند سے تعلیم حاصل کی اور یہیں مدرس کے طور پر پڑھانے لگے۔ بعد میں دارالعلوم کے صدر مدرس ہو گئے۔ آپ کے زیرِ اثر نامور علما کی ایک جماعت تیار ہوئی جنھوں نے آئندہ نصف صدی تک اہم کردار ادا کیا۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

2- دینی درس گاہوں کا جال پورے ملک میں بچھا دیا جائے۔ یہ درس گاہیں مسلمان قوم کی آزادی کے لیے ذیلی مراکز کا کام کریں اور ان کا مرکز دیوبند رہے۔ مولنا محمد قسم نانوتوی کے انتقال (1880ء) کے بعد ان کے رفیق مولنا رشید احمد گنگوہی (1829ء-1905ء) نے مدرسے کے معاملات کو سنبھالا۔ آہستہ آہستہ مدرسۂ دیوبند میں طلبہ کی تعداد بڑھنے لگی اور 1876ء کو اِس مدرسے کے لیے علٰحدہ عمارت کی بنیاد رکھی گئی۔

دارالعلوم دیوبند کے منتظمین مسلمانوں میں دینی تعلیم کو فروغ دے کر ان میں قومی احساس اور شعور کو اجاگر کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ کسی بھی سرکاری ادارے کی مدد یا اعانت قبول نہ کرتے تھے۔ وہ بجا طور پر یہ سمجھتے تھے کہ کسی قسم کی بھی مدد قبول کرنے سے دارالعلوم کے معاملات میں خارجی مداخلت بڑھ جائے گی اور دارالعلوم اپنے مقاصد اور طریقۂ کار میں آزاد نہ رہے گا۔ اس لیے دارالعلوم کی انتظامیہ نے اصولی طور پر یہ بات طے کر لی تھی کہ کوئی بھی مستقل ذریعۂ آمدن قبول نہ کیا جائے۔ اس میں کسی جاگیر یا کسی متمول شخص کی طرف سے چندہ کی رقوم بھی شامل تھیں۔ دارالعلوم کے اکثر اساتذہ کرام رضاکارانہ یا نہایت معمولی مشاہرے پر تدریس کا کام کرتے تھے۔ چندہ، صرف غریب لوگوں سے وصول کیا جاتا تھا۔ دارالعلوم کے کارکن جب لوگوں سے چندہ وصول کرنے جاتے تو وہ انھیں قرآن و حدیث پر مبنی اسلامی تعلیمات کی اہمیت سمجھاتے۔ دینی تعلیم کے فروغ کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں

مولنا محمود حسن نے مذہبی امور میں مسلمانانِ ہندوستان کی راہنمائی کے ساتھ ساتھ دیگر ممالک میں مسلمانوں کی حیثیت کو کم کرنے والی سامراجی قوت یعنی انگریزوں کے خلاف عملی تحریک میں حصہ لیا۔ انھوں نے 1913ء میں ہندوستان میں برطانوی اقتدار کو ختم کرنے کے لیے ایک منصوبہ تیار کیا۔ اس منصوبے کی تیاری کے سلسلے میں انھوں نے بہت سے ممالک اسلامیہ کا دورہ بھی کیا۔ انگریز، مولنا کی سرگرمیوں سے سخت خائف تھے۔ انگریزوں کے کہنے پر شریف مکہ نے انھیں گرفتار کر لیا۔ انھیں پہلے مصر اور پھر جزیرہ مالٹا میں قید کر دیا گیا۔ پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر انھیں رہائی دی گئی۔ اس وقت ان کی صحت خاصی بگڑ چکی تھی۔ صحت کی خرابی کے باوجود انھوں نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ انھی حالات میں 1920ء کو مولنا کا انتقال ہو گیا۔ آپ کو مدرسۂ دیوبند میں دفن کیا گیا۔

برطانوی استعمار اور اس کے مقامی لوگوں پر اثرات کے تناظر میں سیاسی آگہی کی بھی اشاعت کی جاتی تھی۔

دارالعلوم دیوبند نے مسلمانانِ ہندوستان کی رہنمائی کے لیے بڑے جذبے سے کوششیں کیں۔ اس مدرسے کے بانی مولنا محمد قاسم نانوتوی، ابتدا میں ہندو مسلم اتحاد کے خواہاں تھے اور ان کا خیال تھا کہ ان دونوں اقوام کو مل کر انگریزی استعمار اور عیسائیت کے فروغ کو روکنا چاہیے۔ بعدازاں آریا سماج کی مسلم دشمن سرگرمیوں سے مایوس ہو کر آپ نے اپنے خیالات میں ترمیم کر لی۔

دارالعلوم دیوبند محض ایک تعلیمی ادارہ نہ تھا بلکہ یہ ایک تحریک تھی جو مسلمانوں میں ہر اس رسم کی مخالفت کرتی تھی جو اسلامی تعلیمات کی روح کے منافی تھی۔ دیوبند کے علما نے بیوہ کی شادی اور عورتوں کو وراثت میں حصہ دینے پر زور دیا۔ شادی کے موقع پر غیر ضروری رسوم اور دکھاوے کی غرض سے فضول خرچی کو معاشرتی برائی قرار دیا۔ ان علما کا خیال تھا کہ ایسی رسوم سے درمیانے اور نچلے طبقے کے لوگوں پر معاشرتی دباؤ بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنی حیثیت سے قطع نظر بڑی بڑی رقوم ادھار لے کر شادی کی رسوم پر خرچ کر دیتے ہیں۔ اس طرح جھوٹی شان کے حصول میں وہ ساری زندگی ادھار کے جنجال میں پھنس کر رہ جاتے ہیں۔

دینی تعلیم کی اشاعت میں دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل علما نے اعلیٰ کارنامے سرانجام دیے۔ مولانا محمود حسن نے اردو میں قرآن حکیم کا ترجمہ کیا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی، مولنا مناظر احسن گیلانی، مولانا حفظ الرحمٰن، مولنا سعید احمد اکبر آبادی اور مولانا محمد اشرف علی تھانوی نے محققانہ مگر سادہ انداز میں اسلامی تعلیمات پر بے شمار کتب تحریر کیں۔ دارالعلوم دیوبند نے اب تک قریباً 18 ہزار مصنفین، مدرس، خطیب، مبلغ اور مفتی پیدا کیے ہیں۔

دارالعلوم نے مسلمانوں کی زندگی کے ہر میدان میں رہنمائی کی اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں فتاویٰ جاری کیے۔ فتویٰ، کسی بھی معاملے کے بارے میں، اسلامی احکام کی روشنی میں، اعلیٰ پائے کے علما کی حتمی رائے کو کہتے ہیں۔ 1911ء سے 1951ء

تک دارالعلوم کی جانب سے 147851 فتاویٰ جاری کیے گئے۔

علمی اور دینی معمولات کے علاوہ سیاسی میدان میں بھی علمائے دیوبند نے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق مسلمانوں کی رہنمائی کی۔ ان میں سب سے قابلِ ذکر مولانا محمود حسن کی سیاسی خدمات ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کے قیام سے ، ہندوستان دارالحرب میں بدل گیا ہے۔ اسلامی فقہ کی اصطلاح میں دارالحرب اس ملک کو کہتے ہیں، جہاں کفار رہتے ہوں۔ ایسے میں کفّار کے خلاف جہاد کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ یہ دارالسلام کی ضد ہے۔ فقہی اصطلاح میں دارالسلام اس ملک کو کہتے ہیں جہاں شریعتِ اسلامی کے مطابق حکومت ہو۔

مولانا محمود حسن ہندوستان سے انگریزوں کو نکالنے کے لیے جدوجہد کو ہر مسلمان پر فرض تصور کرتے تھے۔ اُسی زمانے میں انڈین نیشنل کانگرس سیاسی طور پر مؤثر ہو رہی تھی۔ کانگرس کے نظریات اور ان کے حکومت سے مطالبات کی روشنی میں سرسید مسلمانوں کو سیاست میں بالعموم اور ان کی کانگرس میں شمولیت کو بالخصوص ناپسند کر رہے تھے۔ اسی لیے انھوں نے مسلمانوں کو سیاست میں حصّہ نہ لینے کی نصیحت کی تھی۔ سرسید کے نظریات کے برعکس مولانا محمود حسن مسلمانوں کو ہندوؤں سے سیاسی اشتراک کر کے انگریزوں کے خلاف محاذ آرائی کا مشورہ دے رہے تھے۔ اس سے دارالعلوم دیوبند اور علی گڑھ کالج کے درمیان نظریاتی اور علمی اختلاف کی صورتحال پیدا ہو گئی۔

ندوۃ العلما (لکھنؤ)

ندوۃ العلما کے قیام کے مقصد کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس دور میں مسلمانانِ ہند میں سرگرم مختلف نظریاتی گروہوں کا موازنہ کیا جائے۔

انگریزوں کے استعماری نظام کے نفاذ کے بعد پیدا ہونے والی صورتحال میں مسلمانوں میں مختلف مکاتبِ فکر اپنی اپنی سمجھ اور مطمحِ نظر کے مطابق کام کر رہے تھے۔ ن میں اہم علی گڑھ اور دارالعلوم دیوبند تھے۔ علی گڑھ تحریک کے بانی سرسید

احمد خان مسلمانوں پر زور دے رہے تھے کہ وہ جدید سائنسی علوم سیکھیں اور اپنی زندگی کے ہر معاملے کو عقل اور سائنسی طریقے پر پرکھنے کی عادت ڈالیں۔ اس ضمن میں وہ قدامت پرستانہ روایت پر سخت تنقید کرتے تھے۔ دینی معاملات میں بھی وہ سائنسی طرزِ استدلال کے قائل تھے۔

سرسید کے ہی استاد مولانا مملوک علی کے ایک شاگرد مولانا محمد قاسم نانوتوی نے دارالعلوم دیوبند شروع کیا۔ اس مدرسے میں دینی علوم کی تدریس پر زور دیا جاتا تھا۔ علمائے دیوبند کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو درپیش مسائل کا واحد حل یہی ہے کہ وہ دینی تعلیمات پر سختی سے عمل کریں اور اپنے اخلاق کو انھی کے مطابق ڈھالیں۔

ابتدا میں سرسید احمد خان اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے درمیان باہمی تعاون کی فضا رہی، بلکہ علی گڑھ کے شعبہ دینیات کے صدر کے لیے سرسید نے مولانا نانوتوی کو ہی کسی مناسب شخص کو منتخب کرنے کا کہا تھا۔ اسی کے جواب میں مولانا نانوتوی نے مولانا عبداللہ انصاری کو علی گڑھ روانہ کیا تھا۔

ان دونوں تحاریک کا مسلمانانِ ہند پر اثر جداگانہ رہا۔ بعض مسلمان علما کا خیال تھا کہ ان دونوں اداروں کے نظریات میں ایک بہتر امتزاج پیدا کیا جائے۔ اس ضمن میں ان کے سامنے بنیادی مطمح نظر ایسے ذہن پیدا کرنا تھا جو جدید علوم سے بھی آراستہ ہو اور ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کی مذہبی اور معاشرتی میراث کا بھی ان پر اثر باقی رہے۔ اس طرح ہندوستان میں مسلمانوں کی تہذیبی اور دینی شناخت کو محفوظ بناتے ہوئے نئے تقاضوں کے مطابق لوگوں کو ڈھلنا ممکن ہو سکے گا۔

انھی خیالات کی روشنی میں کانپور میں مختلف علما کی ایک کانفرنس ہوئی۔ اس کانفرس کا انعقاد 1892ء کو مولانا محمد علی مونگیری کے ایما پر ہوا۔ کانفرس میں مولانا سلیمان ندوی نے حالات و واقعات کا اس طرح جائزہ لیا۔

"سمجھ سوچ رکھنے والے مسلمان انقلابی رجحانات اور ہلا دینے والے واقعات سے سخت پریشان ہیں۔ مکتب اور مدرسوں کا پرانا نظام اب ختم ہو رہا ہے۔ مسلمان لڑکوں کو انگریزی سکول اور کالج اپنی طرف کھینچ رہے

ہیں۔ حکومت کے اثر و رسوخ کے باعث عیسائیت کو ترویج مل رہی ہے
اور ان کے مشنریوں نے اپنی سرگرمیوں کے لیے باقاعدہ دائرۂ کار اور
نظام استوار کر لیا ہے۔ عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان مخاصمت زور
پکڑ رہی ہے۔ دونوں گروہ ایک دوسرے کے خلاف پمفلٹ چھاپتے
ہیں ... جدید یورپی نظریات کا سیلاب اُمڈا چلا آ رہا ہے۔"

"علما معمولی معمولی باتوں پر آپس میں لڑ جھگڑ رہے ہیں، اور ان
باتوں کی سراسر کوئی اہمیت بھی نہیں ہے۔ مسلمانوں کا تعلیمی نظام
غیر مؤثر اور قدیم ہو چلا ہے۔"

(مسلمانوں کا روشن مستقبل، مصنف طفیل احمد منگلوری)

اِسی تناظر میں ایک مجلس قائم کی گئی جس کا نام ندوۃ العلما رکھا گیا۔ اس کے اہم
مقاصد یہ تھے:۔

1- دینی مدارس کے طلبہ کو دینی علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم سے بھی روشناس کیا
جائے۔

2- علما کے درمیان نزاع کو ختم کروایا جائے۔

کچھ عرصے کے بعد ندوۃ العلما کانپور سے لکھنؤ منتقل ہو گیا اور اس میں مولانا
شبلی نعمانی (1857ء-1914ء) جیسے عالم بھی شامل ہو گئے۔ ندوۃ کی عمومی سرگرمیوں کا مقصد
بھی تعلیم کا فروغ تھا۔ اس ادارے نے بہت سے قابلِ قدر علما پیدا کیے، جنھوں نے
قابلِ قدر محققانہ علمی کام کیے۔ ابتدا میں ندوۃ العلما نے جدید اور قدیم علوم کے مابین
ایک توازن برقرار رکھا تاہم آہستہ آہستہ اس میں بھی قدامت کا رنگ غالب آ گیا۔

ندوۃ العلما کے ماتحت دارالمصنفین (اعظم گڑھ) قائم کیا گیا، جہاں سے مختلف
موضوعات پر کتب شائع کی جاتی تھی۔ ندوۃ العلما سے ایک رسالہ 'المعارف' بھی شائع ہو رہا
ہے۔

تجزیہ

ہندوستان میں انگریزی استعماری نظام کے قیام سے یہاں کی بسنے والی تمام اقوام کی تاریخی وراثت اور ان کی معاشرتی حیثیت دگرگوں صورتحال سے دوچار ہو گئی تھی۔ ایسی صورتحال میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو یکساں طور پر فکری بحران کا سامنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ استعماری نظام کے قیام کے ساتھ ہی دونوں اقوام نے اپنی اپنی شناخت کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ ان کوششوں میں ہر ذی شعور اور اپنی قوم کے لیے درد رکھنے والا، اپنی سمجھ اور سوچ کے مطابق کوئی نہ کوئی حل تلاش کر رہا تھا تاکہ نئے حالات میں اپنے قومی تشخص کو برقرار رکھتے ہوئے، وہ اپنی زندگی میں بہتری لا سکے۔

ہندو معاشرت اور مزاج تاریخی طور پر روایت پسند تھا۔ اسی روایت پسندی میں ان کے مذہبی گروہوں کا کردار مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ جب انگریزی تہذیب اور استعمار کا اثر، ہندو معاشرے پر ہونے لگا تو اِس گروہ کی سیادت کو شدید خطرہ محسوس ہونے لگا۔ تاہم اس صورتحال میں دو قسم کی تحاریک نے جنم لیا، ایک تحریک روایت اور جدید تقاضوں کے درمیان توازن برقرار رکھتے ہوئے، پنی قومی شناخت کو فروغ دینا چاہتی تھی تو دوسری قسم کی تحاریک کلی طور پر قدامت پرستی کو ہی راہِ نجات قرار دے رہی تھی۔

ہندو معاشرے کو اِس صورتحال میں ایک اور خطرہ عیسائی مشنریوں کی طرف سے تھا۔ انگریزوں نے عیسائیت کی اشاعت کے لیے بہت سے مشن ہندوستان روانہ کر دیے تھے۔ عیسائیت کی تبلیغ کے مضمرات میں بہت سے معاملات سیاسی طور پر انگریزوں کے حق میں جاتے تھے۔ کسی بھی شخص کے عیسائی ہونے سے، اُس کا تعلق حکومتی طبقے سے ہو جاتا تھا۔ اس کی معاشی حیثیت خواہ کچھ بھی ہو، معاشرتی تفاخر سے وہ کسی نہ کسی طور حکومت سے وفاداری کے جذبات کو فروغ دیتا رہتا تھا۔ عیسائی ہونے کی صورت میں اسے بہت سی سہولتیں بھی ملنے کا امکان پیدا ہو جاتا تھا۔

عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں سے ہندوؤں میں پسے ہوئے طبقوں خاص طور پر شودروں میں عیسائیت قبول کرنے کا رجحان تیزی سے زور پکڑنے لگا۔ اِس صورتحال

ے ہندو نظامِ معاشرت میں شدید شگاف پیدا ہونے لگے اور اِس نظام کی کمزوریاں ظاہر
ونے لگیں۔ ان حالات میں روایت پسند ہندو گروہ بہتر حل نہ دے سکے اور قوم کی
ہنمائی کی ذمے داری نئے تعلیم یافتہ طبقے نے پوری کرنا شروع کر دیں۔ یہی وہ دَور
ہے، جب برھمو سماج کی تحریک نے جنم لیا۔ اِس تحریک نے تمام حالات و واقعات کی
ملری توجیح پیش کی۔ اس سے تعلیم یافتہ طبقے میں حالات کو جانچنے کے لیے فکری
باحث کا سلسلہ شروع ہوا اور بعد میں آنے والی سرگرم تحریکوں نے اسی فکری عمل
سے فائدہ اٹھایا۔ برھمو سماج کی تحریک سے پیدا شدہ فکری بنیادوں پر ہی آریا سماج اور
وسری تحاریک نے عملی اقدامات شروع کیے۔

آریا سماج کی سمت اور کارروائیوں کی حیثیت ابتدائی طور پر مثبت رہی اور اس
سے ہندوؤں میں نیا شعور پیدا کرنے میں خاصی مدد ملی۔ آریا سماج جس تاریخی عہد میں
کام کر رہی تھی، اس میں دوسری اقوام، مسلمان اور عیسائی بھی متحرک تھے۔ عیسائی
چونکہ حکومتی طبقے سے منسلک تھے اور حکومتی طبقہ ایک استبدادی نظام کا نافذ کنندہ تھا،
س لیے ہندوؤں کا ان سے ٹکراؤ قدرتی نظر آتا ہے۔ چونکہ ہندو، ایک عرصے سے
سلمان حکمرانوں کے محکوم رہے تھے اور اس دَور سے وابستہ چند حکومتی پالیسیوں سے
میں کچھ شکایات بھی تھیں۔ انھوں نے اپنی شناخت کے عمل میں ماضی کی تلخیوں کو
ھار کر مسلمانوں کے تئیں ایک منفی انداز اپنا لیا۔ اس سے یقیناً دونوں اقوام کے
میان بُعد بڑھا اور بعض مقامات پر اِس میں شدّت بھی آگئی اور فسادات بھی ہونے
لگے۔ ان فسادات کو بعض اوقات، بعض گروہ سیاسی مفادات کے لیے ہوا بھی دیتے
تھے۔ اس طرح بہت سے بے گناہ لوگ اِن فسادات کا شکار بن جاتے۔

جب بھی کسی قوم کو انتشار کا سامنا ہو تو اس قوم کے اہلِ فکر، اس انتشار کے
سباب و محرکات کا جائزہ لیتے ہیں۔ اِس عمل میں ہر مکتبۂ فکر اپنی اہلیت اور سوچ کے
طابق حالات کا تجزیہ اور حل تلاش کرتا ہے۔ ان تمام آراء اور ان پر مبنی سرگرمیوں میں
و بھی حقیقی حالات سے وابستہ ہوں، وہ کارآمد ثابت ہوتی ہیں اور ان سے اُس قوم کو
حالات بہتر بنانے میں مدد مل جاتی ہے۔ دوسری طرف غیر حقیقی اور محض مفروضوں پر

قائم آراء اور سرگرمیاں نہ صرف بے عملی کا شکار ہو جاتی ہیں، بلکہ ان سے بعض اوقات قوم کو نقصان بھی پہنچ جاتا ہے۔ اِس تمام صورتحال میں ، اس بات پر کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں ہے کہ ان دونوں طرز کی تحاریک کے پس پردہ قوم کا درد یکساں طور پر عمل پذیر ہوتا تھا۔

انگریزوں کی آمد کے بعد ، مسلمانانِ ہندوستان کو جس معاشرتی اور تہذیبی انتشار کا سامنا تھا، اس کے حل کے لیے روایت پسند اور پھر جدیدیت پسند تحاریک نے جنم لیا۔ ان دونوں تحاریک نے اپنے طور پر حالات کا تجزیہ کیا اور اپنی سوچ اور مطمحِ نظر کے مطابق سرگرمیوں کا انتخاب کیا۔ اس دَور اور اس دَور کے تقاضوں میں دونوں کے نظریات اپنے طور پر درست سمجھ کر ہی شروع کیے گئے ، مگر واضح رہے کہ بعد میں آنے والے حالات نے ان کی ضرورت اور کردار پر فیصلہ کچھ اور دیا۔ ایسے میں یہ بات ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ ہر فرد اپنے زمانے اور دَور کے مطابق ہی اپنی سوچ استوار کرتا ہے، اسے بعد میں آنے والے حالات کا علم نہیں ہوتا۔ اِس لحاظ سے کسی بھی فکر اور تحریک کی کارکردگی اور اثر کو اس کے زمانے سے الگ رکھ کر نہیں سمجھنا چاہیے اور نہ ہی ان تحریکوں کے روحِ رواں حضرات پر بے جا اعتراض کرنا چاہیے۔ تاہم تاریخی اعتبار سے کسی تحریک کے کارآمد یا بے عمل ہونے کا معاملہ اس کی اساس سے منسلک نہیں کرنا چاہیے۔

انگریزوں کے آنے کے بعد مسلمانانِ ہند کے تشخص کے لیے جو بھی تحریکات شروع ہوئیں ، ان کے اساسی نظریات میں قوم کا درد ہی اہم محرک تھا۔ ان کے نظریات میں باہم اختلاف بھی ہوا مگر اِس اختلاف کی نوعیت بنیادی طور پر قومی معاملات پر اجتماعی استدلال کو فروغ دینا تھا۔ ایسے ماحول میں نئی راہوں کا تعین ممکن ہوتا ہے اور اجتماعی شعور میں مزید گہرائی اور وسعت آتی ہے۔

یاد دہانی

* ہندوستان میں انگریزی حکومت کے زیرِاثر بہت سی خلفشار پیدا ہوئی اور ہندوستان میں بسنے والی مختلف اقوام میں شناخت کا مسئلہ پیدا ہوا۔

* انگریزی دور میں، ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین باہمی مخاصمت کی فضا پیدا ہو گئی۔
* جب کسی قوم کو اپنی شناخت کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے تو ایسے میں دو قسم کی تحریکات جنم لیتی ہیں۔ ان میں سے ایک ماضی پرستانہ نظریات کو فروغ دے کر ماضی کے شاندار اَدوار کے احیأ پر زور دیتی ہیں۔ دوسری قسم کی تحاریک حالات کو سمجھنے اور ان سے حقیقت پسندانہ ربط قائم کر کے آگے بڑھنے کی کوشش کرتی ہیں۔
* انگریزی عہد کے دوران ہندو قوم پرستی کی تحریکوں میں تعلیم یافتہ نئے طبقے نے مرکزی کردار ادا کیا۔
* برھمو سماج کی تحریک بنیادی طور پر فکری تھی اور اس نے آنے والی تحریکوں کے لیے ایک نظریاتی اساس قائم کی۔
* آریا سماج کی تحریک کا بنیادی مقصد ہندو قوم پرستی کا احیأ تھا، مگر اس نے مسلمانوں سے متعلق منفی خیالات کو فروغ دینا شروع کر دیا۔ اس سے ہندو مسلم تعلقات کی فضا خراب ہو گئی۔
* ہندوستان میں مسلم احیأ کی تحاریک کے لیے فکری اور کسی حد تک علمی اساس شاہ ولی اللہ ؒ نے قائم کی۔ انھی کے نظریات سے متاثر ہو کر بعد میں مختلف تحریکوں نے جنم لیا۔
* دارالعلوم دیوبند کے قیام کا مقصد مسلمانوں میں دینی تعلیم کو فروغ دینا اور سیاسی معاملات میں عملی کارروائی کرنا تھا۔ اس مدرسے سے وابستہ کئی شخصیات نے عملی اور علمی سطح پر کئی کارنامے انجام دیے۔
* ندوۃ العلما کے قیام کا مقصد، مسلمانوں میں ایسے ذہن پیدا کرنا تھا جو جدید تقاضوں سے ربط و تعلق رکھتے ہوئے، اپنی ثقافت اور دینی میراث سے منسلک رہیں۔

واقعاتی تسلسل

کلکتہ میں ہندو کالج کا قیام	1817ء
برھمو سماج کی تحریک کا قیام	1828ء
راجا رام موہن رائے	1772ء-1833ء
آریا سماج کی بنیاد	1875ء

سوامی دیانند سرسوتی —— 1824ء-1883ء

گاؤکشی کے خلاف تنظیم کا قیام —— 1882ء

شاہ ولی اللہؒ —— 1702ء-1762ء

دارالعلوم دیوبند کا قیام —— 1867ء

مولانا محمد قاسم نانوتوی کا انتقال —— 1880ء

مولٰنا محمود حسن —— 1851ء-1920ء

مولانا رشید احمد گنگوہی —— 1829ء-1905ء

ندوۃ العلما کے قیام کے لیے کانفرنس —— 1892ء

مولٰنا شبلی نعمانی —— 1857ء-1914ء

غور و فکر کے لیے چند نکات

(الف)

1) انگریزی عہد حکومت میں ہندو احیأ کے لیے اٹھنے والی تحاریک کے نظریات کا، اس دَور کی ضروریات کے تناظر میں تجزیہ کریں۔ آپ ان تحریکات کے انداز فکر اور سرگرمیوں کو کس طرح دیکھتے ہیں، اپنے دلائل کو ٹھوس حقائق کے ساتھ پیش کریں؟

2) مسلمانان ہندوستان میں پیدا ہونے والی فکری اور علمی تحریکات کس حد تک اپنے زمانے کے تقاضوں سے مطابقت رکھتی تھیں۔ تجزیہ کریں اور اس دَور کی مختلف تحاریک کا باہمی تقابل بھی کریں؟

(ب) مختصر جواب دیں۔

i- انگریزوں کی آمد سے پہلے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تعلقات کی کیا نوعیت تھی؟

ii- انگریزوں کے آنے کے بعد ہندوستان میں بسنے والی اقوام میں کس قسم کے مسائل پیدا ہوئے؟

iii- ہندوؤں میں قوم پرستی کی تحریک، کی اساس کیا تھی؟ بدلتے حالات میں ان میں کس قسم کے تضادات ابھر کر سامنے آئے؟

iv- آریا سماج کی تحریک کا زیادہ تر اثر درمیانے طبقے کے ہندوؤں پر ہوا؟ تبصرہ کریں۔

v- مسلمانانِ ہندوستان میں قومی تشخص کی تعمیر کے لیے نظریاتی اساس پر ایک مختصر نوٹ لکھیں: اس ضمن میں شاہ ولی اللہ کی خدمات کا بھی تذکرہ کریں۔

vi- دار لعلوم دیوبند مسلمانوں میں کس قسم کا تشخص پیدا کرنا چاہتا تھا؟

vii- دارالعلوم دیوبند سے وابستہ مختلف علما کے دینی اور سیاسی کارناموں پر ایک مختصر نوٹ لکھیں؟

viii- فتویٰ کیا ہوتا ہے؟

ix- دارالحرب سے کیا مراد ہے؟

x- ندوۃ العلما کے قیام کے بنیادی مقاصد اور اس کی ضرورت پر تبصرہ کریں؟

ج ۔ ہاں یا نہیں میں جواب دیں۔

1- مسلمان بادشاہوں کے دَور میں حکومتی گروہ اور عام ہندوؤں کے درمیان ایک بُعد قائم رہا۔

2- عیسائی مشنری اپنے سکولوں میں مقامی بچوں کی تربیت اس ڈھنگ سے کرتے تھے کہ وہ اپنی ثقافت کے قریب تر ہو جائیں۔

3- مذہبی تصوّرات کی بنیاد پر ہندوؤں میں قوم پرستی کی تحریکات نے جنم لیا۔

4- برھمو سماج کی تحریک میں عملی سرگرمیوں پر زیادہ زور دیا گیا تھا۔

5- سوامی دیانند کی کتاب ستیارتھ پرکاش میں مسلمانوں کے خلاف منفی ردّعمل کا اظہار کیا گیا تھا۔

6- آریا سماج کی بنیاد جنوبی ہندوستان میں رکھی گئی مگر اس کو مقبولیت ہندوستان کے شمال اور مغربی علاقوں میں حاصل ہوئی۔

7- شاہ ولی اللہ نے اپنی تصنیفات کے ذریعے دینی معاملات میں مسلمانوں کی رہنمائی کی۔

8- شاہ ولی اللہ کے نظریات کی روشنی میں صرف علمی سطح پر مختلف تحریکوں نے جنم لیا۔

9- مولانا محمود حسن نے ہندوستان سے انگریزوں کو نکالنے کے لیے ایک منصوبہ بنایا۔ جس پر انگریزوں نے ان کو مالٹا میں قید کر دیا۔

10- دارالعلوم دیوبند کے منتظمین کسی سرکاری ادارے سے چندہ لینے کو دارالعلوم کے معاملات میں مداخلت کے مترادف سمجھتے تھے۔

د- نیچے دیے گئے ایک بیان کے سامنے چند جوابات دیے گئے ہیں۔ ان میں جو درست ہے اس پر ✓ کا نشان لگائیں۔

1- کسی بھی قوم کے دورِ انحطاط میں پیدا ہونے والی تحریک میں صرف وہی تحریک کامیاب ہوتی ہے جو؛

(ا) روایت پسند ہو،

(ب) صرف مستقبل پر نظر رکھتی ہو۔

(ج) سابقہ روایات اور نئے تقاضوں کے درمیان ایک توازن قائم کر کے نئی حکمت عملی استوار کرے۔

5

برطانوی نظامِ حکومت
(اقتصادی و انتظامی ادارے)

بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں، ہندوستان میں بھرپور سیاسی جدوجہد کا آغاز ہوا۔ اِس سیاسی جدوجہد کے مختلف دھاروں کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ برطانوی نظام حکومت اور اس کے مقاصد کو پرکھا جائے۔ یہ مطالعہ نہایت اہم ہے کیونکہ ہندوستان میں طاقت کا ارتکاز انگریزوں کے ہاتھ میں تھا اور وہ کسی بھی سیاسی تحریک کو اپنے مقاصد کے مدِمقابل برداشت نہ کرتے تھے۔ اِس تناظر میں سیاسی تحاریک کی وضع قطع بھی، اسی نظام کے حوالے سے استوار ہوئی۔ ہندوستانی قومیتوں کی سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی زندگی کا ارتقاً بھی حکومتی ڈھانچے کے بغور تجزیے کے بغیر ممکن نہیں۔

اقتصادی رجحانات

ہندوستان میں انگریزی حکومت کے قیام سے بیسویں صدی کے اوائل تک جو معاشی حالات رہے، ان کا خاکہ پہلے دیا جاچکا ہے۔ یہاں اس سے آگے انگریزی راج کے خاتمے تک اقتصادی احوال کا مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں ہندوستان میں جو سیاسی شعور اور عمل شروع ہوا، وہ ایک اقلیتی طبقے تک محدود تھا۔ اکثریتی لوگ اپنی اقتصادی حالت اور تعلیم کی کمی کے باعث سیاسی شعور میں بہت پیچھے تھے۔ ان کی زندگی کا محور محض دو وقت کی روٹی حاصل کرنے کی تگ و دو تک محدود تھا۔ اس کی سب سے اہم وجہ اس دَور کا اقتصادی نظام تھا۔ اس نظام کے اہم خدوخال یہ تھے۔

انگریزوں کی آمد سے پہلے ، ہندوستانی اقتصادی نظام داخلی سرگرمیوں تک محدود تھا اور بیرونی دنیا سے اس کے روابط محض چند اشیا کی درآمد و برآمد تک مقید تھے۔ انگریزوں نے چونکہ مقامی وسائل کو اپنی صنعتوں سے منسلک کر دیا تھا ، اس لیے ہندوستانی معیشت کا عالمی اقتصادیات سے ربط و تعلق قائم ہو گیا۔ اب عالمی اقتصادی رجحانات کا براہ راست اثر ہندوستانی اقتصادیت پر بھی پڑتا تھا۔ بیسویں صدی کے پہلے دو عشروں میں یورپ میں برطانیہ اور اس کی مخالف طاقتوں کے درمیان اقتصادی مقابلہ بازی بہت تیز تھی اور اسی کے نتیجے میں پہلی جنگ عظیم کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد بیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں جنگ سے تباہ شدہ معیشت کی تعمیر نو کی گئی۔ روایتی صنعتوں ؛ کوئلہ ، ٹیکسٹائل اور لوہے کو جدید بنیادوں پر استوار کیا گیا۔ اسی صدی کے چوتھے عشرے کے ابتدائی سالوں میں دنیا میں شدید اقتصادی بحران پیدا ہوا اور اسی کے نتیجے میں دوسری جنگِ عظیم شروع ہوئی۔

اس سارے عرصے میں ہندوستانی معیشت ، حقیقی معنوں میں برطانوی معیشت کی طفیلی بنا کر رکھی گئی اور جملہ اقتصادی منصوبہ بندی کو برطانوی صنعتوں کی ضروریات کے مطابق ہی تیار کیا گیا۔ اس سے ہندوستانی معیشت مقامی ضروریات کے مطابق نہ پنپ پائی اور یہاں غربت اور بے روزگاری بڑھتی گئی۔ یہاں زرعی اور صنعتی ، ہر دو میدانوں میں شدید بحرانی کیفیت جاری رہی۔

زرعی معیشت

ہندوستان میں زرعی پیداوار کی بہت بڑی صلاحیت موجود تھی۔ زرعی پیداوار جہاں ایک طرف روایتی صنعتوں کے لیے خام مال مہیا کرتی ہے، وہیں آبادی کے لیے خوراک کا بھی یہ واحد ذریعہ ہوتی ہے۔ زرعی پیداوار میں خود کفالت کا انحصار آبادی کے اضافے سے منسلک ہے ۔ ہندوستان میں بیسویں صدی کے پہلے نصف میں آبادی کے اضافے کی صورتحال یہ تھی:۔

1901ء تا 1911ء ـــــ 6.2 فیصد اضافہ

1911ء تا 1921ء ـــــ 9.1 فیصد اضافہ

1921ء تا 1931ء —— 10.6 فیصد اضافہ

1931ء تا 1941ء —— 15.0 فیصد اضافہ

1941ء تا 1951ء —— 14.1 فیصد اضافہ

آبادی میں اضافے کے مقابلے میں اجناس کی پیداوار 2-1901ء میں 48,081,000 ٹن سے 47-1946ء میں کم ہو کر 47,247,000 ٹن ہو گئی۔ اس کمی کی اہم وجوہات یہ تھیں:

1- مذکورہ عرصے میں کاشت کاروں کی حالت اس قدر خراب رہی کہ وہ کاشت کاری کے لیے ضروری اشیا بھی نہ خرید پاتے تھے۔ ایسی صورتحال میں اہم ضروریات پوری کرنے کے لیے کسانوں کو ساہوکاروں سے قرضہ لینا پڑتا تھا۔ یہ قرضہ انھیں سود در سود کی شرائط پر ملتا تھا اور عدم ادائیگی کی صورت میں انھیں زمین سے بے دخل کر دیا جاتا تھا۔ قرضے کی اس دلدل میں عام کسانوں کے علاوہ چھوٹے درجے کے زمیندار بھی پھنسے ہوئے تھے۔ 1911ء میں دیہاتی قرضہ جات کی مالیت 3- ارب روپے تھی جو 1938ء میں بڑھ کر 18- ارب روپے ہو گئی تھی۔ ان حالات میں زیرِ کاشت رقبے میں کمی ہوئی اور فی ایکڑ پیداوار بھی کم ہو گئی۔ 19-1918ء میں گندم کی فی ایکڑ پیداوار 7/8 من (تقریباً 350 کلوگرام) تھی اور 48-1947ء میں کم ہو کر 5/6 من (تقریباً 300 کلوگرام) فی ایکڑ ہو گئی۔ یہاں یہ حقیقت توجہ طلب ہے کہ نقد آور اجناس، جن میں انگریزوں کی صنعتی دلچسپی تھی، کی فی ایکڑ پیداوار میں 93-1892ء سے 46-1945ء کے عرصے میں دس فیصد اضافہ ہوا۔

حکومت برطانیہ نے کاشت کاروں کے حالات کو بہتر بنانے کے لیے کئی اصلاحات کیں۔ ان میں کاشت کاروں کو بے دخلی سے بچانے کے لیے ایک قانون پاس کیا گیا، جس کی رُو سے کوئی کاشت کار 12- برس کے لیے کسی زمین پر اپنی ملکیت رکھ سکتا تھا۔

ساہوکاروں کے چنگل سے نجات دلانے کے لیے 1904ء میں ایک ایکٹ پاس کیا گیا، جس کے تحت کواپریٹو سوسائٹیاں قائم کی گئیں۔ ان سوسائٹیوں سے کاشت کاروں

نوٹ: کتاب میں دی گئی شماریات Cambridge Economic History of India سے لی گئی ہیں۔

کو قرضے مل سکتے تھے۔ صوبوں اور مرکز میں زراعت کا محکمہ قائم کیا گیا۔ اس محکمے کا مقصد کاشت کاروں کو جدید طریقۂ زراعت اپنانے پر راغب کرنا تھا۔ اسی سلسلے میں ماڈل فارمز بھی قائم کیے گئے۔ آبپاشی کے لیے پرانی نہروں کی مرمت کی گئی اور پنجاب، سندھ، اتر پردیش اور راجستھان میں چند ایک نئی نہریں کھدوائی گئیں۔

یہ سب اقدام اگرچہ امید افزا تھے مگر مجموعی ضروریات کے مقابلے میں حد درجہ کم تھے۔ ان تمام اقدامات کا نفاذ بھی مؤثر طور پر نہ کیا گیا اور اگر کیا بھی گیا تو اسے چند علاقوں تک محدود رکھا گیا۔ دوسری طرف کسانوں کے انگریزی حکومت پر عدمِ اعتماد کے باعث، ان کا تعاون نہ حاصل کیا جا سکا۔ مجموعی طور پر ان اقدام کی ناکامی کا اندازہ ان حقائق سے لگایا جا سکتا ہے کہ انگریزی حکومت کے خاتمے تک کاشت کاروں نے مختلف ذرائع سے جو قرضہ لیا، اس میں سے صرف 3 فیصد کواپریٹو سوسائٹیوں سے لیا گیا تھا۔ نئے نہری نظام میں 1945ء تک کل زیرِ کاشت رقبے کا صرف 23 فیصد حصّہ نہروں سے سیراب ہوتا اور یہ علاقے زیادہ تر وہی تھے جہاں سے اہم صنعتوں کو خام مال ملتا تھا۔

صنعتی حالات

بادشاہوں کے دَور میں صنعتوں کا دائرہ حد درجہ محدود تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دَور میں صرف انھی صنعتوں کی سرپرستی کی گئی تھی، جن کو برطانیہ میں برآمد کرنا مقصود ہوتا تھا۔ اس سے ہندوستان کی روایتی صنعتوں کا خاتمہ ہوگیا۔ ہندوستان سے سوتی کپڑا، برطانیہ بھجوایا جاتا تھا مگر جب برطانوی صنعت کو عدم توازن کا خدشہ ہوا تو برطانوی حکومت نے سوتی کپڑے کی درآمد بند کر دی۔ بیسویں صدی کے اوائل تک برطانوی مصنوعات کی وافر مقدار ہندوستان آنے لگی۔ اس سے مقامی صنعتوں میں ترقی کی معمولی سی امید بھی ختم ہوگئی۔ اس معاشی ناہمواری کے خلاف کئی ایک سیاسی تحریکات نے بھی جنم لیا اور قوم پرستی کے لیے برطانوی مصنوعات کے بائیکاٹ کو ضروری قرار دیا گیا۔ اس سے خاص طور پر سوتی کپڑے کی صنعت کو فروغ ملا۔

انگریزوں نے ہندوستان میں صرف انھی صنعتوں کے قیام کی حوصلہ افزائی کی جن کی اجارہ داری انگریز یا ان کے زیرِاثر سرمایہ کاروں کے ہاتھ میں تھی۔ ان صنعتوں میں

نیل ، چائے ، کافی ، ربڑ کے پلانٹ لگائے گئے اور کیمیاوی مصنوعات کی ترقی پر خصوصی توجہ دی گئی۔ ان تمام صنعتوں پر انگریز کمپنیوں کا اجارہ تھا، تاہم ٹیکسٹائل کے شعبے میں مقامی لوگ بھی حِصّہ دار تھے مگر اس میدان میں اہم پیشہ ور ماہر اور انجنیئر انگریز ہی تھے۔

ان تمام صنعتوں سے حاصل کردہ آمدنی ، ان کے اجارہ داروں کی وساطت سے برطانیہ منتقل ہو جاتی تھی اور سرمایہ کی اس منتقلی سے ہندوستانی معیشت پر بُرے اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ اس سے مقامی معیشت میں وسعت کے امکان کم ہو جاتے تھے۔ اِس رجحان سے مقامی طور پر صرف یہی فائدہ ہوا کہ یہاں مزدوری کے لیے روزگار کے چند مواقع پیدا ہو جاتے تھے۔ تاہم یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مزدوروں کی نوکری کے لیے شرائط حد درجہ غیر انسانی اور غیر منصفانہ ہوتی تھیں۔

انگریزوں کے زیرسرپرستی قائم ہونے والی صنعتوں میں خاطرخواہ اضافہ ہوا۔ مثال کے طورپر بیسویں صدی کے اوائل میں چائے کا زیرِ کاشت رقبہ 525,000 ایکڑ تھا جو انگریزی دَور کے خاتمے تک 800,000 ایکڑ ہوگیا تھا۔ کپڑے کی صنعت میں ہندوستان بہت مشہور تھا۔ یہاں سے کپڑا یورپ اور چین کو برآمد کیا جاتا تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں چین اور جاپان کے درمیان تجارتی مقابلے اور انگریزوں کی پالیسیوں کے باعث ہندوستانی کپڑے کی برآمد نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ تاہم مقامی ضروریات اور کچھ برآمدی طلب کے باعث اس صنعت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ 01-1900ء میں ہندوستان میں 353 ملین پاؤنڈ دھاگہ (یارن) اور 422 ملین گز کپڑا تیار ہوا جبکہ 1947ءمیں یارن کی پیداوار بڑھ کر 1330 ملین پاؤنڈ اور کپڑا 3770 ملین گز ہوگیا ۔ اِس صنعت میں زیادہ تر حصص ہندوستانیوں کے اور 1948ءتک صرف 21 فیصد حصص غیرملکیوں کے پاس تھے۔

انگریزی دور میں جدید رسل و رسائل اور ذرائع نقل و حمل میں خاطرخواہ اضافہ ہوا۔ ان کے مقاصد مقامی زندگی کو بہتر بنانا نہ تھے بلکہ انگریزوں نے فوجی اور معاشی ضروریات کے تحت ریلوں اور دوسرے وسائل کو ترقی دی۔ انگریزی دور کے آخری سو سال میں ہندوستانی معیشت مکمل طور پر جامد رہی اور اس دَور میں فی کس قومی آمدنی

0.5 فی صد کی شرح سے زیادہ نہ بڑھ سکی۔

انتظامی نظام

چونکہ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کا مقصد یہاں کے وسائل کو اپنے تصرف میں لانا تھا، اس لیے انھوں نے معاشی پالیسیوں کے ساتھ ساتھ یہاں کے انتظام کو بھی اس طریقے پر استوار کیا کہ مقامی آبادی حکومت کے خلاف اٹھ نہ سکے اور وسائل تک ان کی دسترس میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ رہے۔ ہندوستان میں انگریزی انتظام کے اہم ادوار حسبِ ذیل ہیں۔

1- پہلا دَور ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد سے 1773ء تک جاری رہا۔ اس میں ایسٹ انڈیا کمپنی برطانوی شاہ کے چارٹر پر کاربند رہی۔ وہ ہندوستان میں تجارتی معاملات اور اس ضمن میں پیدا ہونے والے مسائل کو حل کرتی تھی۔

2- 1773ء سے 1858ء تک کے دَور میں کمپنی اپنے تجارتی مقاصد کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں اپنے استعماری نظام کے نفاذ کے سلسلے میں سیاسی اور فوجی معاملات بھی طے کرتی تھی۔ اس دَور میں ذمے دارانہ انتظامی روّیے پر زور دیا گیا تھا۔

3- تیسرا دَور 1858ء سے 1947ء تک رہا۔ اس میں ہندوستان پر برطانوی پارلیمنٹ کو براہِ راست اختیار حاصل تھا۔

اس دَور میں انگریزوں نے جو انتظامی ڈھانچہ استوار کیا، اس کے اہم خدوخال :
تھے:

(ا) ہندوستانی ریاستیں

ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے خاتمے تک قریباً 542 ریاستیں قائم ہو چکی تھیں۔ ان ریاستوں پر خودمختار راج حکومت کرتے تھے۔ 1857ء کی جنگ آزادی میں زیادہ تر ریاستوں نے عدم مداخلت کی پالیسی اپنائی تھی۔ حکومتِ برطانیہ نے اُن ریاستوں کو اپنی سرپرستی میں رکھتے ہوئے، ان سے دوستی اور امن کی فضا قائم کرنے کی پالیسی پر عمل کیا۔ اس پالیسی سے ان ریاستوں کو ہندوستان کی عمومی صورتحال سے الگ کر دیا گیا اور حکومت برطانیہ کے مسائل میں کمی ہو گئی۔ انگریزی حکومت نے ریاستی

راجاؤں کی وفاداریاں حاصل کرنے کے لیے انھیں مراعات بھی دیں اور اس ضمن میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے دَور میں متبنیٰ بنانے اور وراثت کے قوانین کو کالعدم قرار دے دیا گیا۔ ان ریاستوں میں سے چالیس بڑی ریاستوں کی آبادی ہندوستان کی کل آبادی کا $\frac{3}{4}$ تھی۔ یہاں انگریزوں کے نمائندے موجود رہتے اور انگریزی مفادات کا خیال رکھتے تھے۔

ریاستوں کے اس انتظام سے ہندوستان کا ایک بہت بڑا علاقہ اور ان میں آبا ہندوستان کی آبادی کا ایک کثیر حصہ غیر مؤثر کر دیا گیا۔

(ب) انتظامی ڈھانچہ

انگریزوں نے ہندوستان میں جو انتظامی ڈھانچہ استوار کیا، اس میں تمام تر طاقت اور اختیارات کے اہم گوشوں پر انگریز افسران متعین تھے۔ اِس نظام کو مزید مؤثر بنانے کے لیے بیوروکریسی کا نظام بھی رائج کیا گیا۔ اس نظام میں ایک مخصوص طریقے پر افسران کا انتخاب کیا جاتا تھا اوران کی تربیت مخصوص تحکمانہ انداز انتظام (AUTHORITARIAN SYSTEM OF ADMINISTRATION) پر کی جاتی تھی۔ ان افسران کو مرکز میں اہم شعبہ جات سے لے کر ضلع اور تحصیل کی سطح پر کلیدی عہدوں پر فائز کیا جاتا تھا۔ ان کے فرائض منصبی میں حکومت کو ضروری کوائف مہیا کرنے کے علاوہ حکومتی پالیسیوں کو ان کی روح اور حقیقی مقاصد کے مطابق نافذ کرنا ہوتا تھا۔ ان کے پاس مالیاتی، انتظامی اور عدالتی اختیارات کے علاوہ زندگی کے اہم شعبوں سے متعلق اختیارات ہوتے تھے۔

انگریزی حکومت کے ابتدائی سالوں میں صرف انگریزوں کو ہی اعلیٰ عہدوں پر نافذ کیا جاتا تھا۔ اس کے لیے مقابلے کا امتحان ہوتا تھا جس کا انعقاد لندن میں کیا جاتا تھا۔ بعد میں مقامی سیاست دانوں کے دباؤ کے تحت مقامی باشندوں کو بھی اس امتحان میں شمولیت کی اجازت دے دی گئی اور یہ امتحان ہندوستان میں بھی منعقد ہونے لگا۔ اس امتحان کے لیے بنیادی قابلیت انگریزی طرز تعلیم کا اعلیٰ درجے کا حصول ضروری تھا۔

بیوروکریسی کے اس نظام میں سب سے اہم عہدہ ڈپٹی کمشنر کا ہوتا تھا۔ ڈپٹی کمشنر کے فرائض میں انتظامی امور کے ساتھ ساتھ معاشی اور معاشرتی سرگرمیوں کی نگرانی کرنا بھی شامل ہوتا تھا۔ صحت، تعلیم، زراعت اور آبپاشی وغیرہ کے محکمے بھی اسی کے ماتحت ہوتے تھے۔ مالیہ کی رقم کی معافی یا کمی، زرعی قرضے دینا اور سکول تعمیر کرنا جیسے امور اسی کی صوابدید پر طے ہوتے تھے۔ ایسے صوابدیدی اختیارات کا اثر مقامی سیاستدانوں پر پڑتا تھا اور وہ اپنے علاقے میں اپنا اثر قائم رکھنے کے لیے کسی بھی ترقیاتی سرگرمی یا بہبود کے کام کے لیے ڈپٹی کمشنر کے محتاج رہتے تھے۔

انگریزی انتظامی ڈھانچہ دو اقسام پر مبنی تھا۔ ایک میں قوانین کی نوعیت طے شدہ تھی اور اس میں حقوق و فرائض کی نہایت احتیاط سے شرح کر دی گئی تھی۔ یہ نظام بنگال، مدراس اور بمبئی وغیرہ کے علاقوں میں نافذ کیا گیا تھا۔ ان صوبوں کو (REGULATION PROVINCES) کہا جاتا تھا۔ اس نظام سے عام زندگی میں خاطر خواہ بہتری نہ آئی، کیونکہ قوانین کی کسی خاص صورتحال میں توجیہہ کرنا ممکن نہ تھا۔ مثال کے طور پر کوئی بھی ضلعی افسر کسی غریب کسان کو جاگیردار یا ساہوکار کی زیادتی سے نہ بچا سکتا تھا۔ اس ضمن میں اسے کسی قسم کے صوابدیدی اختیارات نہ حاصل تھے۔ اس نظام کے تحت اگرچہ عام بہبود کے لیے تو کچھ نہ کیا جاسکا تاہم حقوق و فرائض کی نشاندہی سے ان صوبوں میں سیاسی شعور ضرور پیدا ہوا۔

اِس نظام کے برعکس پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں ایک اور قسم کا نظام رائج کیا گیا تھا۔ اس میں تمام انتظامی، عدالتی اور ترقیاتی اختیارات ڈپٹی کمشنر کے پاس مرتکز تھے۔ یہاں پر افسران کی بھرتی مقابلے کے امتحان (انڈین سول سروس) یا انڈین پولیٹیکل سروس سے کی جاتی تھی۔ انڈین پولیٹیکل سروس میں بھرتی، ہندوستانی فوج سے کی جاتی تھی۔ ایسے صوبوں میں مرکزی حکومت کی صرف یہی ہدایت ہوتی تھی کہ "کچھ بھی کرو، مگر معاملات قابو میں رہیں۔" اس سے ان علاقوں میں سخت جابرانہ اور تحکمانہ نظام استوار ہوا، جو جمہوریت، انصاف اور عدل کے تقاضوں سے متصادم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان علاقوں میں اجتماعی اور انفرادی شعور حد درجہ کم رہا۔

انگریزی نظامِ حکومت میں جملہ افسران کے لیے ضروری تھا کہ وہ حکومت کے وفادار ہوں اور وہ مکمل طور پر کسی بھی پس و پیش کے بغیر حکومت کے انتظامی، سیاسی اور معاشی مفادات کا تحفظ کریں۔ اِس کردار کے حوالے سے ان افسران کی کارکردگی ظاہری طور پر محض انتظامی معاملات تک محدود رہتی تھی اور درپردہ وہ حکومت کے سیاسی ایجنٹ کے طور پر کام کرتے تھے۔ یہ افسران تمام مقامی سیاستدانوں، جاگیرداروں اور اہم شخصیات کو ان کے مزاج کے مطابق خوش اسلوبی سے حکومتی پالیسی سے وفادار رہنے کا جتن بھی کرتے تھے۔

چونکہ ان افسران کی تربیت، برطانوی عزائم کی روشنی میں کی جاتی تھی، اس لیے ان کے سماجی اور رہن سہن کے اسلوب پر انگریزی انداز غالب ہوتا تھا۔ انگریز، ایسے رجحانات کی سرپرستی کرتے اور اسی انداز کو اپنے شایانِ شان سمجھتے تھے۔ اس لحاظ سے انگریزی رنگ ڈھنگ اپنانا ان افسران کی سرکاری ضروریات میں شامل تھا۔ حاکم قوم کی ثقافت کو اپنانے سے یہ افسران، حاکم طبقے سے اپنی قربت و بستگی کا اظہار کرتے تھے۔ اس کے برعکس مقامی ثقافت اور معاشرتی اسالیب کو غیرپسندیدہ اور غیرمہذبانہ سمجھا جاتا تھا۔ ان افسران کو یہ بھی ہدایت دی جاتی تھی کہ وہ نہ تو عوام سے قریب رہیں اور نہ ہی ان کے عام رویّوں میں اِس قسم کا اظہار ہونا چاہیے۔ اِن ہدایات پر عمل سے عام لوگوں اور افسران کے مابین ایک خوف اور دوری کی فضا پیدا ہو جاتی تھی۔

باقاعدہ سروسز کے علاوہ، کچھ اہم انتظامی اور عدالتی عہدوں پر جاگیرداروں اور اہم وڈیروں یا ان کے بچوں کو بھی بھرتی کیا جاتا تھا۔ ایسی بھرتیوں کا مقصد ان طبقوں کو وفادار رکھنا ہوتا تھا۔

تجزیہ

تاریخ میں کئی ادوار ایسے بھی آئے ہیں جب کسی بھی علاقے کے کچھ لوگوں کو اپنی معاشرت اور روزمرہ کی رسوم میں اجنبیت محسوس ہونے لگتی تھی۔ ایسا ماحول عام طور پر نوآبادیاتی نظام کے تحت پیدا ہوتا ہے اور اسے سوچ سمجھ کر سامراجی قوتیں پیدا کرتی ہیں۔

ہندوستان میں انگریزی حکومت استعماری تھی اور ان کا نظام نوآبادیاتی تھا۔ وہ یسا ماحول استوار کرنا چاہتے تھے جس میں مقامی ثقافت کی بجائے، انگریزی تہذیب کو علیٰ اور برتر سمجھا جانے لگے۔ اس صورتحال میں مقامی لوگوں میں یہ احساس پیدا کرنا مقصود ہوتا تھا کہ وہ اپنی سابقہ روایات اور ورثے سے بے گانہ محسوس کرنے لگیں۔ اس کی اہم مثال انگریزوں کے تربیت یافتہ افسران کے رویئے سے دی جا سکتی ہے جو نگریزوں کے اہم اور معتمد آلۂ کار تھے۔ مقامی لوگوں میں ثقافتی بے گانگی پیدا کرنے کا مقصد ان میں خوداعتمادی ختم کرنا تھا۔ جب لوگوں میں خوداعتمادی نہ ہوگی تو صاف ظاہر ہے کہ وہ کسی بھی دوسرے نظام کو بہتر تصور کرنے لگیں گے۔ ایسی صورتحال میں ستعماری قوت بہتر طور پر اپنے عزائم کو پورا کر سکتی ہے۔

انگریزی نظام حکومت میں عدم توازن کی دوسری سب سے بڑی مثال ان کی قتصادی پالیسیوں میں نظر آتی ہے۔ اس میدان میں صرف انھی صنعتوں اور شعبہ جات یں ترقی کی حوصلہ افزائی کی گئی جن میں انگریز سرمایہ کاروں کا مفاد تھا۔ عام کسانوں اور مام آبادی کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے میں کماحقہ توجہ نہ دی گئی اور ہندوستان کی کثریتی آبادی غریب سے غریب تر ہوتی گئی۔

ہندوستان میں سیاسی عمل : جداگانہ حیثیت کے لیے کوششیں

سرسید نے کہا:

''آپ خیال کریں کہ کیا حال انتخابات کا ہے؟ کسی ضلعے میں ہندو مسلمان برابر نہیں ہوتے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ مسلمان کو ہندو دبا دیں گے اور سیلف گورنمنٹ کے مالک بن جائیں گے۔ ابھی کلکتے میں ایک بڑے بزرگ، خاندانی داڑھی والے مسلمان مجھ سے ملے اور انھوں نے کہا، غضب ہوگیا، ہمارے شہر میں (میونسپل کمیٹی کے لیے) اٹھارہ مسلمان

ممبر منتخب ہونے والے تھے، کوئی منتخب نہیں ہوا۔ سب ہندو منتخب ہو گئے۔ اب گورنمنٹ (کی طرف) سے کسی مسلمان کا تقرر ہونا چاہیے۔ میں چاہتا ہوں ور امید کرتا ہوں کہ مجھ کو گورنمنٹ منتخب کرے۔ یہی حال سب شہروں کا ہے۔ علی گڑھ میں اگر خاص قاعدہ مقرر نہ ہو جاتا تو کوئی مسلمان یہاں تک کہ ہمارے دوست مولوی خواجہ محمد یوسف بھی جو نہایت معزز ہیں، بہ مشکل اپنے منتخب ہونے کے ووٹ حاصل کر سکتے اور آخر گورنمنٹ کی طرف سے تقرر کے متوقع رہتے۔"

(پاکستان ناگزیر تھا۔ ص 35)

یہاں سرسید نے جو سوال اٹھایا ہے، وہ ہندوستان میں سیاسی عمل کے ابتدائی سالوں میں مسلمانوں کے لیے نہایت اہم اور بنیادی حیثیت رکھتا تھا۔ ہندوستان میں ہندو اکثریت میں تھے اور مروّجہ معیار نیابت ان کے لیے موزوں تھا۔ یہی معیارِ نیابت مسلمانوں کے لیے حد درجہ ناقابلِ قبول تھا کیونکہ اس سے انھیں نہ ہونے کے برابر کامیابیاں مل سکتی تھیں۔ وہ صرف مسلم اکثریت کے صوبوں میں تو اپنی نشستیں حاصل کر سکتے تھے مگر ہندو اکثریت کے علاقوں میں ان کی نمائندگی ممکن نہ تھی۔ اس طرح ہندو اکثریتی علاقوں میں مسلمانوں کی سیاسی حیثیت کا مستقبل حد درجہ مخدوش تھا اور وہ مستقل طور پر ہندوؤں کے تسلّط میں آ سکتے تھے۔ ہندو اپنی آبادی کے تناسب سے مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ نشستیں رکھتے تھے اور اس لحاظ سے ان کی مجموعی سیاسی پوزیشن بہتر تھی۔

اس سیاسی صورتحال میں مسلمان رہنماؤں نے ہندوستانی سیاست میں اپنی حیثیت کو بہتر بنانے کی غرض سے مروّجہ پارلیمانی طرزِ انتخاب کی بجائے ایسے اصولوں کی منظوری پر زور دیا جس میں مسلمان آبادی اپنے مسلمان نمائندوں کا انتخاب کر سکیں او ہندو آبادی اپنے ہندو نمائندوں کا۔ اِس کو جداگانہ حقِ نیابت کا نام دیا گیا اور 1909ء تک ہندوستانی سیاست میں مسلمان رہنماؤں کی سرگرمیوں کا محور جداگانہ طرزِ انتخاب کے مطالبے پر ہی رہا۔

ہندوستان میں سیاسی عمل کے بارے میں 1858ء میں قائم ہونے والی انگریزی حکومت کی ترجیحات اور مقاصد حسبِ ذیل تھے:۔

1- ایسٹ انڈیا کمپنی کے دَورِ حکومت میں مروجہ فوجی اور دوسرے جابرانہ اقدامات کو ختم کر دیا جائے۔

2- ہندوستان میں آئینی بنیادوں پر سیاسی عمل شروع کیا جائے اور یہ عمل حکومتی مقاصد اور ترجیحات سے ہم آہنگ رہے۔

3- ہندوستان میں سیاسی عمل میں ، ہندوستانی قومیتوں کو شامل کیا جائے مگر یہ عمل تدریجاً ہو اور ان قومیتوں کے سیاسی شعور سے مطابقت رکھتا ہو۔

حکومت کے طے کردہ انھی مقاصد کی روشنی میں ہندوستانی سیاست کی مجموعی صورتحال اور اس میں مسلمانوں اور ہندؤوں کے سیاسی کردار کی وضاحت ہوتی ہے۔ حکومت برطانیہ نے 1858ء کے ایکٹ میں ہندوستان میں برطانوی حکومت کے لیے انتظامی اور آئینی خاکے کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اس کا خلاصہ پیچھے دیا جا چکا ہے۔ اس ایکٹ کے مطابق حکومتی اور قانون ساز اداروں میں مقامی لوگوں کی شمولیت قطعی طور پر نہ رکھی گئی تھی۔ 1861ء میں جو ایکٹ نافذ کیا تھا اس میں ہندوستانیوں کو حکومتی معاملات میں قدرے شریک کیا گیا ۔ اس ایکٹ کی اہم شقیں یہ تھیں :۔

1861ء کا انڈین کونسلز ایکٹ

1- گورنر جنرل کی انتظامی کونسل کو وسعت دی گئی اور اس میں غیر سرکاری ممبران کو شامل کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ اس طرح جو اضافی ممبر مقرر کیے گئے وہ ہندوستان سے تھے۔ ان ممبران کو نامزد کیا جاتا تھا اور یہ صرف قانون سازی کے معاملات میں محدود طور پر حصہ لے سکتے تھے۔ ان ممبران کو انتظامی امور کے سلسلے میں کسی قسم کے بحث مباحثہ میں حصہ لینے یا سوال کرنے کی ممانعت تھی۔

2- مختلف صوبوں میں قانون ساز اسمبلیوں کو قائم کیا گیا۔ یہ اسمبلیاں مدراس اور بمبئی کے بعد صوبہ جات متحدہ، شمال مغربی صوبوں اور پنجاب میں بھی قائم کر دی گئیں۔ ان اسمبلیوں میں بھی ممبران کی کارکردگی محدود رکھی گئی اور ان کو گورنر جنرل کی کونسل

کے مطابق ہی چلنا پڑتا تھا۔

اِس ایکٹ کی مندرجہ بالا شقوں سے ہندوستان کے مقامی معاملات میں مقامی نمائندوں کے دخل کی گنجائش تو ضرور پیدا ہوگئی تاہم یہ حد درجہ محدود تھی۔ بہرکیف 1861ء کے ایکٹ کو حکومت خوداختیاری کے عمل میں پہلا قدم قرار دیا جا سکتا ہے۔ اِسی عمل سے 1935ء تک صوبوں کو داخلی خودمختاری مل گئی تھی۔

1892ء میں برطانوی حکومت نے ایک اور ایکٹ پاس کیا۔ اس ایکٹ کے تحت شہروں میں میونسپل اور ضلع کونسلیں قائم ہوئیں۔ اِن کونسلوں کے ارکان اپنے مقامی مسائل کو مقامی انتظامیہ کے تعاون سے حل کرنے کی سعی کرتے تھے۔ ان اداروں کے اراکین کی اکثریت عام انتخاب کے ذریعے منتخب کی جاتی تھی جب کہ ان کے حلقے مختلف اقوام پر مشتمل تھے۔

انڈین نیشنل کانگرس

انگریزی حکومت کے قیام کے چند سالوں میں ہی اس کے منفی اثرات ظاہر ہونے لگے۔ معاشی لحاظ سے ایک عام آدمی (1) پر بوجھ بڑھنے لگا۔ اس سے اپنے وسائل کے حوالے سے لوگوں میں سیاسی شعور تیزی سے بڑھنے لگا۔ اس شعور کی بیداری میں ہندوستانی اخبارات ور رسائل کے ساتھ ساتھ مختلف مذہبی اور سماجی تنظیمیں بھی اہم کردار ادا کر رہی تھیں۔

---

(1) انیسویں صدی کے آخری عشروں میں ایک عام ہندوستانی کی سالانہ آمدنی 30 روپے تھی۔ بڑھتی ہوئی قیمتوں اور کم آمدنی کے باعث اس کی قوت خرید کم ہو رہی تھی۔ بنگال میں 1860ء میں ایک روپے میں 50 سیر (46.5 کلوگرام) چاول مل جاتے تھے جبکہ 1870ء میں یہ گھٹ کر ایک روپے میں 20.8 سیر (19.34 کلوگرام) 1890ء میں مزید گھٹ کر 18.3 سیر (تقریباً 17 کلوگرام) اور 1905ء میں 13.5 سیر (120 کلوگرام) فی روپیہ ہو گئے۔ 1860ء سے 1905ء تک قیمتوں میں چار گنا اضافہ ہوا جبکہ فی کس آمدنی میں صرف 25 فیصد اضافہ ممکن ہو سکا۔

حکومت برطانیہ نے افغانوں سے جنگوں (1878-80ء) اور دوسرے جنگی اخراجات کو پورا کرنے کے لیے ٹیکسوں کی شرح میں اضافہ کر دیا۔ انکم ٹیکس کو ایک فیصد سے $2\frac{1}{2}$ فیصد

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

انگریزی حکومت کو اپنی پالیسیوں کے اثرات کا بخوبی اندازہ تھا اور وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ ان کی ہندوستان میں حکومت نہ صرف غیر قانونی بلکہ غیر نمائندہ بھی تھی، اور یہ کہ لوگ اسے ناپسند بھی کرتے تھے۔ ان حالات میں انگریزوں نے اپنی حکومت کو متوقع مزاحمت سے بچانے کے لیے ایک فوجی اور سول بیورو کریسی کا نظام استوار کر لیا تھا۔ مگر بعض انگریز ایسے نظام کو طویل عرصے تک برقرار رکھنا ناممکن گردانتے تھے۔ وہ کوئی ایسا انتظام کرنے کے حق میں تھے جس سے ہندوستان میں کسی بھی سیاسی تحریک کو اس سطح پر نہ آنے دیا جائے کہ وہ حکومت کے مسئلہ پیدا کر دے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ حکومت مخالف جذبات کو کوئی بھی عملی صورت اختیار کرنے سے پہلے ہی ختم کر دیا جائے۔

ان مسائل کے حل کے لیے حکومت نے اپنی نگرانی میں اپنے وفادار جاگیرداروں اور امرا کی (1) مدد سے سیاسی پلیٹ فارم بنانے کی کوشش کی، جہاں پر انگریز دشمن خیالات اور مقامی لوگوں کے مسائل کو سیاسی مسائل کی شکل دے کر ان میں مزاحمت کا نکال دیا جاتا تھا۔

اور بعد میں 3 فیصد کر دیا گیا۔ مدراس میں نمک پر ٹیکس دوگنا، بمبئی میں 281 فیصد اور دوسرے صوبوں میں نمک پر ٹیکس کی شرح 50 فیصد بڑھا دی گئی ۔

حکومتی پالیسیوں کے باعث ملکی اناج اندورن ملک بھجوانے کی بجائے فوجیوں کو بھجوا دیا جاتا تھا۔ اس عرصے میں خشک سالی کے باعث کئی قحط پڑے جن میں لاکھوں انسان لقمۂ اجل بن گئے۔ حکومتی خزانے پر قرضہ جات کا بوجھ بھی دن بدن بڑھتا جا رہا تھا۔

---

(1) ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور میں حکومت کے وفادار راجاؤں اور جاگیرداروں کے ساتھ ساتھ ایک درمیانہ طبقہ پیدا ہو گیا تھا۔ یہ لوگ باقی ہندوستان سے اپنے آپ کو منقطع کر کے انگریزوں سے مرعوب ہوکر ، ان کی مدد سے خوشحال اور کامیاب زندگی گزارنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کی کارکردگی کا محور انگریزوں سے مکمل وفاداری تھا۔ یہ لوگ انگریزی تعلیم حاصل کر کے نہ صرف انگریزوں سے قریبی تعلق کے خواہاں ہوتے تھے بلکہ اچھی نوکریاں بھی حاصل کر لیتے تھے۔ یہ لوگ ہندوستان میں انگریزی عزائم کی بار آوری میں اہم ایجنٹ کا کام کرتے تھے۔

انڈین نیشنل کانگرس کے قیام کا مقصد مختلف شہروں میں مسائل کو ایک سیاسی عمل میں ڈھالنے کے لیے ایک پلیٹ فارم مہیا کرنا تھا۔ اس کے قیام کے سلسلے میں بنیادی کام ایک فسر ایلن اکٹیوین ہیوم (1829ء-1912ء) نے ادا کیا ۔ یہ انگریز 1846ء میں سرکاری ملازمت میں آیا۔ 1879ء کو لارڈ لٹن نے اسے جبری طور ایک اہم عہدے سے معطل کر دیا۔ 1882ء میں ہیوم نے سرکاری ملازمت سے ریٹائرمنٹ لے لی۔

ہندوستان میں انگریزوں کے عزائم اور طریق کار کے بارے میں ہیوم کا خیال تھا کہ ان کی حکومت ایک متزلزل بنیاد پر کھڑی ہے اور اس کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ حکومتی اہلکاروں کو اس کا اندازہ تک نہیں ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ہندوستان کی معاشی صورتحال حد درجہ بگڑ چکی ہے اور اس کا آبادی کے نچلے طبقوں پر اس قدر بوجھ بڑھ گیا ہے کہ یہ نچلا طبقہ نا اُمیدی اور بے سروسامانی کے عالم میں کسی دن پھٹ پڑے گا۔ یہ طبق تشدد پر اتر آئے گا اور پھر اس کے سامنے کوئی نہ ٹھہر سکے گا۔ اِن نظریت کے تناظر میں ، اُس نے ایک قومی تحریک شروع کرنے پر زور دیا ، جس کے اس کے نزدیک اہم مقاصد یہ تھے:۔

1 تمام ہندوستانی آبدی کو ایک قومی وحدت میں سمونا۔

2- بتدریج تمام روحانی ، اخلاقی ، معاشرتی اور سیاسی تحریکات اور نقطۂ ہائے نظر کو ایک قومی رنگ دینا۔

3- ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان انضمام کی کوشش کو مستحکم بنیادوں پر چلانا ۔ اس ضمن میں غیر منصفانہ اور ضرر رساں حالات کو دفع کرنا۔

اِن مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے، ہیوم نے مختلف مکاتبِ فکر کے لوگوں سے ان کی آراء حاصل کرنا شروع کر دیں۔ اِس سلسلے میں اس وقت کے وائسرائے لارڈ ڈفرن سے بھی ملاقات کی۔ لارڈ ڈفرن نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس ملک میں لوگوں کی کوئی ایسی جماعت موجود نہیں جو اس قسم کی خدمت انجام دے جو انگلستان میں ملکہ وکٹوریہ کی حزب اختلاف ادا کر رہی ہے۔ اخبارات اگرچہ لوگوں کی ترجمانی کرتے ہیں مگر وہ قابلِ اعتماد نہیں اور انگریز اس سے بے خبر ہیں کہ ہندوستانی حلقوں کا ان

کے اور ان کی پالیسیوں کے متعلق کیا خیال ہے۔ انگریزوں اور رعایا، دونوں کے مفاد کے لیے یہ بہتر ہوگا کہ ہندوستانی اہلِ سیاست سال میں ایک مرتبہ جمع ہوں اور گورنمنٹ کو یہ بتائیں کہ انتظامات میں کیا خرابیاں ہیں اور ان کی اصلاح کیسے کی جا سکتی ہے۔"

مختلف انگریزوں اور مقامی سیاسی حلقوں کے باہم صلاح مشورے کے بعد 28- دسمبر 1885ء کو بمبئی میں انڈین نیشنل کانگرس کا پہلا اجلاس ہوا۔ اس اجلاس میں 72 مندوب شامل تھے اور ان کا تعلق ہندوستان کے تقریباً تمام علاقوں سے تھا۔ اس اجلاس کی صدارت ڈبلیو سی بونرجی (1) نے کی۔

کانگرس کا قیام ہندوستان کے سیاسی عمل میں ایک اہم واقعہ تھا اور اس کا اساسی مقصد ہندوستانی نقطۂ نظر کو حکومت تک پہنچانے کے لیے ایک پلیٹ فارم کا قیام تھا۔ مگر آہستہ آہستہ ہندوؤں کے پڑھے لکھے درمیانے درجے کے لوگوں کی شمولیت سے اس کا اندازِ سیاست، اساسی نظریات سے قدرے مختلف ہوتا گیا، اور بعد میں اس نے ایک نئی راہ اختیار کر لی۔

کانگرس کی کارگزاری

(1885ء تا 1905ء)

ابتدا ہی سے کانگرس کے مقاصد اور اس کی کارگزاریوں پر حکومتی نقطۂ نظر یک طرفہ ہی رہا۔ کانگرس کے اجلاسوں میں حکومت کے بارے میں مندوبین کے خیالات حکومت تک تو پہنچ جاتے مگر اِن کے حل کے سلسلے میں حکومتی ترجیحات میں کوئی

---

(1) بونرجی (BONNERJEE, WOMESH CHANDER)(1844ء-1906ء) نے اپنی عملی زندگی کا آغاز کلکتہ ہائی کورٹ میں وکالت سے کیا اور جلد ہی سرکاری وکیل بن گئے۔ تین مرتبہ اُن کو جج بنانے کی پیش کش کی گئی مگر انھوں نے اسے قبول نہ کیا۔ 1880ء میں بنگال کی صوبائی مجلس قانون ساز کے ممبر منتخب ہوئے۔ 1885ء کے علاوہ 1892ء میں کانگرس کے الہ آباد اجلاس میں بھی آپ صدر منتخب ہوئے۔ 1902ء میں انگلستان چلے گئے اور بقیہ عمر وہیں گزاری اور کانگرس کے خیالات کی اشاعت کرتے رہے۔

فرق نہ پڑتا تھا۔ اِس ضمن میں حکومت بدستور اپنے مفادات کی بار آوری پر زور دیتی اور لوگوں کے مسائل کو حل کرنے کے سلسلے میں ان کے اقدامات نہ ہونے کے برابر تھے۔

کانگرس کے ابتدائی سالوں میں ہی ، ہندوؤں میں خاص طور پر بنگال کے نئے تعلیم یافتہ طبقے نےاس میں شمولیت اختیار کرنا شروع کر دی تھی۔ یہ طبقہ جدید لبرل سیاسی نظریات سے متاثر تھا اور مکمل طور پر حکومتِ وقت کا تابع رہنا پسند نہ کرتا تھا۔ اسی طبقے کے اثر سے آہستہ آہستہ کانگرس ایک ہندو قوم پرست جماعت میں بدل گئی۔ اِس تبدیلی کے ارتقاً کا مختصر جائزہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

قیام کے وقت کانگرس کے مقاصد بظاہر مقامی نقطۂ نظر کو حکومت تک پہنچانا تھے مگر درپردہ ان مقاصد کی صورتحال کانگرس کے پہلے اجلاس کے صدر کے خطاب سے واضح ہوتی ہے۔ بونر جی نے اس اجلاس میں کہا:۔

"برطانوی گورنمنٹ کا پورا پورا اور مستقل خیر خواہ مجھ سے زیادہ اور میرے ان دوستوں سے زیادہ جو میرے گرد بیٹھے ہیں اور کوئی نہیں ہے۔"

(دی ہسٹری آف دی کانگرس جلد اوّل مصنفہ پٹا بھی سیتا رامیہ)

دوسرے اجلاس کے صدر دادا بھائی نوروجی (1) نے کہا :۔

"ہم کو مَردوں کی طرح بولنا اور اعلان کرنا چاہیے کہ ہم اپنی ریڑھ کی ہڈی تک انگریزوں کے وفادار ہیں۔ ہم ان فوائد کو سمجھتے ہیں جو انگریزی حکومت نے ہم کو عنایت کیے ہیں۔ ہم اس انگریزی تعلیم کی قدر کرتے ہیں جس نے ہمارے اردگرد اندھیروں کو روشنی میں بدل دیا۔۔۔۔" (ایضاً)

---

(1) دادا بھائی نوروجی (1825ء-1910ء) ایک پارسی لیڈر تھے۔ 1854ء میں عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ یہ ایک متمول تاجر تھے اور ایک مدت تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک ادارے میں کام کرتے رہے تھے۔ یہ برطانوی پارلیمنٹ کے ممبر بھی رہے۔ تین مرتبہ آل انڈیا کانگرس کے صدر منتخب ہوئے۔

کانگرس کے اسی اجلاس میں ایک مقرر نے حکومت کی توجہ ملک میں بڑھتی ہوئی غربت کی طرف دلائی اور مجالس قانون ساز کو وسعت دینے اور مقامی لوگوں کو زیادہ سے زیادہ نمائندگی دینے کا مطالبہ بھی پیش کیا۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں مرکزی محکموں میں بھرتی کے لیے امتحان کو برطانیہ کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں بھی منعقد کرنے کا مطالبہ پیش کیا۔ اس طرح آہستہ آہستہ کانگرس کے اجلاسوں میں حکومت کے رویّے اور عوام کی حالت زار کے بارے میں تقاریر شروع ہوگئیں۔ کانگرس کے رویے میں اس قسم کی تبدیلی حکومتِ برطانیہ کو پسند نہ آئی۔ ایک انگریز وائسرائے نے اسی صورتحال پر اِس طرح تبصرہ کیا:-

"یہ (کانگرس) ایک خوردبینی اقلیت کی نمائندہ جماعت ہے اور اس کے نظریات مبہم اور ناقابل عمل ہیں۔"

انیسویں صدی کے اواخر میں بنگال کے ہندوؤں میں انگریزی اداروں کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کا ایک گروہ ابھرنے لگا۔ یہ نوجوان جدید جمہوری نظریات سے متاثر تھے۔ وہ ہندوستان میں انگریزوں کی قائم کردہ حکومت کو بددیانت اور منافقت پر مبنی خیال کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ برطانیہ میں جاری جمہوری نظام کے مقابلے میں ہندوستانی نظام حکومت مکمل طور پر استعماری اور ناقابل قبول ہے۔ وہ انگریزوں کو مجبور کرنا چاہتے تھے کہ وہ ہندوستان میں جاری استعماری عزائم کو ترک کر کے حکومت خودمختیاری قائم کریں۔ یہ نیا طبقہ حکومتِ برطانیہ سے مراعات لینے کی بجائے مکمل آزادی کا خواہاں تھا۔ اِسی دَور میں کئی ہندو قوم پرست رہنماؤں کے نظریات نے ایک نئی لہر پیدا کر دی ان میں سوامی وویک آنند (1863ء-1902ء) اور اروندو گھوش (1872ء-1950ء) نے آزادی کے نظریات کو ترویج دی۔

انیسویں صدی کے آخر تک کانگرس مکمل طور پر ہندوؤں کی جماعت بن گئی اور اس پر بنگال کے پڑھے لکھے نوجوانوں کا قبضہ ہوگیا۔

اُس زمانے میں ہندوؤں کی قیادت دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ ایک گروہ آئینی طریقوں پر چل کر حکومت کے تعاون سے ہندوستان کے مسائل کو حل کروانے کا خواہاں

ھا جبکہ دوسرا متشدد حربوں سے سوراج یعنی ہندوستان پر ہندوؤں کی حکومت قائم کرن چاہتا تھا۔ پہلے گروہ کے اہم رہنما گوپال کرشن گوکھلے (1) اور دوسرے گروہ کے قائد بال گنگا دھر تلک (2) تھے۔

انڈین کونسلز ایکٹ 1892ء

ہندوستان میں بڑھتے ہوئے شعور کا احساس کرتے ہوئے برطانوی حکومت نے 1888ء میں 1861ء کے ایکٹ میں اصلاحات کرنے کے لیے ایک کمیٹی قائم کی۔ اس کمیٹی کی سفارشات کی بنیاد پر 1892ء میں انڈین کونسلز ایکٹ نافذ کیا گیا۔ اس ایکٹ

---

(1) گوکھلے، گوپال کرشن(1866ء-1915ء) نے انیس برس کی عمر سے ہی عوامی بہبود کے کاموں میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ الفنسٹن کالج سے بی۔ اے کے بعد ایک تعلیمی سوسائٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔ اس سوسائٹی نے عام لوگوں میں تعلیم کی ترویج میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ 1899ء میں گوکھلے بمبئی کی قانون ساز اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ انھوں نے ساری زندگی اسی جدوجہد میں گزار دی کہ مثبت اقدام کرتے ہوئے وہ انگریزوں کو ہندوستان میں انتظامی اور معاشی اصلاحات نافذ کرنے پر مجبور کریں۔ان کا نعرہ تھا کہ "انگریز مقامی لوگوں کو نمائندگی دیے بغیر ان پر ٹیکس نہیں لگا سکتے۔"

(2) بال گنگا دھر تلک(1856ء-1920ء) کے والد ایک استاد تھے اور انھی سے تلک نے انگریزی اور سنسکرت کی تعلیم شروع کی۔ دس برس کی عمر میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ بعد ازاں تلک نے بی۔ اے پاس کیا اور قانون کی ڈگری حاصل کی مگر حکومتی ملازمت میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ 1890ء تک وہ گوکھلے کی تعلیمی سوسائٹی سے بھی منسلک رہے۔

بعد میں یک مراٹھی رسالے 'کیسری' کی شاعت کا کام سنبھالا اور عوام میں شعور پیدا کرنے کے لیے اس میں مضامین لکھنا شروع کر دیے۔ آہستہ آہستہ تلک کے نظریات کا عام لوگوں پر بڑا اثر ہوا۔ تلک نے مرٹھی قوم پرستی کو تقویت دینے کے لیے گنیش کی پوجا کا احیا کیا اور مرہٹوں کے ایک رہنما شیواجی کو قومی ہیرو کے طور پر پیش کرن شروع کر دیے۔ گنیش کی پوجا کی تقریب کو مسلمانوں کے خلاف جذبات ابھارنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ اس تقریب کو بالکل محرم کے جلوس کی صورت میں ترتیب دیا جاتا تھا۔ شیواجی، مغل بادشاہ ورنگ زیب کا ہم عصر تھا اور ان دونوں کے درمیان ایک عرصہ تک مخاصمت چلتی رہی تھی۔ ۔۔۱جی کو بطور ہیرو پیش کرنے کا مقصد بھی مسلم دشمن جذبات کی اشاعت کرنا تھا۔

میں مقامی لوگوں کی حکومتی معاملات میں شمولیت ایک قدم اور بڑھ گئی۔ اس ایکٹ کی اہم شقیں یہ ہیں:۔

1- گورنر جنرل کی انتظامی کونسل کے زائد اراکین کی تعداد میں اضافہ کر دیا گیا۔ کونسل کے ممبروں کی تعداد کم از کم دس اور زیادہ سے زیادہ بیس مقرر کر دی گئی۔

2- صوبائی کونسلوں کے ارکان کی تعداد بڑھا کر آٹھ سے بیس کے درمیان کر دی گئی۔

3- صوبہ بنگال کے ممبروں کی تعداد بیس معین کر دی گئی۔

4- غیر سرکاری ممبران کی تعداد میں اضافہ کر دیا گیا۔

5- کونسل کے اراکین کی تعداد میں اضافہ کر دیا گیا اور ان کے حقوق و فرائض کا دائرہ بھی بڑھا دیا گیا۔ اب وہ کچھ پابندیوں کے ساتھ بجٹ پر بحث کر سکتے تھے۔ 1861ء کے ایکٹ میں ان کو سوال پوچھنے کی اجازت نہ تھی۔ تاہم اس ایکٹ میں وہ ضمنی سوال نہ پوچھ سکتے تھے۔

ہندوستان میں سیاسی عمل

(مسلمانوں کا ردِّ عمل)

ہندوستان میں انگریزوں کے ایمأ پر شروع کیا جانے والا سیاسی عمل آئینی اصلاحات میں پیش رفت کی صورت میں ظاہر ہوا۔ دوسری طرف انگریزوں کے ہی زیرِ اثر قائم کی جانے والی 'قومی جماعت' کانگرس اپنے ابتدائی نظریاتی سے ہٹ کر ایک ہندو جماعت میں بدل گئی۔ یہ جماعت اپنے آپ کو ہندوستان میں بسنے والی تمام قومیتوں کے نمائندے کے طور پر حکومت سے مطالبات کر رہی تھی۔ حقیقت میں کانگرس کا مقصد ہندوستان میں ہندو راج قائم کرنا یا ہندوؤں کے مفادات کا تحفظ ہی تھا۔ اگر کانگرس کے نقطۂ نظر کی پذیرائی ہو جاتی تو اس کا مطلب مسلمانانِ ہندوستان کو انگریزوں اور ہندوؤں کی دوہری غلامی میں دھکیلنا تھا۔ کانگرس کے بنیادی مطالبات، انیسویں صدی کے اواخر تک یہ تھے:۔

1- مخلوط انتخابات

2- حکومتی اسامیوں پر قابلیت کی بنیاد تقرری

ان دونوں نکات پر اس دور کے ایک دوراندیش مسلمان رہنما، سرسید احمد خان نے بھرپور طریقے سے مسلمانوں کے مفادات کی ترجمانی کی۔ انتخابات کے بارے میں ان کا خیال تھا:۔

"مجھے پورا وثوق ہے کہ ہندوستان میں کوئی حصہ ابھی اس سطح پر نہیں آیا کہ یہاں نمائندگی کے نظام کو اس کی تمام تر وسعت کے ساتھ نافذ کیا جا سکے۔ یہاں تک کہ مقامی معاملات میں بھی اس کا نفاذ ممکن نہیں۔ ہندوستان اپنی ذات میں ایک براعظم ہے، جہاں ایک آبادی آباد ہے، جو مختلف نسلوں، فرقوں سے وابستہ ہے۔ مذہبی اداروں کی طاقت نے ہمسایوں کو بھی علحدہ علحدہ کر دیا ہے۔ ذات پات کا نظام آج بھی اپنی پوری طاقت اور اثر کے ساتھ رائج ہے... (یہاں) ایک گروہ تعداد کے اعتبار سے دوسرے سے بڑا ہو سکتا ہے۔ روشن دماغی کا معیار ایک گروہ میں بقیہ آبادی سے زیدہ ضرور ہو سکتا ہے۔ ایک گروہ مقامی بورڈز اور ضلعی کونسلوں میں نمائندگی حاصل کرنے کی اہمیت کو یقیناً بہت فعال سطح پر سمجھتا ہو گا اور بقایا تمام لوگ ایسے معاملات سے مکمل طور پر لاتعلق ہوں گے.... نمائندگی کا نظام بذریعہ انتخابات کا مطلب یہ ہے کہ اکثریتی آبادی کے خیالات اور مفادات کی نمائندگی (1) حاصل کرنا....'

(مسلمانوں کا روشن مستقبل ۔ طفیل منگلوری)

---

(1) بادشاہت کے دور میں ایک فرد (بادشاہ) اپنی مرضی، پسند ناپسند اور ذاتی غرض مندیوں کے حوالے سے حکومتی مسائل کو دیکھتا اور اقدام کرتا تھا۔ ایسے طرز حکومت میں عوامی مسائل اور بہبود کا کام کرنا محال ہوتا تھا۔ انیسویں صدی میں یورپ میں اہل دانش اور سیاسی رہنماؤں نے تخصیص کے ساتھ یہ سوچنا شروع کر دیا کہ کوئی ایسا سیاسی نظام استوار کیا جائے جس میں ممکنہ طور پر عوام کی رائے کو مرکزی حیثیت حاصل ہو۔ اس طرح حکومتی معاملات عوام کی

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

سرسید کے یہ خیالات ہندوستانی ماحول میں ایک حقیقت پسندانہ تجزیے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہندوستان میں اس دَور میں مسلمان آبادی کی تقسیم کے لحاظ سے ، مسلمان صرف اپنی اکثریت کے علاقوں میں ہی بہتر نشستیں حاصل کر سکتے تھے اور ان کی آبادی ہندوستان کی مجموعی آبادی میں زیادہ سے زیادہ $\frac{1}{5}$ حصّے پر مشتمل تھے۔ دوسری طرف ہندو اکثریتی علاقوں میں حالت یہ تھی کہ اگر وہاں مسلمانوں اور ہندوؤں کے نمائندے انتخاب لڑیں اور اگر مسلمان اپنے سارے ووٹ اپنے نمائندے کو دے دیں تو بھی ان کا نمائندہ ہندو اکثریت کے سامنے کامیاب نہ ہو سکتا تھا۔ اس طرح اگر نمائندگی کے سادہ اصول کو معیارِ انتخاب مقرر کر دیا جائے تو لامحالہ انتخابی اداروں میں ہندوؤں کی ہی اکثریت ہوگی اور ان اداروں میں مسلمانوں کا پرسانِ حال کوئی نہ ہوگا۔

سرسید احمد خان مسلمانوں کی سیاست میں شرکت کے قائل نہ تھے اور وہ مسلمانوں کو تعلیم حاصل کرنے کی ہدایت دے رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جب مسلمانوں میں زیادہ سے زیادہ لوگ پڑھے لکھے ہوں گے تو ان میں اپنی حیثیت کے بارے میں بہتر شعور پیدا ہو گا۔ بہتر شعور کی صورت میں کوئی جماعت اپنے سیاسی مفادات کے لیے نہیں بہکا نہ سکے گی۔ سرسیّد کے ایسے خیالات اور عام مسلمانوں کی کانگرس کی طرف عدم دلچسپی سے یہ بات عیاں ہوگئی کہ کانگرس محض ہندوؤں کی نمائندہ جماعت ہے جو اپنی قوم کے مفادات کے لیے سیاسی مہم جوئی میں مصروف تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وائسرائے ہند نے بھی کانگرس کو ایک SAFETY VALVE کہنا شروع کر دیا۔

ان تمام حالات میں سرسیّد ، مسلمانوں کے سیاسی مفادات سے بے خبر نہ تھے،

ضروریات اور خواہشات کے قریب تر لانا ممکن ہوں گے۔ اسی خیال سے عوامی نمائندگی کا تصور پیدا ہوا۔ نمائندگی کا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو یقیناً اپنی ایک رائے رکھتا ہے، اپنی رائے کا اظہار کرے اور حکومتی معاملات کے لیے بہتر لوگوں کو منتخب کرے۔ رائے کا اظہار ووٹ کی صورت میں کیاجاتا ہے۔ ووٹ دینا محض رسمی نہیں ہوتا بلکہ ایک شخص کی حکومتی معاملات کے طے کرنے میں ایک رائے کا درجہ رکھتا ہے۔ ہر فرد کی رائے سے اجتماعی سیاسی رائے بنتی ہے اور اس میں ایک شخص بھی اتنا ہی اہم ہوتا ہے جتنا کہ پورا نظام حکومت یا سیاسی نظام۔

وہ کانگرسی انداز سیاست کو بدستور غیر خوشگوار اور مسلم دشمن سمجھ رہے تھے اور اس سلسلے میں برملا اظہار بھی کر رہے تھے۔ فروری 1888ء میں آپ نے فرمایا:۔

"اگر ہمارے بنگالی دوست (جو کانگرس کے اہم کرتا دھرتا تھے) ایسے اقدامات کرنے پر مصر ہیں جن سے ہماری قوم کی بے عزتی مقصود ہو تو پھر ہمارا دوستانہ رویہ یقیناً بدل جائے گا۔ اپنی قوم کو کسی نقصان سے بچانا، یقین کیجیے ہمارا فرض ہوگا۔ اور اگر ہمارے بنگالی دوست اس بدحال قوم کو اپنے پاؤں تلے روندنا چاہتے ہیں تو ان کو اس بات کی ہرگز توقع نہیں کرنا چاہیے کہ ہم جھک جائیں گے۔ انھیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ہم اس رسی کی طرح ہیں، جو جل تو چکی ہے مگر اس کا بل ابھی تک باقی ہے۔ یہ رسی بالکل ٹھنڈی نہیں ہوگئی، اس میں ابھی گرمی باقی ہے۔ ان کو اسے احتیاط سے ہاتھ لگانا چاہیے، مبادا، ان کا ہاتھ جل جائے۔ کانگرس اصل میں بغیر ہتھیار کے ایک خانہ جنگی کی نمائندگی کر رہی ہے یہ خانہ جنگی حاکمیت کا فیصلہ کرے گی۔ کانگرس کا مقصد یہ ہے کہ برطانوی حکومت برائے نام رہ جائے اور داخلی طور پر تمام حکومت ان کے ہاتھ میں چلی جائے۔ وہ اس بات کا کھلے طور پر اظہار نہیں کرتے تاہم ان کو پتہ ہے کہ مسلمان، حکومت چلانے کے اہل نہیں ہیں، سو، اس طرح داخلی طور پر حکومت ان کے ہاتھوں چلی جائے گی۔"

(حیاتِ جاوید)

اس تقریر میں سرسید کی مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کے لیے شدید فکر مندی جھلکتی ہے مگر ساتھ ہی انھوں نے کانگرس کے عزائم کا بھی بھانڈا پھوڑ دیا ہے۔ اسی تناظر میں سرسید نے کانگرس کی سرگرمیوں کے اثر کو کم کرنے اور مسلمانوں کے نقطہ نظر کی اشاعت کے لیے 1888ء میں INDIAN PATRIOTIC ASSOCIATION قائم کی۔ علی گڑھ کے گزٹ میں اس کے مقاصد اس طرح بیان کیے گئے :۔

1- ممبران پارلیمنٹ، انگریزی رسائل اور برطانیہ میں اہم لوگوں کو ایسا مواد اور اطلاعات

فراہم کرنا ، جن سے کانگرس کے پیش کردہ نقطۂ نظر اور غلط اطلاعات کی نفی ہوتی ہو۔

2- ممبران پارلیمنٹ اور برطانیہ کے عوام کو کانگرس کے نقطۂ نظر اور مقاصد سے اختلاف رکھنے والے عام مسلمانوں ، ہندوؤں اور دوسری انجمنوں کے خیالات سے روشناس کروانا ۔

3- ہندوستان میں امن کی حفاظت اور برطانوی راج کو مضبوط کرنے کے لیے کوششیں کرنا۔ ہندوستانی عوام میں کانگرس اور اس کے حمایتیوں کی پیدا کردہ نفرت اور عدم اطمینان کو جو انگریزوں کے خلاف پیدا ہو چکا ہے، کو ختم کرنے کی کوشش کرنا۔

اِس انجمن کا بنیادی مقصد مسلمانوں میں عملی سیاست کو فروغ دینا نہ تھا بلکہ کانگرس کی سرگرمیوں سے پیدا شدہ حالات میں مسلمانوں پر متوقع منفی اثرات کو زائل کرنا تھا ۔

تجزیہ

1858ء میں ہندوستان میں جو سیاسی عمل شروع ہوا اس کی بنیاد عوامی نمائندگی کے تصوّر پر تھی۔ اگرچہ اس کے نفاذ کی صورتحال حد درجہ بنیادی اور کم اثر تھی تاہم ہندوستانیوں کے لیے یہ تجربہ بالکل نیا تھا۔ 1858ء سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کا انداز حکومت ، بادشاہوں کے دَور کی طرح تحکمانہ تھا اور ان دونوں ادوار میں عوامی نمائندگی کی کوئی حیثیت نہ تھی۔

1858ء میں برطانوی حکومت نے براہِ راست ہندوستان پر اپنی حکومت قائم کرنے کے ساتھ ہی یہاں کے نظام حکومت کو جدید پارلیمانی انداز دیا۔ مگر یہ نظام ان کے اپنے ملک میں رائج نظام سے بالکل مختلف تھا۔ پارلیمانی نظام میں عوامی بہبود اور نمائندگی کو مرکزیت حاصل ہوتی ہے مگر یہاں ہندوستان میں اس کی کیفیات محدود سطح پر سیاسی سرگرمیوں تک محدود رہیں۔ اِس نظام میں لوگوں کی بہبود اور خوشحالی کا عنصر بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ بلکہ اس نظام کو اس طرح سے نافذ کیا گیا تھا کہ عوام اور عوامی اداروں کا مکمل انحصار حکومت پر ہو جائے اور وہ اپنے طور پر کچھ نہ کر سکیں۔

ہندوستان میں سیاسی عمل کی ابتدا ، ہندوؤں کی قوم پرستی کی تحریکوں سے شروع

ہوئی اور اس کے خدوخال اور مقاصد ہندو دھرم کی نشاۃ ثانیہ اور اس کی بنیاد پر ہندو راج قائم کرنا تھا۔ اِس صورتحال میں دوسری اقوام اور ان کے مذاہب پر زک لگانے کی بھی سعی کی گئی۔ ایسی صورت میں ان قومیتوں میں تشخص کی تلاش کے لیے تاریخی ورثے اور مذہب نے مرکزی کردار ادا کیا۔ اِس کی واضح مثال سرسید کے سیاسی افکار کے ارتقاً سے لگائی جا سکتی ہے۔ وہ ابتدا میں پوری ہندوستانی قوم کی بات کرتے تھے مگر آہستہ آہستہ ہندوؤں کے مسلمانوں کی طرف رویے سے انھوں نے نہ صرف اپنے نظریات میں ترمیم کی بلکہ کلی طور پر مسلمانوں کے مفادات اور سیاسی تحفظات کی وکالت شروع کر دی۔ یہی وہ حالات تھے جب مسلمانوں میں اپنی حیثیت اور مستقبل کے کردار کے بارے میں ٹھوس آگہی پیدا ہوئی اور ن کے رہنماؤں نے مسلمانوں کی مختلف اسمبلیوں اور انتخابی اداروں میں علٰحدہ حیثیت کے تحفظ کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔

واقعاتی تسلسل

اے او ہیوم	——	(1829ء-1912ء)
انڈین نیشنل کانگرس کا قیام	——	1885ء
بونرجی	——	(1844ء-1906ء)
نوروجی	——	(1825ء-1910ء)
گوپال کرشن گوکھلے	——	(1866ء-1915ء)
بال گنگا دھر تلک	——	(1856ء-1920ء)
انڈین کونسلز ایکٹ	——	1861ء
انڈین پیٹریاٹک سوسائٹی کا قیام	——	1888ء

یاد دہانی کے لیے اہم نکات

* 1858ء کے بعد ہندوستان میں جو سیاسی عمل شروع ہوا، اس میں مسلمانوں کے سامنے سب سے اہم ترجیحات میں جداگانہ انتخابی حیثیت اور سرکاری ملازمتوں میں بھرتی کا طریق کار تھا۔

* برطانوی حکومت ہندوستان میں اپنی حکومت کو طول دینے کے لیے سیاسی اصلاحات کے عمل کو نہایت سست رکھنا چاہتی تھی۔
* ہندوستان میں برطانوی حکومت کے قیام سے عام آدمی پر معاشی بوجھ بڑھنے لگا اور اس سے لامحالہ سیاسی شعور میں بھی اضافہ ہوا۔ اِس تناظر میں حکومت نے مقامی لوگوں کی حکومت کے بارے میں سوچ اور رویے کو حکومت تک پہنچانے کے لیے کانگرس کے قیام کو سراہا۔
* کانگرس کے ابتدائی دَور میں بنگال کے نو تعلیم یافتہ نوجوانوں کا عمل دخل بڑھنے لگا اور بعد میں یہ انھی لوگوں کی جماعت بن کر رہ گئی۔
* کانگرس میں بنگالی نوجوانوں کی سرگرم شمولیت سے ان کا حکومت کی جانب رویّہ بدلنے لگا اور انھوں نے حکومت پر تنقید شروع کر دی۔ یہ بات حکومت کو پسند نہ آئی۔
* کانگرس نے آہستہ آہستہ مسلمانوں کے بارے میں اپنے نظریات کو بدل لیا اور اپنے مطالبات میں ان کے مفادات کو نقصان پہنچانے والی باتیں شامل کر لیں۔
* کانگرس اور عام ہندو تنظیموں کے رویّے میں تبدیلی کے بعد مسلمان رہنماؤں نے بھی اپنے نظریات کو تبدیل کیا۔ اس دور میں سر سیّد احمد خاں نے مرکزی کردار ادا کیا اور ہر مرحلے پر کانگرس کے پروپیگنڈہ کا جواب دیا۔ اِسی سلسلے میں انھوں نے مسلمانوں کے سیاسی مفادات کے تحفظ کے لیے ایک انجمن بھی قائم کی۔

غور و فکر کے لیے چند نکات

(الف)

1- ہندوستان میں 1858ء سے انیسویں صدی کے آخر تک کے سیاسی عمل میں برطانوی حکومت، ہندوؤں اور مسلمانوں کے مقاصد اور کوششوں کا تجزیہ کریں۔

2- سر سیّد احمد خاں نے مسلمانوں کے سیاسی مفادات کے تحفظ کے لیے کیا کیا اقدام کیے؟ اس سلسلے میں ان کی تقاریر کو بھی ملحوظ رکھیں۔

(ب) مختصر جواب دیں۔

1- مسلمان جداگانہ حق انتخاب کا مطالبہ کیوں کر رہے تھے؟

2- 1858ء کے بعد برطانوی حکومت کی ترجیحات کیا تھیں؟

3- 1861ء کے ایکٹ میں مقامی لوگوں کی نمائندگی کی صورتحال میں کس قدر تبدیلی ہوئی؟

4- انیسویں صدی عیسوی کے آخر تک عام ہندوستانی پر جو معاشی بوجھ بڑھ چکا تھا، اس کا ایک جائزہ پیش کریں؟

5- انڈین نیشنل کانگرس کے اساسی مقاصد کیا تھے؟

6- کانگرس کے ابتدائی اجلاسوں میں کس قسم کے خیالات کو پیش کیا گیا تھا؟

7- کانگرس کے نقطۂ نظر میں تبدیلی کے اہم محرکات کیا تھے؟

8- گوکھلے اور تلک کے نظریات میں کیا فرق تھا؟

9- 1892ء کے ایکٹ سے حکومت میں مقامی لوگوں کی نمائندگی کے تناسب میں کیا فرق پڑا؟

10- مخلوط انتخاب کے طریقے پر سرسید کے نظریات کا تجزیہ کریں؟

11- نمائندگی سے کیا مراد ہے؟ بادشاہت اور موجودہ دَور میں نمائندگی کی صورت حال کا تقابلی جائزہ پیش کریں؟

12- کانگرس کے نظریات کے بارے میں سرسید کے کیا تاثرات تھے؟

ج۔ ہاں یا نہیں میں جواب دیں ۔

i- مخلوط انتخابی طریقے سے مسلمانوں کی علحدہ حیثیت پر کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔

ii- برطانوی حکومت، ہندوستان میں سیاسی اصلاحات کے عمل کو تدریجاً نافذ کرنا چاہتی تھی۔

iii- کانگرس کے قیام کے چند سالوں کے بعد اس پر انگریزوں کے وفادار لوگوں کا قبضہ ہوگیا تھا۔

iv- بنگال کے نوجوان تعلیم یافتہ گروہ نے کانگرس کو ہندوستان کی تمام قومیتوں کا نمائندہ بنا دیا۔

v- گوپال کرشن گوکھلے ، ہندوستان میں آئینی بنیادوں پر حکومت خوداختیاری قائم کرنے کے حامی تھے۔

vi- بال گنگا دھر تلک نے ایسی علامتوں اور رسوم کو فروغ دیا، جس سے ہندوؤں میں مسلم دشمنی کی فضا پیدا ہو گئی۔

vii- سر سید احمد خاں نے ہندوستان میں مسلمانوں کو ایک علٰحدہ قوم کے طور پر پیش کیا۔

viii- سر سید نے کانگرس کی سرگرمیوں کو خانہ جنگی کے مترادف قرار دیا۔

6 مسلمانوں میں عملی سیاست میں حِصّہ لینے سے متعلق بیداری

سرسید کے انتقال (1898ء) تک مسلمانوں نے بحیثیت مجموعی ، عملی سیاست میں حصہ لینے سے اجتناب کیا۔ اس ضمن میں سرسید کے خیالات کا خاصا اثر رہا۔ سرسید نے مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ سیاست میں شرکت کی بجائے حصولِ تعلیم اور ایک قومی شعور کی استواری پر زور دیں۔ سرسید کی انھی کوششوں سے مسلمانوں میں نمایاں تبدیلیاں سامنے آرہی تھیں۔ مسلمانوں میں، تعلیم یافتہ لوگوں کا ایک گروہ پیدا ہو رہا تھا، جو مسلمانوں کے اجتماعی مفادات کے بارے میں نہ صرف سوچتا بلکہ ان کو بہتر طور پر حاصل کرنے کے لیے عملی کام بھی کرنے پر آمادہ تھا۔ انھی لوگوں کی کوششوں کی وجہ سے بہت سے مسلمان حکومتی اداروں میں اچھی نوکریاں حاصل کر رہے تھے۔ 1897ء تک سابقہ دور کے مقابلے میں سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب بہتر تھا۔ اس سال یوپی میں ڈپٹی کلکٹر یا ہندوستانی مجسٹریٹوں میں 94 مسلمان اور 116 ہندو تھے۔ اسی صوبے کے 22 چیف سول ججوں میں 8 مسلمان تھے۔ اگرچہ اِس زمانے میں دوسرے صوبوں میں مسلمانوں کی تعلیمی اور قومی شعور کی حالت بہتر نہ تھی تاہم ان میں ایک مثبت تبدیلی واضح طور پر نظر آرہی تھی۔

اسی عرصے میں جب مسلمان اپنے آپ کو تعلیمی طور پر بہتر بنانے میں مصروف تھے، ہندوستان میں ایسے واقعات رونما ہوئے جن سے مسلمانوں کی حیثیت ہل کر رہ گئی۔ ان واقعات میں ہندوؤں کے رویے نے مسلمانوں کو عملی اقدام پر مجبور کر دیا۔ ان میں اہم واقعات یہ تھے:۔

1- اردو ہندی تنازعہ

کوئی بھی زبان محض مافی الضمیر کے اظہار کا ایک ذریعہ ہی نہیں ہوتی بلکہ یہ اس کے بولنے والے گروہ کی تہذیب و ثقافت کی پہچان بن جاتی ہے۔ زبان ، اس قوم کی اجتماعی حسیات اور اندازِ فکر سے وابستہ ہوتی ہے۔ اِس کی مثال اِس طرح دی جا سکتی ہے کہ آپ اجنبی زبان جانتے ہوئے بھی ، اپنائیت کی گفتگو ہمیشہ اپنی زبان میں ہی پیش کرنے کو ترجیح دیں گے۔ اپنی زبان میں بولنے سے اپنی حیثیت اور اس کے بارے میں اپنے پن کے اظہار میں فطری صورتحال برقرار رہتی ہے۔

ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کی زبان فارسی تھی اور ان کے دَور میں حکومتی کاروبار اسی زبان میں ہی ہوتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مقامی زبانوں اور فارسی کے باہم ملاپ سے ایک نئی زبان پیدا ہوئی ، اس کو اردو کہا جاتا ہے۔ چونکہ اردو زبان ، مسلمان حکمرانوں کے دَور میں پلی بڑھی ، اس لیے اس کی شناخت مسلمانوں سے وابستہ ہوگئی۔ ویسے اردو ، پورے ہندوستان میں سمجھی اور بولی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ کمپنی کے دَور میں (1835ء) اردو کو سرکاری زبان تسلیم کر لیا گیا۔

ہندوستان میں جب ہندوؤں نے فرقہ وارانہ تعصبات کی فضا پیدا کر دی تو اس میں مسلمانوں کے تمام اداروں پر بھی اعتراضات اٹھائے گئے۔ اس ضمن میں ہندوؤں نے اردو زبان کے خلاف بھی محض اس لیے ایک مہم شروع کر دی کیونکہ اس کی ابتدا اور ارتقأ مسلمانوں سے وابستہ تھا۔ 1867ء میں بنارس کے ہندوؤں نے سرکاری دفاتر اور عدالتوں میں اردو کی بجائے بھاشا زبان اور دیوناگری رسم الخط کو لاگو کرنے کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ زبان کے مسئلے پر دونوں اقوام میں توازن بگڑنے لگا۔ ہر دو اقوام اپنی اپنی زبانوں کو اپنی سیاسی حیثیت اور تشخص کے ناطے عزیز جانتی تھیں، اور اس ضمن میں دونوں اقوام نے لسانی تحفظ کی تنظیمیں بنائیں۔

1871ء میں بہار کے ہندوؤں نے اردو کے خلاف مہم شروع کر دی۔ انھوں نے یہاں کے انگریز گورنر کو مشورہ دیا کہ اردو کو غیر ملکی زبان تسلیم کر لیا جائے، کیونکہ زیادہ تر آبادی اس کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ اس مشورے کو تسلیم کرتے ہوئے، گورنر نے

نہ صرف اردو زبان کی مذمت کی بلکہ اسے محکمہ تعلیم کے نصاب سے بھی خارج کرنے کا حکم دے دیا۔

1882ء میں اردو زبان کے خلاف ہندوستان کے شمالی مغربی اضلاع میں ایک مہم شروع کی گئی۔ 1898ء میں یوپی کے گورنر کو ہندوؤں کی طرف سے بہت سی قراردادیں بھجوائی گئیں، جن میں اردو کی بجائے ہندی کو رائج کرنے کا مشورہ دیا گیا تھا۔ 1900ء میں حکومت یوپی نے ایک قرارداد کے تحت دیوناگری میں لکھی درخواستوں اور عدالتی کارروائی کو قبول کرنے کی منظوری دے دی۔ اس حکم کے تحت عدالتی سمن اور حکومتی اعلانات کو اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس فیصلے پر مسلمانوں کو بہت افسوس ہوا اور دونوں اقوام میں مخاصمت کی فضا پیدا ہو گئی۔

انیسویں صدی کے آخری حصے میں مسلمانان ہندوستان کسی بھی مسئلے کی صورت میں علی گڑھ کالج سے رجوع کرتے تھے۔ علی گڑھ کالج کو محض ایک تعلیمی ادارہ نہیں بلکہ مسلمانوں کے پاسبان کی حیثیت حاصل تھی۔ زبان کے مسئلہ پر بھی علی گڑھ کے رہنماؤں نے اہم کردار ادا کیا۔ اس وقت سرسید احمد خان کا انتقال ہو چکا تھا اور ان کی جگہ پر، علی گڑھ کالج کے اعزازی سیکرٹری نواب محسن الملک (1) نے یہ کام نبھایا۔

نواب محسن الملک نے علی گڑھ میں یک جلسۂ عام منعقد کیا اور اردو کی حفاظت کے لیے ایک انجمن قائم کی۔ اس جلسے میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہندو دشمنی کا تاثر دیے بغیر حکومت یوپی کو مسلمانوں کے خیالات اور جذبات سے آگاہ کیا جائے۔ اس اقدام پر بھی صوبے کا لیفٹیننٹ گورنر سخت ناراض ہوا۔ نواب محسن الملک نے اس ناراضگی کی پرواہ

---

(1) نواب محسن ملک کا اصل نام مہدی علی خان تھا۔ آپ 1837ء کو اوٹاوہ میں پیدا ہوئے۔ روایتی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کلکٹر کے دفتر میں دس روپے ماہوار پر نوکری شروع کی۔ بعد میں ترقی کرتے کرتے سررشتہ دار ہو گئے۔ اس کے بعد ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ 1874ء میں سرکاری ملازمت ترک کر کے ریاست حیدرآباد میں ملازمت اختیار کر لی اور 10 سال تک وہیں رہے۔ حیدرآباد کے نواب نے آپ کو 1884ء میں محسن الدولہ محسن الملک کا خطاب عطا کیا۔ 1893ء میں ریاستی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

کیے بغیر اس سال لکھنؤ میں ایک جلسہ منعقد کیا۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ جلسہ مسلمانوں کا پہلا سیاسی اجتماع تھا۔ اس جلسے میں نواب محسن الملک نے اس طرح تقریر کی۔

"اگرچہ ہمارے اختیار میں قلم نہیں ہیں اور ہمارے قلم اس قدر طاقتور نہیں —— یہی وجہ ہے کہ ہم سرکاری دفتر میں شاذ ہی نظر آتے ہیں۔ تاہم ہمیں تلوار پر اختیار کی طاقت ہے اور ہمارے دلوں میں ملکہ کا پیار بھرا پڑا ہے۔۰۰۰۰ ہم ایک لمحے کے لیے تصور نہیں کر سکتے کہ حکومت ہمیں نظرانداز کر کے چھوڑ دے گی یا ان چیزوں کی اجازت دے دے گی جن پر ہماری زندگی کا انحصار ہے اور جن کا ہمیں رنج ہوگا۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ حکومت ہماری زبان کو مرنے دے گی، یہ زندہ رہے گی! یہ کبھی ختم نہ ہوگی۔ تاہم اس بات میں کوئی شک نہیں کہ دوسری جانب سے اس ضمن میں جو کارروئیاں ہو رہی ہیں، ان سے مستقبل میں ہماری زبان کو

سرسید احمد خان کے مذہبی نظریات پر محسن الملک کو شدید اعتراض تھا اور انھوں نے یک مرتبہ اسی ضمن میں سخت نکتہ چینی پر مبنی ایک خط سرسید کو روانہ کر دیا۔ اس خط میں انھیں کافر اور مرتد بھی کہا گیا تھا۔ سرسید نے اس خط کا جواب بڑے تحمل اور بردباری سے دیا اور نہایت نرم الفاظ استعمال کیے۔ اس پر محسن الملک سرسید کے گرویدہ ہو گئے اور انھوں نے سرسید کے رسالے تہذیب الاخلاق میں باقاعدگی سے لکھنا شروع کر دیا۔

سرسید کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے سید محمود نے کالج کے سیکرٹری کی حیثیت سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد متفقہ طور پر محسن الملک کو کالج کا سیکرٹری مقرر کر دیا گیا۔ اُن دنوں کالج کے مالی حالات حد درجہ خراب تھے۔ یہاں ایک کلرک نے غبن کر لیا تھا اور کالج 50 ہزار روپے کا مقروض ہو چکا تھا۔ 1895ء میں یہاں طلبہ کی تعداد 565 تھی مگر سرسید کے انتقال کے فوراً بعد تعداد صرف 343 رہ گئی۔ ان حالات میں نواب محسن الملک نے اپنی ذاتی کوششوں سے کالج کی مالی حالت کو بہتر بنایا۔ قرضہ اتارنے کے بعد کالج کی آمدن ڈیڑھ لاکھ تک پہنچ گئی اور طلبہ کی تعداد 343 سے 789 تک جا پہنچی۔ محسن الملک نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اور بعد شملہ وفد میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ آپ کا انتقال اکتوبر 1907ء کو شملہ میں

نقصان ضرور پہنچے گا۔ ان اندیشوں کی بنا پر ہم نے یہ کوششیں شروع کی ہیں، تاکہ ہم اپنی زبان کو زندہ رکھ سکیں۔ اور اگر ہم ایسا نہیں کر سکتے تو (کم از کم) اس کا جنازہ جھوم کے نکال سکیں۔۔۔۔!!"

(مسلمانوں کا روشن مستقبل)

نواب محسن الملک کی اس تقریر سے گورنر بہت جزبز ہوا اور اس نے دھمکی دی کہ نواب ۔ ن الملک اردو کے تحفظ کے لیے سرگرمیوں سے قطع تعلق کر لیں وگرنہ علی گڑھ کالج کو دی جانے والی امداد بند کر دی جائے گی۔ نواب محسن الملک نے اس پر علی گڑھ کے اعزازی عہدے سے استعفیٰ دے دیا تاکہ علی گڑھ کالج کو مالی نقصان نہ ہو۔ حکومت نے انھیں 'محسن لملک' کا خطاب بھی استعمال کرنے کی ممانعت کر دی۔

نواب محسن الملک کے استعفیٰ سے مسلمانانِ ہندوستان میں شدید بے چینی پھیل گئی۔ مختلف اخبارات اور تنظیموں کی طرف سے نواب محسن الملک پر استعفیٰ واپس لینے کا دباؤ ڈالا گیا ۔ 1902ء میں نواب محسن الملک نے یہ عہدہ دوبارہ قبول کر لیا۔

تقسیمِ بنگال

اردو ، ہندی تنازعے کے بعد جس واقعے نے مسلمانوں میں اپنی سیاسی حیثیت کے بارے میں آگہی پیدا کی وہ تقسیم بنگال کا معاملہ تھا۔ 1905ء میں برطانوی حکومت نے صوبہ بنگال (1) کو مشرقی ،ور مغربی بنگال کے دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ مغربی بنگال کا صدر مقام حسبِ سابق کلکتہ ہی رہا ور نئے صوبے مشرقی بنگال کا صدر مقام ڈھاکہ کو قرار دیا گیا۔ اس کی کل آبادی تین کروڑ 10 لاکھ نفوس پر مشتمل تھی۔ اس آبادی میں سے ایک کروڑ 80 لاکھ مسلمان اور ایک کروڑ 20 لاکھ ہندو تھے۔ مغربی بنگال میں

---

(1) انیسویں صدی کے وسط میں بنگال کا صوبہ بہار ، اڑیسہ ، آسام اور بنگال کے علاقہ جات پر مشتمل تھا۔ 1874ء میں آسام اور سلہٹ کے علاقوں کو علٰحدہ اضلاع بنا دیا گیا ۔ اب بھی بنگال کا صوبہ وسیع علاقے پر محیط تھا۔ کلکتہ اس کا صدر مقام تھا اور یہاں ایک لیفٹیننٹ گورنر انتظامی سربراہ ہوتا تھا۔ صوبے کا کل رقبہ یک لاکھ 90 ہزار مربع میل (3 لاکھ دو ہزار چار سو مربع کلومیٹر) اور آبادی تقریباً آٹھ کروڑ نفوس پر مشتمل تھی۔ اس صوبے سے کل مالیہ 11 کروڑ

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

ہندوؤں کی تعداد 4 کروڑ 20 لاکھ اور جہاں مسلمانوں کی تعداد صرف 90 لاکھ تھی۔ بقایا آبادی دوسری اقوام پر مبنی تھی۔ نئے صوبے میں ایک قانون اسمبلی اور ایک علحدہ بورڈ آف ریونیو کا قیام بھی عمل میں لایا گیا۔ اس تقسیم کے فوری طور پر یہ فوائد سامنے آئے۔

حکومت برطانیہ کو اپنے معاشی فوائد کے سلسلے میں چائے اور پٹ سن کے پیداواری علاقوں (ماسوائے دار جلنگ) کی انتظامی حالت بہتر بنانے کا موقع ملا۔ یہ علاقے متحدہ بنگال میں انتظامی طور پر نظرانداز ہو رہے تھے۔ یہاں نقل و حمل کے نظام کو بہتر بنایا گیا۔

نئے صوبے کی اہم بندرگاہ چٹاگانگ تھی اور یہ بھی متحدہ بنگال کے زمانے میں نظرانداز ہی رہی تھی۔ اس کا صنعتی مراکز سے رابطہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ اِس کے مقابلے میں متحدہ بنگال کی بندرگاہ کلکتہ کے اردگرد ہی تجارتی مراکز اور صنعتی علاقے تعمیر ہو رہے تھے۔ چٹاگانگ کی بندرگاہ کو بہتر بنانے کی صورت میں تجارتی مال کی ترسیل میں آسانی ہو گئی تھی۔

مجموعی طور پر ، متحدہ بنگال کے زمانے میں اہم شہروں اور صنعتی مراکز کے علاقے نظرانداز ہو رہے تھے۔ اس کی مثال ڈاک کی ترسیل کے نظام سے دی جا سکتی ہے۔ اگر کلکتہ میں ایک شام کو کوئی خط حوالۂ ڈاک کیا جاتا تو یہ خط بنارس (کلکتہ سے 471 میل) میں اگلے دن صبح 9-15 بجے موصول ہو جاتا تھا۔ یہی خط الٰہ آباد (کلکتہ سے 564 میل دور) میں اگلے دن دوپہر ایک بجے موصول ہو جاتا تھا۔ ڈھاکہ (کلکتہ سے 264 میل دور) میں اگلے روز 12 بجے دوپہر وصول ہو جاتا تھا۔ مگر یہی خط تیسرے دن کو صبح

---

40 لاکھ روپے وصول ہوتا تھا۔ اتنے بڑے صوبے کا انتظام بہتر طور پر انجام دینا خاصا دشوار تھا۔

صوبہ بنگال میں اڑیسہ کے لوگوں کی خواہش تھی کہ ان کے علاقے کو علحدہ صوبے کا درجہ دے دیا جائے۔ اس طرح کے مسائل کے روشنی میں 1902ءکو وائسرائے ہند لارڈ کرزن نے سیکرٹری آف سٹیٹ کو بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا مشورہ دیا۔ اِس تقسیم کا مقصد انتظامی حالات کو بہتر بنانا تھا۔ چنانچہ 1905 ء میں بنگال کو تقسیم کر دیا گیا۔

کو چٹاگانگ (کلکتہ سے 330 میل دور) پہنچتا تھا۔ کلکتے سے چٹاگانگ کا فاصلہ کم ہونے کے باوجود ایک دن لیٹ پہنچتا تھا۔ اس مثال سے مشرقی بنگال میں رسل و رسائل کے نظام کے نظرانداز رہنے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

یہی حال انتظامی امور کا تھا۔ مشرقی بنگال کے اہلکاروں کو بہار اور اڑیسہ کے اہلکاروں کے مقابلے میں کمتر درجے کے ملازمتی سکیل دیے جاتے تھے اور پھر یہاں کام کے مقابلے میں ان کی تعداد بھی کم تھی۔ اس سے ہر اہلکار پر کام کا بوجھ بھی زیادہ تھا۔

بنگال کی انتظامی بنیادوں پر تقسیم حکومت برطانیہ کا استعماری مسئلہ بھی تھا، کیونکہ اس طرح کے نظام میں انتظامی معاملات میں تھوڑی سی چُوک ایک بہت بڑی غلطی ثابت ہو سکتی ہے۔

مسلمانانِ ہند کا نقطۂ نظر :

بنگال کی تقسیم سے مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ہندوؤں کے مقابلے میں بہتر ہوگیا۔ واضح رہے کہ متحدہ بنگال میں مسلمانوں کی حیثیت ایک اقلیت کی تھی۔ مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت اور یہاں ایک علٰحدہ قانون ساز اسمبلی کے قیام سے مسلمانوں کی سیاسی حیثیت بہتر ہو سکتی تھی۔ متحدہ بنگال میں ایک اقلیت کی صورت میں ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔

مشرقی بنگال میں مسلمان کاشت کاروں کی اکثریت ہندو جاگیرداروں کی زمینوں پر کام کرتی تھی۔ ہندو جاگیرداروں کا اِن کی جانب روّیہ حد درجہ ظالمانہ تھا۔ علٰحدہ سیاسی حیثیت قائم ہونے کی صورت میں ان کاشت کاروں کے تحفظ کے لیے اصلاحات نافذ کی جا سکتی تھیں۔ اس سے پہلے کی جانے والی اصلاحات ہندو جاگیرداروں کی مزاحمت کے باعث نافذ نہ کی جا سکی تھی۔

متحدہ بنگال میں تجارت اور معاشی وسائل کا محور کلکتہ کے گردونواح تک محدود تھا۔ ان علاقوں میں کئی کارخانے ایسے بھی تھے، جن کے لیے خام مال مشرقی بنگال سے آتا تھا، اس میں پٹ سن خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اگر یہ علاقے پٹ سن کے

پیداواری علاقوں میں ہی لگا دیے جاتے تو ، اِن علاقوں میں زیادہ روزگار کے مواقع پیدا ہو سکتے تھے۔ معاشی مراکز کی اس تبدیلی سے ہندو تاجروں کی اجارہ داری میں بھی کمی ہو سکتی تھی۔ علٰحدہ انتظامی اکائی کے قیام سے مشرقی بنگال کے انتظامی اداروں میں بھی مقامی مسلمانوں کو بہتر روزگار ملنے کے امکانات ہو سکتے تھے۔

بنگالی ہندوؤں کا نقطۂ نظر :

ہندوستان میں قوم پرستی کی ہندو تحریکات کا آغاز ، کلکتے سے ہوا۔ اِسی علاقے کے لوگوں نے سب سے پہلے جدید تعلیم حاصل کی اور کمپنی اور برطانوی راج کے دَور میں قابلِ اعتماد اہلکاروں کی حیثیت سے کام کیا ۔ بیسویں صدی کے آغاز تک ہندو بنگالی شہریوں میں ایک سیاسی شعور بھی اجاگر ہو چکا تھا اور وہ کانگرس کے پلیٹ فارم سے اہم سیاسی سرگرمیوں کا آغاز کر چکے تھے۔ تاہم ان سرگرمیوں کی حیثیت بحث مباحثے اور قراردادیں پاس کرنے تک ہی محدود تھیں۔

تقسیم بنگال سے ، کلکتہ اور اس کے ردگرد بسنے والے تاجروں ، صنعت کاروں ، وکیلوں ، اخبارات کے مالکان اور ہندوؤں کے دوسرے اجارہ دار گروہوں پر براہِ راست اثر ہوا۔ ان تمام لوگوں کے معاش پر اس تقسیم سے اہم اثرات مرتب ہو سکتے تھے۔ کلکتہ کے تاجر اور صنعت کار متحدہ بنگال میں مشرقی بنگال کے علاقوں کے وسائل کو بلا کسی روک ٹوک کے استعمال کر رہے تھے۔ تقسیم کی صورت میں معاشی مرکزیت اور اجارہ داری ختم ہو سکتی تھی۔ کلکتہ ہائی کورٹ کے وکیلوں کو خدشہ تھا کہ مشرقی بنگال میں نئی ہائی کورٹ کے قیام سے ان کے موکلین کی تعداد کم ہو جائے گی۔ اخباروں کے مالکان ، جن کی اکثریت ہندو تھی کو خدشہ لاحق تھا کہ نئے صوبے میں نئے اخبارات نکلیں گے تو ان کے اخباروں کی اشاعت ناگزیر طور پر متاثر ہو گی۔ عام ہندو بنگالیوں نے محسوس کرنا شروع کر دیا کہ متحدہ بنگال میں ان کی واضح اکثریت تھی۔ اب نیا صوبہ بن جانے سے مشرقی بنگال میں ان کی اکثریت اقلیت میں بدل جائے گی۔

1903 ء میں بنگال کی تقسیم کی ابتدائی پلان کے اعلان کے ساتھ ہی ہندوؤں نے اس کی مخالفت شروع کر دی تھی۔ ابتدائی پلان کے اعلان سے لے کر تقسیم بنگال کے

باقاعدہ اعلان تک متحدہ بنگال میں ہندوؤں نے 2 ہزار جلسے کیے۔ حکومت نے ان جلسوں پر کسی قسم کی روک ٹوک نہ کی۔ اس سے بنگال کے ہندوؤں میں تقسیم بنگال کے خلاف ایک تحریک نے جنم لے لیا۔

تقسیم کے باقاعدہ اعلان کے بعد بنگالی ہندوؤں نے حکومت کے خلاف ایک تحریک شروع کر دی ۔ اس میں انگریزی مال کا بائیکاٹ اور مقامی چیزوں کے استعمال کی تحریک اہم تھی۔ تحریک میں انتہا پسند ہندوؤں کا غلبہ ہو رہا تھا اور اس کی قیادت بال گنگا دھر تلک کے پاس تھی۔

دسمبر 1905ء میں ہندوستان میں لارڈ منٹو وائسرائے بن کر آیا اور سیکرٹری آف سٹیٹ لارڈ مورلے بن گیا۔ وائسرائے نے اعتدال پسند ہندوؤں کا اعتماد حاصل کرنے کی سعی کی۔ سیکرٹری آف سٹیٹ مورلے کانگرس کے بارے میں اچھا تاثر نہ رکھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کانگرس میں صرف اعتدال پسند ہندوؤں کا اعتماد حاصل کر لیا جائے اور تلک اور دوسرے انتہا پسند ہندوؤں سے سختی سے نمٹ جائے۔ 1906ء کے اوائل میں احتجاج اور پروپیگنڈے کے لیے منعقد کیے جانے والے تمام جلسوں کے انعقاد پر پابندی لگا دی گئی۔

حکومت کی پابندیوں سے انتہا پسند ہندوؤں کی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا اور یہ لوگ عوام میں مقبولیت حاصل کرنے لگے۔ اِس سے حکومت کے خلاف تحریکوں میں منظم طور پر شدت آگئی ۔ اِن تحاریک کے مقاصد یہ تھے:۔

1- ہندوؤں کو منظم کیا جائے اور ان میں قوم پرستی کے جذبات اور فکر کو ٹھوس بنیادوں پر اجاگر کیا جائے۔

2- منظم سرگرمیوں سے حکومت برطانیہ پر دباؤ ڈال جائے کہ وہ تقسیم بنگال کو منسوخ کر دے۔

3- اقتصادی سطح پر برطانوی مال کا بائیکاٹ کر کے ، حکومت پر معاشی دباؤ بڑھایا جائے۔

سودیشی تحریک :

1904ء کے وسط میں بنگال کے اہم ہندو رہنماؤں نے ایک انجمن قائم کی۔ اِس

کا مقصد بنگال کے ہندوؤں کو یہ احساس دلانا تھا کہ وہ ہندوستانی مسائل کے بارے میں ذمے دارانہ رویّہ اختیار کریں اور سیاسی معاملات میں زیادہ سے زیادہ حصّہ لیں۔ اس کا مقصد درحقیقت آہستہ آہستہ دوسری اقوام کو قومی معاملات سے الگ کرنا تھا۔ اس انجمن نے انگریزی طرزِ معاشرت اور زبان وغیرہ کو ترک کرنے کا مشورہ دیا اور مقامی معاشرت اور زبان و ادب کے فروغ کی سرپرستی شروع کر دی۔ یہ تمام معاملات اپنے ملک (سودیش) پر انحصار کرنے کی طرف جاتے تھے۔

تقسیمِ بنگال کے بعد اس انجمن نے سودیشی خیالات کو عملی شکل دینے کی کوششیں شروع کر دیں ۔ اس تحریک میں بہت سے مقامی صنعت کاروں نے بھی بھرپور تعاون کیا۔

تحریک نے مقامی صنعتوں کے فروغ کے لیے ، غیر ملکی خصوصاً انگریزی مصنوعات کے استعمال کی ممانعت کر دی۔ یہ تحریک عوام میں بے حد مقبول ہوئی۔ لوگوں نے غیر ملکی کپڑے، سگریٹ اور دوسری اشیا کا بائیکاٹ کر دیا۔ تحریک کا لوگوں پر اِس قدر اثر تھا کہ مذہبی رہنماؤں نے اس شخص کے لیے پرارتھنا (دعا کرنا) بند کر دی، جس نے غیر ملکی لباس پہنا ہوتا تھا۔ ڈاکٹروں ، وکیلوں اور اساتذہ نے اس شخص کی خدمت کرنا ترک کر دیا جو اِس تحریک میں شامل نہ ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ عام مزدوروں ، حجاموں اور دھوبیوں تک نے اس تحریک میں نہ شامل ہونے والوں کے لیے کام کرنا ترک کر دیا۔ اس تحریک کی مقبولیت میں مندروں کے پجاریوں اور سادھوؤں نے اہم کردار ادا کیا۔ کالی دیوی کے مندر ، اس تحریک کے اہم مراکز بن گئے۔ سکولوں اور کالجوں کے بچوں نے رضاکارانہ تنظیمیں بنا کر اِس تحریک کو آگے بڑھایا۔

اس تحریک سے انگریزی مصنوعات خاص طور پر کپڑے کی فروخت پر بڑا بُرا اثر پڑا۔ انگریزی کپڑے کی تجارت میں ہندوستان میں مارواڑی لوگ زیادہ تر شامل تھے۔ ان لوگوں کو اس تحریک سے بڑا دھچکا لگا ۔ بنگال کے صرف آٹھ اضلاع میں 1904ء میں 77,000 روپے کا برطانوی کپڑا فروخت ہوا تھا جو 1905 ء میں گھٹ کر صرف 10,000 روپے تک آگیا۔

چونکہ تحریک نے برطانوی کپڑے کے بائیکاٹ کے ساتھ ساتھ مقامی کپڑے کے فروغ کی بھی سرپرستی کی تھی، اس لیے روایتی کپڑے کی صنعت کو ترقی ملی۔ نئے کارخانے کھلنے لگے۔ لوگوں کو روزگار ملنے لگا اور معیشت میں بہتر رجحانات سامنے آنے لگے۔ 1906ء تک احمد آباد اور بمبئی میں 22 کاٹن ملز قائم کی گئیں، پندرہ بنک کھلے جن میں 4۔ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری ہو رہی تھی۔ 6-1905ء میں مشرقی بنگال میں 11 کارخانے کھولے گئے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ہندو قوم پرستی کی بنیاد مذہبی احیأ پر تھی اور اس ضمن میں چلنے والی تمام تحریکات کا رُخ مسلم دشمنی پر منتج ہوتا تھا۔ بنگال کی تقسیم کے خلاف چلنے والی تحریک نے بھی آخر کار اپنا رُخ مسلمانوں کے خلاف کر دیا۔ تمام ہندو اخبارات نے مسلمانوں کے خلاف جذبات کو ابھارنا شروع کر دیا۔ اس دَور میں بنکم چندر چیٹر جی کے ناول 'آنند مٹھ' کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس ناول میں مسلمانوں کے خلاف ایک تحریک شروع کرنے کی کہانی درج تھی۔ مجموعی طور پر اس میں مسلمانوں کی تاریخ اور مذہب پر شدید اعتراضات کیے گئے۔ ان تمام سرگرمیوں سے مسلم دشمن فضا پیدا کر دی گئی اور اس کا اثر معصوم بچوں پر بھی پڑا۔ بنگال کے ایک سکول میں ہندو طلبہ نے مسلمان طلبہ کے ساتھ بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ اس پر کلاس کو دو حصّوں میں تقسیم کرنا پڑا۔

مسلم لیگ کا قیام

تقسیم بنگال تک مسلمانوں کی سرگرمیوں کا زیادہ تر زور داخلی امور تک محدود تھا۔ اس میں سرسید کے خیالات کے زیر اثر مسلمان تعلیمی ترقی پر زور دے رہے تھے۔ تقسیم بنگال پر بنگالی ہندوؤں اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں ہندو تنظیموں کے رویّے سے مسلمانوں کو سخت مایوسی ہوئی اور انھوں نے اپنے سیاسی مفادات کے تحفظ کے لیے سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا۔ اِس ضمن میں علی گڑھ کے فارغ التحصیل

نوجوانوں نے اہم کردار ادا کیا جو نئی تعلیم کے زیرِاثر مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کے لیے سخت پریشان تھے۔

1905ء میں حکومت برطانیہ نے ہندوستان میں نئی اصلاحات نافذ کرنے کا اعلان کیا۔ مسلمانوں میں ذی شعور لوگ آنے والی اصلاحات میں مسلمانوں کی ہندوؤں کے مقابل حیثیت کے بارے میں پریشان تھے کیونکہ کانگرس کے رویّے اور کردار سے وہ پہلے ہی مایوس ہو چکے تھے۔ ان حالات میں مسلمان رہنماؤں نے ایک علحدہ سیاسی جماعت کے قیام کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔

علحدہ سیاسی جماعت کے قیام کے سلسلے میں نواب محسن الملک نے اہم کردار ادا کیا۔ وہ 1906ء کے موسم گرما میں بمبئی میں تھے جہاں انھوں نے ایک اخبار میں سیکرٹری آف سٹیٹ جان مورلے کی پارلیمنٹ میں بجٹ تقریر کا متن پڑھا۔ اس میں ہندوستان میں متوقع اصلاحات پر بھی بات کی گئی تھی۔ نواب محسن الملک نے محسوس کیا کہ یہ وقت کسی بھی تنظیم کے قیام کے لیے سب سے مناسب ہوگا۔ انھوں نے علی گڑھ کالج کے پرنسپل مسٹر آرچ بولڈ کو شملے میں خط لکھا کہ وہ فوری طور پر وائسرائے سے ملاقات کا بندوبست کروائیں۔ وائسرائے سے ملاقات کا وقت ملنے کے بعد، نواب محسن الملک نے کوئی بھی وقت ضائع کیے بغیر وفد کی تشکیل کے لیے کام شروع کر دیا۔ وفد کی سربراہی کے لیے آغا خاں (1) سوم کا نام منتخب کیا گیا۔ وہ ان دنوں چین جا رہے تھے اور انھیں کولمبو میں رکنے کا کہا گیا۔

یکم اکتوبر 1906ء کو وفد نے شملہ میں لارڈ منٹو سے ملاقات کی۔ وفد نے یہ مطالبات پیش کیے۔

1- سر آغا خان (1877ء-1962ء) کراچی میں پیدا ہوئے۔ 1885ء کو والد کے انتقال کے بعد آپ اسمعیلیہ فرقے کے امام بنے۔ آپ ابتدا ہی سے رفاہی کاموں میں سرگرم تھے تاہم ان کی سرگرمیاں اپنے فرقے تک محدود تھیں۔ 1898ء میں نواب محسن الملک سے ملاقات کے بعد آپ نے ہندوستان میں مسلمانوں کی بہبود کے لیے دلچسپی لینا شروع کی۔ علی گڑھ کالج کی سرگرمیوں میں آپ خصوصی توجہ لیتے تھے۔ آپ نے اس کالج میں سائنس کی تعلیم کی ترقی کے لیے اہم خدمات

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

1- نیابت کا طریقہ کار ایسا ہونا چاہیے جس میں مسلمانوں کے لیے یہ حق ہو کہ وہ خاص حلقوں سے اپنے نمائندے منتخب کریں۔

2- مسلمانوں کو ان کی تاریخی اہمیت اور سیاسی حیثیت کے تناظر میں ان کی آبادی سے تناسب سے زیادہ نشستیں دی جائیں۔

3- ایک طے کردہ تناسب سے حکومتی ملازمتوں پر مسلمانوں کا تقرر کیا جائے۔ ہائی کورٹ کے ججوں، چیف کورٹ کے ججوں اور ایگزیکٹو کونسل کے ممبران کی حیثیت سے ان کا تقرر کیا جائے۔

4- یونیورسٹیوں کے سنڈیکیٹوں اور سینیٹوں میں مسلمانوں کے لیے نشستیں مخصوص کی جائیں۔

5- مسلم یونیورسٹی کے قیام کے لیے امداد دی جائے۔

ان مطالبات کا لارڈ منٹو نے غیر واضح جواب دیا۔ تاہم وفد کے اراکین نے اس کو حوصلہ افزا قرار دیا۔ لارڈ منٹو نے کہا:

"میں ایسی ہی پختگی سے اس کا قائل ہو گیا ہوں، جیسے مجھے یقین ہے کہ آپ قائل ہیں، کہ کوئی انتخابی نیابت، جو ان فرقوں کے عقائد اور ان کی روایات کو نظرانداز کر سکے، جن سے اس براعظم کی آبادی مرکب ہے، نفرادی حق رائے دہندگی کے مقصد کی منظوری کے لیے ہوگی، ایسی ناکامی پر منتج ہوگی جس سے فتنہ پیدا ہوگا۔"

(پاکستان ناگزیر تھا ص 52)
مصنفہ حسن ریاض

نجام دیں۔ آپ نے علی گڑھ کالج کے اساتذہ کی عملی تربیت کے لیے وظائف مقرر کیے۔ آپ نے علی گڑھ کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ 1908ء میں جب مسلم لیگ کے عہدیداروں کا انتخاب ہوا تو آپ کو مسلم لیگ کا مستقل صدر منتخب کر لیا گیا۔ آپ 1913ء تک مسلم لیگ کے صدر رہے۔ آپ گول میز کانفرنسوں کے پہلے دو اجلاسوں میں بھی شریک ہوئے۔ اس کے بعد آپ نے ہندوستان کی سیاست میں دلچسپی کم کر دی۔ آپ کو آپ کی وصیت کے مطابق مصر میں دفن کیا گیا۔

لارڈ منٹو نے اپنے جوابی کلمات کا اختتام اس طرح کیا:۔

"میں آپ سے بالکل متفق ہوں۔۔۔۔ میں آپ سے صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ مسلمان جماعت اس پر یقین کر سکتی ہے کہ کوئی جدید انتظامی تنظیم جس سے میرا تعلق ہوگا، اس میں ایک فرقے کی حیثیت سے ان کے سیاسی حقوق اور مفاد کا تحفظ کیا جائے گا اور یہ کہ آپ اور ہندوستان کے لوگ اس کے لیے برطانوی راج پر پورا اعتماد کریں کہ جس طرح ہمیشہ اس نے فخر کیا ہے، اس عظیم مخلوق کے مذہبی عقائد اور قومی روایات کا احترام کرے گا، جس پر ملک معظم کی سلطنت کی آبادی مشتمل ہے۔"

(ایضاً)

وائسرائے سے ملاقات کے بعد شملہ وفد کے اراکین نے مسلمانوں کے لیے علٰحدہ سیاسی جماعت کے قیام پر غور شروع کر دیا۔ 30- دسمبر 1906ء کو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرس کے ڈھاکہ میں منعقدہ اجلاس میں نواب وقار الملک (1) صدر جلسہ نے اس طرح خطاب کیا:۔

"جس مقصد کے لیے آج ہم مجتمع ہوئے ہیں وہ نیا نہیں ہے۔ یہ اسی روز پیدا ہوگیا تھا جب انڈین نیشنل کانگرس کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ یہاں تک کہ سر سید احمد خان مرحوم، جن کے مدبرانہ اور دوراندیشانہ پالیسی کے ہم ہمیشہ مرہونِ منت رہیں گے، کانگرس کی بڑھتی ہوئی طاقت سے ایسے

1- نواب وقار الملک کا اصل نام مشتاق حسین تھا۔ آپ 1841ء کو ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ چھ ماہ کی عمر میں والد کے انتقال کے بعد آپ کی پرورش آپ کی والدہ نے کی۔ آپ نے اپنی ملازمت کا آغاز نائب مدرس کی حیثیت سے کیا مگر کچھ ہی عرصے کے بعد یہ ملازمت ترک کر کے انکم ٹیکس کے محکمے میں محرر ہو گئے۔ بعد میں اس محکمے میں ترقی کر کے اعلیٰ عہدے تک پہنچ گئے۔ آپ سر سید کے ابتدائی ساتھیوں میں سے تھے، اور علی گڑھ تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ نواب محسن الملک کے انتقال کے بعد آپ علی گڑھ کالج کے اعزازی سیکرٹری بنے۔ آپ نے علی گڑھ یونیورسٹی کے قیام کے سلسلے میں اہم کام کیے۔ بعدازاں 1916ء میں ہی وفات تک آپ مسلمانان ہند کے لیے سرگرم عمل رہے۔

متاثر ہوئے کہ نھوں نے مسلمانوں کو یہ سمجھانے کے لیے دلیری سے کوشش کی کہ ان کی فلاح اور سلامتی اس میں ہے کہ کانگرس میں شرکت سے اجتناب کریں۔ یہ نصیحت ایسی صائب تھی کہ آج اگرچہ وہ ہم میں نہیں ہیں تاہم مسلمان اسی رائے پر مضبوطی سے قائم ہیں اور جتنا وقت گزرتا جارہا ہے، اس کی اہمیت نمایاں ہوتی جارہی ہے کہ مسلمانوں کو اپنے سیاسی حقوق کی حفاظت کی انتہائی کوشش کرنی چاہیے.... مسلمان ہندوستان میں اپنی دوسری ہمسایہ قوموں سے ایک خمس کے قریب ہیں اور اس لیے یہ ایک صاف مضمون ہے کہ اگر کسی وقت برٹش حکومت ہندوستان میں قائم نہ رہی تو اس وقت وہی قوم ملک پر حکمران ہوگی جو تعداد میں ہم سے چار حصے زیادہ ہے۔ ورا ب صاحبو، ہر ایک شخص کو چاہیے کہ اپنے دل میں اس بات پر غور کرے کہ اس وقت ہماری حالت یہ ہوگی کہ ہمارا مال، ہماری آبرو، ہمارا مذہب سب خطرے میں ہوگا۔ آج جب کہ برٹش کی زبردست سلطنت اپنی رعایا کی محافظ ہے، جس قسم کی مشکلات بسا اوقات ہم کو اپنے ہمسایہ دوستوں سے پیش آتی رہتی ہیں، اس کی نظائر کم و بیش ہر صوبے میں موجود ہیں تو وائے اس وقت پر جب ہم کو ان لوگوں کا محکوم ہو کر رہنا پڑے جو اورنگ زیب کا بدلہ صد ہا برس بعد آج ہم سے لینا چاہتے ہیں....

"البتہ ہمارا یہ فرض بھی ضرور ہے کہ جہاں تک ہمارا انفلوینس کام دے وہاں تک ہم اپنے دوستوں کو غلط راستے پر جانے سے روکیں اور بحیثیت ان کے ہمسایہ ہونے کے ان کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آویں اور اپنے حقوق و مقاصد کو ملحوظ رکھ کر سوشل طور پر ان کے ساتھ اپنی ہمدردی کو قائم رکھیں۔"

(بحوالہ تذکرہ وقار، پاکستان ناگزیر تھا۔ ص 54,53)

نواب وقار الملک کی تقریر کے بعد نواب سلیم اللہ (1) رئیس ڈھاکہ نے مندرجہ ذیل قرارداد پیش کی:۔

"قرار پایا کہ یہ جلسہ جو ہندوستان کے مختلف حصوں کے ان نمائندوں پر مشتمل ہے جو ڈھاکہ میں مجتمع ہوئے ہیں، یہ فیصلہ کرتا ہے کہ ایک سیاسی انجمن قائم کی جائے، جس کا نام آل انڈیا مسلم لیگ ہو اور جس کے اغراض و مقاصد یہ ہوں۔

(ا) ہندوستان کے مسلمانوں میں حکومتِ برطانیہ کی طرف سے وفاداری کے جذبات کو ترقی دینا اور کسی آئندہ تدبیر کی نسبت حکومت کے ارادوں کے متعلق اگر کوئی بدگمانی پیدا ہو تو اس کو رفع کرنا۔

(ب) مسلمانانِ ہند کے سیاسی حقوق اور مفاد کی حفاظت کرنا اور انہیں آگے بڑھانا اور ان کی ضروریات اور تمناؤں کی حکومت کے سامنے ادب سے ترجمانی اور نیابت کرنا۔

(ج) دوسری جماعتوں کے خلاف مسلمانوں میں جذبت عداوت کی نشوونما کا اس طریقے پر انسداد کرنا کہ لیگ کے مذکورہ اغراض و مقاصد کو ضرر نہ پہنچے۔ (ایضاً)

اس قرارداد کی حکیم اجمل خان، مولانا محمد علی اور مولنا ظفر علی خاں نے تائید کی۔ مسلم لیگ کا باقاعدہ پہلا اجلاس29-30 دسمبر 1907 ء کو کراچی میں منعقد ہوا۔ 1913 ء تک مسلم لیگ کا سیاسی نقطۂ نظر اور سرگرمیاں یکسانیت کا شکار رہیں۔

1- نواب سلیم اللہ (1871 ء-1915 ء) کا تعلق بنگال کے مسلمان امرا کے خاندان سے تھا۔ آپ کا خاندان اپنی غریب پروری اور رفاہی کاموں کے لیے بہت مشہور تھا۔ تقسیم بنگال کے بعد آپ نے سیاسی معاملات میں دلچسپی لینا شروع کر دی اور اس سلسلے میں محمڈن پروانشل یونین قائم کی۔ آپ نے مسلم لیگ کے قیام کے سلسلے میں اہم کردار ادا کیا۔ تقسیم بنگال کی تنسیخ (1911 ء) کے بعد آپ نے سیاسی امور میں دلچسپی کم کر دی اور زیادہ تر توجہ رفاہی اور سماجی کاموں پر دینے لگے۔

تجزیہ

ہندوستان میں سیاسی اداروں اور حکومتی معاملات میں عوامی شمولیت کی ابتدا برطانوی حکومت کے انتظام سنبھالنے کے بعد ہوئی۔ اِس سلسلے میں جیسے جیسے تعلیم پھیلتی گئی، سیاسی شعور بھی بڑھتا گیا۔ اس ضمن میں سب سے پہلے مراعات یافتہ طبقوں نے جدید تعلیم سے استفادہ کیا اور عملی سیاست میں حِصّہ لینے کی ابتدا کی ۔ اِن طبقوں میں پارسی ، مارواڑی اور خوجے شامل تھے اور ہندوستان میں برطانوی اقتدار کے لیے انھی لوگوں نے ایک بیس کیمپ (BASE CAMP) کا کام کیا تھا۔ چونکہ ہندوستان میں سیاسی عمل کو برطانوی حکومت ، محدود اور اپنے زیر کنٹرول رکھنا چاہتی تھی، اس لیے پارسی اور دوسری اقلیتی مالدار قومیتوں پر تکیہ کیا گیا۔ اس ضمنِ میں ہندوستان کی اکثریتی اقوام کو پس پشت ڈال دیا گیا۔

دوسری اقوام میں جدید تعلیم کا احساس اور اس کی ضرورت کا شعور بنگال کے ہندوؤں میں سب سے پہلے پیدا ہوا۔ یہاں کے اعلیٰ اور درمیانے طبقے کے لوگوں نے تعلیم حاصل کی اور اس شعور میں مختلف تحریکوں نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ ان میں قابلِ ذکر برھمو سماج اور دوسری تحریکیں شامل ہیں۔ یہ طبقہ اپنے مسائل کے حوالے سے ایک سیاسی شعور حاصل کر رہا تھا مگر ساتھ ہی ساتھ اپنی انفرادی حیثیت کے قیام کے لیے انھوں نے مسلمانوں کو اپنی تنقید کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ ایسی ہندو تحریکوں کی اساس ہندو مذہب کے احیاٗ پر تھی اور لامحالہ انھوں نے ہندوستان میں مذہبی طور پر عدم رواداری کی فضا کو آگے بڑھایا۔

بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں ہندوستان میں اقتصادی میدان میں درمیانے درجے کے صنعت کار ، تاجر اور نئے شعبہ جاتِ معاش پیدا ہو چکے تھے۔ ان نئے شعبہ جات میں وکالت ، صحافت ، کارخانے اور مزدوروں کی انجمنیں وغیرہ شامل تھیں۔ تقسیم بنگال کے موقع پر اگرچہ مسلمانوں کو سیاسی مفادات اور معاشی تحفظات میسّر آسکتے تھے مگر ہندوؤں کو یہ گوارا نہ تھا۔ بنگال میں موجود مختلف مفاد پرست گروہوں اور نوجوان تعلیم یافتہ گروہ کو سیاسی طاقت دکھانے کے لیے یہ ایک بہترین موقع مل گیا۔

انھوں نے پہلی مرتبہ اپنے سیاسی شعور کو ایک سیاسی تحریک کی شکل دی اور مختلف حربے استعمال کر کے ہندو عوام کی اکثریت کو اس میں شامل ہونے پر مجبور کر دیا۔ ہندوستان کی سابقہ تاریخ میں ایسی عوامی تحریک کی مثال پہلے کوئی نہ تھی جس میں کسی بھی حکومت کی پالیسیوں کے خلاف عوام نے اپنا ردِّعمل ظاہر کیا ہو۔

اس تحریک کا مقصد تقسیم بنگال کی تنسیخ کے لیے حکومت پر دباؤ ڈالنا تھا۔ مسلمانوں نے تقسیم بنگال کے لیے حکومت سے کوئی فرمائش نہ کی تھی، بلکہ حکومت نے محض انتظامی ضروریات کے تحت ایسا کیا تھا۔ تاہم یہ بات واضح تھی کہ اس تقسیم سے مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو اپنی معاشی اور سیاسی پوزیشن بہتر بنانے کا موقع مل سکتا تھا۔ واضح رہے کہ مغربی بنگال میں ہندو بدستور اکثریت میں تھے اور یہاں ان کے مفادات کو کسی قسم کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ مشرقی بنگال میں مسلمان اکثریت میں تھے اور ان کو ہندوؤں نے اپنے معاشی اور سیاسی شکنجے میں پھنسا رکھا تھا۔ اگر مشرقی بنگال علیحدہ ہو جاتا تو مسلمان ہندوؤں کے جبر سے آزاد ہو سکتے تھے مگر ہندوؤں میں مفاد پرست گروہوں، جن میں صنعت کار، تاجر، وکیل، اخبارات کے مالکان اور ساہوکاروں نے محض اپنے مفادات کی خاطر اس تقسیم کی مخالفت شروع کر دی۔ اس ضمن میں انھوں نے نوجوان ہندوؤں کی قوم پرستی کو مسلمان دشمن جذبات میں بدل دیا اور عوام میں سودیشی تحریک جو دراصل برطانیہ کے ساختہ مال کے خلاف تھی کو بھی مسلمان کے خلاف رخ دے دیا، حالانکہ تقسیم بنگال کے خلاف ہندوؤں کی تحریک اصولی طور پر، برطانیہ کی حکومت کے خلاف ہی ہونا چاہیے تھی۔

سرسید کے سیاسی نظریات اور ان کے ہندوستان میں قومیت کے بارے میں نظریے کے ارتقا سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ وہ ہندوؤں کے رویے سے حد درجہ مایوس ہو چکے تھے اور اس سلسلے میں ہندوؤں کے مسلم دشمنی کے خیالات کو رد کرنے کے لیے انھوں نے عملی اقدامات بھی شروع کر دیے تھے۔

انیسویں صدی کے آخر تک علی گڑھ کالج سے بہت سے نوجوان جدید شعور سے آراستہ مختلف شعبہ جاتِ زندگی میں آ رہے تھے۔ انھیں جگہ جگہ ہندوؤں کے اجتماعی مسلم

دشمن رویوں سے سابقہ پڑتا تھا۔ وہ اس بات کو بڑی شدت سے محسوس کر رہے تھے کہ کوئی سیاسی پلیٹ فارم ایسا ہو جس سے مسلمانوں کے سیاسی تحفظات کے لیے ہندوؤں کا مقابلہ کیا جا سکے اور برطانوی حکومت پر دباؤ ڈالا جا سکے۔ اِس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں لایا گیا۔

یاد دہانی

* انیسویں صدی کے اواخر تک مسلمانوں میں جدید تعلیم سے آراستہ ایک گروہ پیدا ہو چکا تھا۔ انھیں اہم سرکاری ملازمتوں میں بھی جگہ مل رہی تھی۔
* اردو ہندی تنازعہ اور تقسیم بنگال پر ہندوؤں کے رویّے سے مسلمانوں کو سخت مایوسی ہوئی۔
* نواب محسن الملک نے اردو زبان کے تحفظ کو مسلمانوں کے قومی تشخص کے لیے بنیادی مسئلہ قرار دیا۔
* تقسیم بنگال کا بنیادی مقصد ، بنگال کے انتظامی معاملات کو بہتر بنانا تھا۔ اس سے مشرقی بنگال کے مسلمانوں کی سیاسی اور اقتصادی حالت بہتر ہو سکتی تھی جو ہندو مفاد پرست گروہوں کو گوارا نہ تھی اور انھوں نے تقسیم بنگال کے خلاف تحریک شروع کر دی۔
* تقسیم بنگال کے موقع پر بنگال کے تعلیم یافتہ گروہ کو اپنی سیاسی طاقت کا عملی اظہار کرنے کا موقع مل گیا اور انھوں نے ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک عوامی تحریک شروع کروا دی۔
* مسلمانانِ ہندوستان پہلے ہی ہندوؤں کی سیاسی جماعتوں اور اداروں کے رویے سے مطمئن نہ تھے، تقسیم بنگال کے خلاف چلائی جانے والی تحریک کے بعد انھوں نے اپنی علیحدہ نمائندہ جماعت کے قیام کا سوچنا شروع کر دیا۔

غور و فکر کے لئے چند نکات

(الف)

1- ان حالات کا جائزہ لیں ، جن میں مسلمانان ہندوستان سیاست میں شمولیت اور اپنی علٰحدہ سیاسی جماعت کے قیام پر مجبور ہوئے؟

2- اردو ہندی تنازعہ اور تقسیم بنگال کے موقع پر ہندووں کے ردعمل کا تجزیہ کریں؟ تجزیہ کرتے وقت بنگالی نوجوانوں کے سیاسی شعور کے کردار کی بھی وضاحت کریں۔

(ب) مختصر جواب دیں:

1- اردو زبان ، مسلمانوں کے اجتماعی تشخص کی نمائندہ تھی، مختصر نوٹ لکھیں؟
2- اردو کے تحفظ کے سلسلے میں نواب محسن الملک کی خدمات کیا تھیں؟
3- برطانوی حکومت کیونکر بنگال کو تقسیم کرنا چاہتی تھی؟
4- تقسیم بنگال سے مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو کیا فوائد مل سکتے تھے؟
5- تقسیم بنگال پر ہندو مفاد پرست گروہوں کا کیا رویہ تھا، انھوں نے اس کے خلاف کیوں تحریک شروع کی؟
6- سودیشی تحریک کے کیا مقاصد تھے؟
7- مسلم لیگ کے قیام کے سلسلے میں مختلف مراحل کا جائزہ پیش کریں؟
8- مسلم لیگ کے قیام کے ابتدائی مقاصد کیا تھے؟

ج۔ ہاں یا نہیں میں جواب دیں:

I- 1897 ء تک شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیمی حالت کافی سدھر رہی تھی۔

II- کوئی بھی زبان ، اس کے بولنے والے گروہ کی تہذیب و ثقافت کی پہچان ہوتی ہے۔

III- تقسیم بنگال کے بعد مشرقی بنگال میں بدستور ہندوؤں کی کثریت رہی۔

IV- تقسیم بنگال سے پہلے ڈاک کا نظام پورے بنگال میں یکساں طور پر موثر تھا۔

V- سودیشی تحریک آہستہ آہستہ برطانیہ کی مخالفت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے خلاف ہوگئی۔

VI- مسلم لیگ کے قیام میں نواب محسن الملک نے مرکزی کردار ادا کیا۔

VII- شملہ وفد کے مطالبات کو لارڈ منٹو نے یکسر رد کر دیا۔

(د) نیچے ایک بیان کے ساتھ اس کی چند وجوہات دی گئی ہیں۔ یہ وجوہات اپنی جگہ پر درست ہیں تاہم ان میں کوئی ایک سب سے اہم اور بنیادی نوعیت کی ہے۔ ان تمام وجوہات پر کلاس میں بحث کریں اور سب سے بہتر پر ✓ کا نشان لگائیں۔

(1) تقسیمِ بنگال کے موقع پر ہندوؤں کی تحریک کا مقصد :

(ا) متحدہ بنگال پر اپنی سیاسی و اقتصادی اجارہ داری قائم کرنا تھا۔

(ب) مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی سیاسی اور اقتصادی حالت کو بہتر بننے سے روکنا تھا۔

(ج) اپنی سیاسی قوت کا مظاہرہ کرنا تھا۔

7

نئے سیاسی امکانات

(ہندو مسلم اتحاد کی طرف)

"ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنی تمام تر توجہ ایک مطمح نظر پر مرکوز کر دینی چاہیے کیونکہ آج کا ہندوستان نہ ہندوؤں کا ہے، نہ مسلمانوں کا ہے، نہ اینگلو انڈین کا ہے اور یورپین کا تو وہ ہے ہی نہیں، بلکہ وہ ہندوستان ہے جس میں سب شریک ہیں۔ اگر ماضی میں اس کے متعلق کوئی غلط فہمی تھی تو ہم کو چاہیے کہ اس کو بھول جائیں۔ مستقبل کا ہندوستان زیادہ طاقتور ہوگا، زیادہ شریف ہوگا، زیادہ عظیم ہوگا، زیادہ بلند اور روشن ہوگا جیسا نہ اشوک کے کمال عروج میں ہوا اور نہ اکبر کے۔"

(مطلوب الحسن سید، محمد علی جناح ص 81,80)

ایسے مفاہمانہ جذبات کا اظہار دسمبر 1913ء کو آل انڈیا کانگرس کے سالانہ اجلاس کراچی میں بھوپندر ناتھ باسو نے مسلم لیگ کی حکومت خود اختیاری کی قرارداد کے ردعمل کے طور پر کیا۔ یہ جذبات اور مسلمانوں اور ہندوؤں میں مفاہمت کی فضا بہت کم عرصہ کے لیے جاری رہی۔ تاہم اس دور کا مطالعہ دونوں اقوام کے سیاسی شعور اور ان کے انگریزی حکومت کے تئیں رویے میں تبدیلی کے لیے اہم تھا۔

اس مفاہمانہ فضا اور اس کے تحت کیے گئے اقدامات کو سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل محرکات کا جائزہ ضروری ہے۔

اگرچہ تقسیم بنگال کے پس منظر میں برطانوی حکومت کے پیش نظر اہم انتظامی مفادات تھے مگر اس کے خلاف بنگالی ہندوؤں کے سخت مزاحمتی رویے سے حکومت کو

سخت دھچکا لگا۔ اس تحریک سے برطانیہ کے اقتصادی مفادات کے ساتھ ساتھ اس کی سیاسی ساکھ کو سخت نقصان پہنچا۔ یہ تمام حالات وائسرائے لارڈ کرزن (1859ء-1905ء) کے دور میں ہوئے۔ حکومت نے فوری طور پر اس کی جگہ لارڈ منٹو (1845ء-1914ء) کو ہندوستان بھیجی تاکہ وہ برطانوی اقتدار کو جاری خلفشار سے نکال کر مضبوط بنیاد فراہم کرے۔

لارڈ منٹو، ہندوستان میں جاری احتجاجی تحاریک اور اس کے پس پردہ انتہا پسند ہندو عناصر کو برطانوی راج کے لیے سب سے بڑا خطرہ محسوس کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ لارڈ منٹو نے تلک جیسے متشدد سیاسی رہنماؤں کی بجائے گوکھلے جیسے آئینی عمل کے طرفدار رہنماؤں کی سرپرستی شروع کر دی۔ لارڈ منٹو نے بنگال کی مزاحمتی تحریکات جیسے رجحانات کو برطانوی راج کے خاتمے کے مترادف قرار دیا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر اس قسم کی تحریکات معمول بن گئیں تو برطانوی حکومت کو بہت جلد رخصت ہونا پڑے گا۔

صاف ظاہر ہے کہ کوئی بھی متشدد یا مزاحمتی تحریک، کسی گروہ کے مفادات کے حوالے سے پیدا ہوتی ہے اور انہی مفادات کے حصول کے لیے اپنی راہ کا تعین کرتی ہے۔ ہندوستان میں ایسی تحریکات کی وجہ خواہ کچھ بھی ہو، ان کا کسی نہ کسی طور رُخ حکومت کی جانب بھی ہوتا تھا۔ ایسی صورت میں حکومت پر دباؤ بڑھتا اور حکومت کو انتظامی مسائل کے ساتھ ساتھ اقتصادی بحران کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس جمہ صورتحال میں حکومت کے عمومی مقاصد میں رکاوٹ پڑ جاتی تھی۔

تقسیم بنگال کے سلسلے میں تحریک سے مقامی لوگوں اور مؤثر گروہوں میں مزاحمتی تحریک چلانے کی اہلیت کی واضح نشاندہی ہوتی تھی۔ حکومت نے مختلف متحرک گروہوں کے اس طرح کے سیاسی طریقۂ کار کو بدلنے کے لیے، ان کی بجائے اعتدال پسند گروہوں کی سرپرستی اور سیاست سے مزاحمتی عناصر نکالنے کے لیے آئینی اور سیاسی عمل کو آگے بڑھانے کی کوشش شروع کر دی۔ اس سے حکومت برطانیہ کو ہندوستان میں زیادہ عرصے تک قائم رکھنا ممکن تھا۔

لارڈ منٹو کے انہی خیالات کے زیر اثر ہندوؤں اور مسلمانوں میں اعتدال پسند

رہنماؤں نے آگے بڑھنا شروع کیا۔ مسلمانوں کا شملہ وفد اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔

لارڈ منٹو حقیقت میں نہ تو ہندوؤں کا ہمدرد تھا اور نہ ہی مسلمانوں سے مخلص تھا — اس کا اصل مقصد ہندوستان میں انتہا پسندی کی سیاست کی بیخ کنی کر کے، اعتدال پسندانہ سیاست کو فروغ دینا تھا۔ اس اعتدال پسندی میں آئینی عمل کو ہی سیاست کا مرکز سمجھنا اور آئینی بنیادوں پر ہی اپنے مفادات اور تحفظات کا مطالبہ کرنا شامل تھا۔

اس آئینی عمل کو اس طرح استوار کیا گیا تھا کہ اِس میں صرف حکومت کے پسندیدہ افراد ہی انتخابی اداروں میں آئیں۔ اِسی ضمن میں 1907ء میں حکومتِ ہند نے ایک اعلان نامے کے تحت ضلعی کونسلوں کے 54 اراکین کو صوبائی کونسلوں کے لیے منتخب کیا۔ ان میں سے صرف 10 زمیندار تھے۔ اسی طرح میونسپل کمیٹیوں سے منتخب ممبران کی تعداد 43 تھی، جن میں سے صرف 2 جاگیردار تھے۔ نامزدگی کے باوجود جاگیرداروں کی پوزیشن بہتر نہ ہونے کے باعث حکومت نے ان کی تعداد کو بڑھایا اور انھیں علحدہ نمائندگی دی۔

جاگیرداروں کو علحدہ نمائندگی دینے کا مقصد ان کی اپنے علاقے میں اہم سیاسی اور معاشی حیثیت کو اپنے حق میں استعمال کرنا تھا۔ جاگیردار قدیم زمانے سے ہی اپنے اپنے علاقوں میں اہم کردار کے حامل چلے آرہے تھے اور یہ اثر اس دَور تک بدستور جاری تھا۔ حکومت برطانیہ کاان کی حوصلہ افزائی کا مقصد یہ تھا کہ ان کے اثر کو اپنے سیاسی استحکام کے لیے استعمال کیا جائے۔ ویسے بھی جاگیردار مزاجاً روایت پسند ہوتے تھے اور یہ رویے حکومت کے سیاسی عزائم کے لیے حد درجہ موزوں تھے۔

لارڈ منٹو نے ہندوستان میں اعتدال پسند گروہوں کو تقویت پہنچانے اور آئینی عمل کو آگے بڑھانے کے لیے 1909ء میں حکومتِ برطانیہ کے تعاون سے اصلاحات نافذ کیں۔ ان اصلاحات کی اہم شقیں یہ تھیں۔

منٹو مارلے اصلاحات 1909ء

1- مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق دے دیا گیا۔ اس سے مسلمانوں کو یہ ضمانت مل گئی

کہ ایک مخصوص تعداد میں وہ اپنے نمائندوں کا انتخاب کر سکیں گے۔ تاہم مخصوص نشستوں کے بارے میں انھیں تسلّی بخش مراعات نہ دی گئیں بلکہ انھیں اتنی نشستیں بھی نہ دی گئیں، جتنی انھیں آبادی کے تناسب سے ملنی چاہیے تھیں۔ یوپی میں مسلمانوں کی آبادی 14 فیصد تھی مگر تمام منتخب ممبران میں سے صرف 8 نشستیں انھیں دی گئیں۔ پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی 54 فیصد تھی مگر صوبائی اسمبلی کے 28۔ اراکین میں صرف 7 مسلمان تھے۔ بمبئی میں مسلمانوں کی آبادی 20.4 فیصد تھی مگر ان کی نشستوں کا تناسب صرف 9.5 فیصد تھا۔

اس ایکٹ میں ، اگرچہ مسلمانوں کو ان کی توقع کے مطابق ضروری نشستیں نہ ملیں تاہم مسلم لیگ کا اپنے قیام کےصرف تین سال بعد جداگانہ انتخابی حیثیت کا مطالبہ منظور کروا لینا بہت بڑا کارنامہ تھا۔

2- 1892ء کے ایکٹ میں قانون ساز کونسلوں کے ممبران کو سوالات پوچھنے کا حق دے دیا گیا تھا تاہم وہ ان سوالات سے متعلق ضمنی سوالات نہ پوچھ سکتے تھے۔

منٹو کی آئینی اصلاحات میں ارکانِ اسمبلی کو ضمنی سوالات پوچھنے کا اختیار دے دیا گیا مگر ساتھ ہی متعلقہ محکمے کے وزیر انچارج کو یہ بھی اختیار دے دیا گیا کہ وہ ضمنی سوالات کا فوری جواب دینے سے انکار کر دے۔

3- کونسل کے ممبران کو قراردادیں پیش کرنے کی اجازت مل گئی، لیکن کونسل کے صدر کو یہ اختیار دے دیا گیا کہ وہ کسی بھی قرارداد کے کسی بھی حصے پر بحث کو روک دے۔

4- اس ایکٹ کے تحت پہلی مرتبہ کسی ہندوستانی کو وائسرائے کی انتظامی کونسل میں شامل کیا گیا۔

5- قانون ساز کونسلوں کے اراکین کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ کیا گیا۔ ان میں صوبائی اور وائسرائے کی کونسلیں شامل نہ تھیں۔

6- صوبائی قانون ساز کونسلوں میں سرکاری اراکین اکثریت میں نہ تھے۔ اکثریت غیر سرکاری اراکین کی تھی۔ ان غیر سرکاری اراکین میں سے کچھ کو حکومت نامزد کرتی

تھی۔ سرکاری اراکین دو قسم کے ہوتے تھے، اوّل جنھیں گورنر اور حکومت نامزد کرتی تھی، دوم، وہ جو اپنے عہدوں کی وجہ سے ممبر بن جاتے تھے۔

صوبائی کونسلوں میں اگرچہ غیر سرکاری اراکین کی اکثریت ہوتی تھی۔ مگر نامزد غیر سرکاری اراکین ہمیشہ حکومت کا ساتھ دیتے تھے۔ اس طرح یہ اکثریت غیر مؤثر ہو جاتی تھی۔

مجموعی طور پر 1909ء کی منٹومارلے اصلاحات میں کونسلوں کی حیثیت محض مشاورتی تھی اور ان کا کام حکومت پر صرف محدود تنقید اور سوالات وغیرہ پوچھنے سے زیادہ نہ تھا۔ حکومت بھی اپنے انتظام اور دوسرے اہم معاملات میں کونسلوں کو کوئی خاص اہمیت نہ دیتی تھی اور ان کی پیش کی ہوئی قراردادوں کو بھی نظرانداز کر دیتی تھی۔ مثال کے طور پر مرکزی اسمبلی کے پہلے آٹھ سالوں میں کل 168 قراردادیں پیش ہوئیں جن میں سے صرف 24 قراردادیں منظور ہوئیں۔

اِن اصلاحات کا اگر تنقیدی نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان سے ہندوستانیوں کو حقیقی معنوں میں حکومتِ خوداختیاری کے سلسلے میں کچھ نہ ملا۔ کونسلیں اپنی کارکردگی کے اعتبار سے بدستور غیر مؤثر رہیں اور اس کی سب سے اہم وجہ ممبران کے انتخاب کا طریقہ تھا جس میں زیادہ سے زیادہ ان افراد کو چنا جاتا تھا جو حکومت کے پسندیدہ ہوتے تھے۔ قانون ساز کونسلوں کا انتخاب بالواسطہ ہوتا تھا۔ عام ووٹر مقامی اداروں کے اراکین کو منتخب کرتے، مقامی ادارے صوبائی قانونی ساز اسمبلیوں کو منتخب کرتے، اور صوبائی کونسل کے اراکین مرکزی قانون ساز اداروں کے اراکین کا انتخاب کرتے تھے۔ اس طرز انتخاب میں عام ووٹر اور مرکزی و صوبائی اسمبلیوں کے ممبران میں فاصلہ بڑھ جاتا اور مرکزی کونسل اور رائے دہندگان کے درمیان ضروری رابطہ ختم ہو جاتا تھا جو کسی بھی سیاسی عمل کے لیے ضروری ہوتا ہے۔

رائے دہندگان کی تعداد کو محدود کرنے اور ممکنہ حد تک اسے انگریزی مزاج سے قریب تر کرنے کے لیے، ایک ووٹر کا معیار مقرر کر دیا گیا تھا۔ یعنی یہ کہ کسی بھی شخص کا رائے دہندہ بننے کے لیے اس کا صرف باشعور ہونا کافی نہ تھا بلکہ اس کے

ضروری تھا کہ وہ ایک خاص حد تک ٹیکس ادا کرتا ہو، اس کی مخصوص مالیت کی جائداد ہو اور وہ ایک خاص درجے تک انگریزی تعلیم پڑھا ہو۔ ان شرائط سے غریب لوگ کسی طور ووٹر نہ بن سکتے تھے اوراس طرح آبادی کی اکثریت اس بنیادی حق سے محروم ہو جاتی تھی۔ ایسے حالات میں ووٹروں کی تعداد حد درجہ کم ہوتی تھی اور ان پر اثرانداز ہونا بھی آسان ہو جاتا تھا۔ بعض حلقوں میں ووٹروں کی تعداد 7 یا 8 سے زیادہ نہ تھی۔

1909ء کی آئینی اصلاحات کو کانگرس کے انتہا پسند رہنماؤں نے کھوکھلا قرار دے کر رد کر دیا۔ معتدل رہنماؤں اور خاص طور پر گوکھلے نے ان اصلاحات کو مناسب اور بہتر قرار دیا۔ ان کا خیال تھا کہ حکومت نے یہ اصلاحات کر کے ملک کو انتشار اور بد نظمی سے بچا لیا ہے۔ مسلمان رہنماؤں نے جداگانہ انتخاب کا حق ملنے پر اِس ایکٹ کو تسلّی بخش قرار دیا۔

مسلمانوں کے سیاسی نظریات میں تبدیلی

مسلمانانِ ہندوستان نے اپنی عملی سیاست کا باقاعدہ آغاز شملہ وفد اور پھر مسلم لیگ کے قیام سے کیا۔ اُس زمانے میں مسلمان عموی طور پر انگریزوں کی طرف مفاہمانہ رویّے کے حامل تھے۔ اِس رویّے کی تعمیر میں یہ خوف تھا کہ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ انگریز ہندوستان کو چھوڑ کر چلے جائیں تو اکثریتی ہندو قوم ان کے ساتھ نہایت ناروا سیاسی اور معاشی سلوک کرے گی۔ 1907ء میں نواب وقار الملک نے ایسے ہی جذبات کا اظہار قدرے وضاحت سے کیا:۔

> "تعداد کے اعتبار سے ہم دوسری قوموں کے مقابلے میں $\frac{1}{5}$ ہیں۔ اگر کبھی ہندوستان میں برطانوی حکومت ختم ہو جائے تو ہمیں ہندوؤں کے غلام کی حیثیت سے رہنا پڑے گا اور ہماری زندگیاں ، ہماری جائیدادیں، ہماری عزتِ نفس اور ہمارے مذہب کو شدید خطرہ لاحق ہو جائے گا۔"

(بحوالہ حیاتِ وقار) ((Indian Nationalism by R. Suntharalingum)

تقسیم بنگال اور 1909ء کی آئینی اصلاحات میں جداگانہ حقِ انتخاب ملنے پر، مسلمانوں میں انگریزوں کے تئیں اور بھی بہتر رویّے پیدا ہوئے۔ ایسے رویّوں کا اظہار، اس دَور کے مسلمان رہنما اکثر اپنی تقاریر میں کرتے رہتے تھے۔

بعدازاں 1910ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں مسلمانوں نے اپنی سیاسی اہمیت اور آبادی کے لحاظ سے سرکاری نوکریوں میں نمائندگی کا مطالبہ کیا۔ حکومت نے اس مطالبے پر ہمدردانہ غور کا وعدہ کیا اور کچھ اسامیوں پر مسلمانوں کو بھرتی بھی کیا گیا۔ ان اسامیوں میں اہم کچھ مسلمانوں کی ہائی کورٹوں میں بطور جج تقرری تھی۔

1910ء کے بعد مسلمانوں کو انگریزوں کی طرف سے شدید مایوسی کا سامنا کرنا پڑا اور س کی وجہ تقسیم بنگال کی تنسیخ، مسلم یونیورسٹی کے قیام پر ہٹ دھرمی، مسجد کانپور کا واقعہ اور ترکی و بلقان ریاستوں میں انگریزوں کی مخاصمانہ پالیسیاں تھیں۔ ان سب واقعات کے بعد مسلمانوں نے انگریزوں کی جانب اپنے مفاہمانہ رویّے کو بدلنا شروع کر دیا اور وہ ہندوؤں سے مل کر مشترکہ سیاسی لائحہ عمل بنانے میں مصروف ہو گئے۔

تقسیم بنگال کی تنسیخ

انگریزوں نے ہندوؤں کی مزاحمتی تحریک کے زیر اثر 1911ء میں تقسیم بنگال کو منسوخ قرار دے دیا۔ یہ اعلان مشرقی بنگال میں رہنے والے مسلمانوں کی معاشی اور سیاسی زندگی پر بجلی بن کر گرا۔ انھیں اپنی زندگی میں بہتری کے لیے جو توقعات پیدا ہو رہی تھیں، سب ملیامیٹ ہو گئی۔ اِس موقع پر نواب وقار الملک، محمد علی جوہر، ظفر علی خان، حسرت موہانی نے شدید ردّعمل ظاہر کیا۔ نواب وقار الملک نے اس طرح تبصرہ کیا:۔

> "یہ تو نصف النہار کی طرح روشن ہے کہ ان واقعات (تنسیخِ تقسیم بنگال) کے بعد جو دیکھنے میں آئے ہیں میں مسلمانوں کو یہ مشورہ دیتا کہ وہ گورنمنٹ پر بھروسہ کریں، لاحاصل مشورہ ہے۔ اب زمانہ اس قسم کے مشوروں کا نہیں رہا۔ خدا کے فضل و کرم کے بعد ہم کو جس پر بھروسہ کرنا ہے، وہ ہماری قوتِ بازو ہے——"

تنسیخ تقسیم بنگال سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ انگریز کوئی بھی فیصلہ اپنے سیاسی مفادات کے تحت کرتے ہیں اور اگر بڑی سیاسی مصلحت آن پڑے تو وہ اسے منسوخ کر دیتے ہیں۔ اس میں انھیں کسی قوم سے ہمدردی یا لحاظ ہرگز نہیں ہوتا ہے۔ بارہا یاد دہانیوں کے باوجود حکومت نے مسلمانان مشرقی بنگال بالخصوص اور مسلمانان ہند بالعموم کے مفادات کو نظرانداز کر دیا تھا۔ اس تنسیخ میں ہندوؤں کی متشدد تحاریک کے حکومت پر دباؤ نے اصل کام کیا اور انگریزوں نے اس دباؤ کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں میں سیاسی عمل اور شعور ابھی ابتدائی سطح پر ہی تھا اور اس میں عام لوگوں کی شمولیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس سیاسی عمل میں زیادہ تر لوگ جاگیرداروں اور مراعات یافتہ طبقے سے ہی تھے۔ تنسیخِ تقسیم بنگال پر نواب سلیم اللہ کا تبصرہ اسی تناظر میں تھا:

"تقسیم بنگال کی تنسیخ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت کو مخالفانہ اور متشدد رویّوں سے گھٹنوں پر جھکایا جا سکتا ہے۔"

مسلم یونیورسٹی کا قیام

سرسید احمد خان نے مسلمانان ہند کی دوسری اقوام کے برابر حیثیت لانے کے لیے سب سے زیادہ زور جدید علوم کے حصول پر دیا۔ اس کے لیے انھوں نے بہت سے سکول کھولے۔ انھوں نے علی گڑھ میں بھی ایک سکول کھولا، جو بعد میں ترقی کرتا ہوا 1877ء میں کالج کے درجے تک پہنچ گیا۔ سرسید کی زندگی میں ہی یہ کالج مسلمانان ہند کی تعلیمی، معاشرتی اور سیاسی زندگی کا مرکز بن گیا تھا۔ سرسید کی خواہش تھی کہ یہ کالج مزید وسیع ہو کر یونیورسٹی کا درجہ حاصل کر لے۔ اس سے مختلف علاقوں میں علی گڑھ یونیورسٹی سے ملحقہ تعلیمی ادارے کھولنا ممکن ہو جائے گا ورنہ یونیورسٹی بننے کی صورت میں یہاں زیادہ سے زیادہ طلبہ تعلیم حاصل کر سکیں گے۔

سرسید کی زندگی میں علی گڑھ کالج، یونیورسٹی کا درجہ نہ حاصل کر سکا تھا۔ ان کے رفقا نے یہ کوشش جاری رکھی۔ 1906ء کے شملہ وفد نے وائسرائے سے [illegible]
یونیورسٹی بنانے کا مطالبہ کیا اور مالی امداد بھی طلب کی تھی۔ حکومت نے [illegible]

کوئی امید افزا جواب نہ دیا۔ انھی دنوں کالج میں ایک غبن ہو جانے سے عام لوگوں کے اعتماد کو ٹھیس لگی اور انھوں نے کالج کو چندہ دینا بند کر دیا۔ مسلمان رہنماؤں کے سامنے اب یونیورسٹی کے لیے رقم کی فراہمی اور حکومت سے اجازت حاصل کرنے کا مسئلہ تھا۔ انھی امور کو طے کرنے کے لیے 1911 ء کے اوائل میں ایک کمیٹی قائم کی گئی اس کمیٹی کے سربراہ راجا محمود آباد (1) تھے۔ اس کمیٹی کے ذمے یونیورسٹی کے آئین کی تیاری کا کام تھا۔ مسلمان رہنماؤں کی کوششوں سے 26 لاکھ روپے کی رقم جمع کر لی گئی ۔ مگر 1912 ء کے وسط میں حکومت نے یونیورسٹی کے قیام کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ حکومت کو اعتراض تھا کہ مجوزہ یونیورسٹی کو دوسرے علاقوں میں کسی بھی تعلیمی ادارے کو اپنے ساتھ ملحق کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یونیورسٹی کے نام کے ساتھ 'مسلم' لفظ شامل کرنے پر بھی رضامند نہ تھے۔ کچھ رہنماؤں نے اپنے رویے میں نرمی پیدا کرنے کا سوچنا شروع کر دیا مگر 1914 ء میں جنگ عظیم اوّل کے چھڑ جانے سے یہ معاملہ پس پشت ڈال دیا گیا۔ 1920 ء میں حکومت نے مسلم یونیورسٹی کے قیام کی اجازت دے دی تاہم کسی بھی تعلیمی ادارے کو اس کے ساتھ ملحق نہ کیا جا سکتا تھا۔

مسلم یونیورسٹی کے قیام کے بارے میں حکومت کا رویہ خاصا مایوس کن تھا۔ حکومت کی طرف سے عائد کردہ غیر ضروری شرائط کے باعث مسلمان رہنماؤں نے محسوس کرنا شروع کر دیا کہ اپنی قوم کی بہبود کے کاموں میں بھی وہ کس قدر حکومت کے محتاج ہیں، اور یہ کہ حکومت ان کے جائز حقوق کو تسلیم کرنے میں پہلوتہی کر رہی

---

(1) راجا محمد علی محمد (1879 ء -1931 ء) ذاتی خطاب مہاراجہ تھا، محمود آباد میں پیدا ہوئے اور گھر پر ہی تعلیم حاصل کی۔ علی گڑھ کالج کے ٹرسٹی تھے۔ یو پی اسمبلی کے ممبر رہے۔ (1904 ء -1909 ء) گورنر جنرل کی کونسل کے ممبر (20 ء -1907 ء) مسجد کانپور کی ایجیٹیشن میں حصہ لیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تحریک کے سرگرم رکن ۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر (1915 ء -1919 ء)۔ کلکتہ ، 1917 ء بمبئی 1918 ء ، اور کلکتہ 1928 ء میں مسلم لیگ کے اجلاسوں کی صدارت کی۔ برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے صدر (1917 ء -1920 ء) ممبر یو پی گورنمنٹ (1920 ء -1925 ء) ، وائس چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی (23 ء -1920 ء) ۔

ہے۔ اس ضمن میں وقار الملک نے شدید ردّعمل کا اظہار کیا:۔

"میری رائے تو یہ ہے کہ باوجود گورنمنٹ کے اس اعلان کے مسلمانوں کو بدستور اپنی خواہش پر قائم رہنا چاہیے۔ اگر آج ہم اس پر رضامندی دے دیں تو کل کو خود ہمارے ہاتھ کاٹے جائیں گے اور ہماری آئندہ نسلیں جو عدم الحاق سے متأثر ہوں گی، وہ ہمارے اوپر لعنت بھیجیں گی کہ ہم نے ایسے نظام کو قبول کر کے اپنی نسلوں کو یونیورسٹی کے فوائد سے محروم کر دیا۔"

(ایضاً)

ملتِ اسلامیہ کے خلاف برطانوی عزائم

یہ بات قدرتی ہے کہ کسی بھی مذہب کے ماننے والوں میں ایک دوسرے کے لیے ایک لحاظ اور تعلق ہوتا ہے۔ اسلام کی ابتدا سے ہی مسلمانوں میں ملتِ اسلامیہ کا تصور پیدا ہوگیا تھا۔ مسلمان، کسی بھی خطے میں ہوں، سب کے درمیان ایک خدا، ایک رسولؐ اور ایک ہی ضابطۂ حیات کے پیروکار ہونے کے ناطے ایک جذبۂ مشترک پیدا ہو گیا۔ اسی جذبہ کے تحت دُکھ کی گھڑی میں وہ اپنےدوسرے بھائی کی مدد کے لیے دوڑ پڑتے تھے۔

انیسویں صدی کے آخر میں ترکی کی سلطنت ایک وسیع علاقے پر محیط تھی اور اس کے سلطان عبدالحمید کو خلیفہ ہونے کے ناطے بڑے احترام سے دیکھا جاتا تھا۔ ترکی کو مسلمانانِ عالم، اسلامی خلافت کا مرکز سمجھتے ہوئے اس کے خلیفہ کا بڑا احترام کرتے تھے۔

بیسوی صدی کے دوسرے عشرے میں ترکی سلطنت زوال پذیر ہوگئی اوراس کی سرحدیں سکڑنا شروع ہوگئیں۔ ستمبر 1911ء میں اٹلی نے طرابلس پر اس بنا پر حملہ کر دیا کہ اسے یہاں آزادی سے تجارت کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس علاقے پر ترکی کی کئی سو سال سے حکومت تھی۔ اٹلی کی افواج نے حملے کے دوران مقامی آبادی پر شدید مظالم کیے۔ ترکی، طرابلس پر اپنی افواج بھجوانا چاہتا تھا مگر راستے میں انگریزوں

کے مقبوضہ علاقے پڑتے تھے۔ انگریزوں نے ترکی کو ان علاقوں سے گزرنے کی اجازت دے کر اٹلی سے حمایت کا اعلان کیا۔ اس طرح ہندوستان کے مسلمانوں میں اٹلی اور برطانیہ کے خلاف جذبات ابھرنے لگے۔

1912ء میں بلقان کی ریاستوں نے مل کر ترکی پر حملہ کر دیا تاکہ ترکی کو یورپ سے نکال دیا جائے۔ ترکی پر حملے سے مسلمانانِ ہند کو سخت صدمہ پہنچا اور انھوں نے اپنے ترک بھائیوں کی امداد کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ ترکی کے تمام حملوں اور سازشوں میں برطانیہ برابر کا شریک تھا اور وہی اپنے عالمی عزائم کی بارآوری کے لیے ترکی کی سلطنت کو ختم کرنے پر تلا ہوا تھا۔

کانپور مسجد کا واقعہ

1913ء میں یوپی کے ایک قصبے کانپور میں ایک مسجد کے ایک حصّے کو منہدم کر دیا گیا۔ 1908ء میں صوبائی حکومت نے شہر کانپور کی سڑکوں کو چوڑا کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس منصوبے میں شہر کی ایک اے۔ بی روڈ کو بھی چوڑا کرنا شامل تھا۔ اس سڑک پر ایک مندر اور ایک مسجد، ایک دوسرے کے سامنے تھے۔ اگر مجوزہ سڑک سیدھی بنائی جاتی تو مندر کو گرانا پڑتا تھا۔ ہندوؤں کو جب اس کا علم ہوا تو انھوں نے احتجاج کرنا شروع کر دیا۔ اس سے حکومت نے سڑک کو سیدھا رکھنے کے منصوبے کو جاری رکھنے سے اجتناب کیا۔

اب مسلمانوں کو خدشہ ہوا کہ سڑک کو چوڑا کرتے وقت مسجد کے باہر والے حصّے کو منہدم نہ کر دیا جائے۔ انھوں نے گورنر کو ایک درخواست دے کر اس میں اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ اس پر گورنر نے یقین دہانی کروائی کہ "مسجد اور مندر دونوں پر دست اندازی نہ کی جائے گی۔"

جب سڑک کی تعمیر کا کام شروع ہوا تو صرف دو متبادل تھے۔ ایک یہ کہ سڑک کو سیدھا کر دیا جائے اور مندر کو مسمار کر دیا جائے۔ دوسرے اگر سڑک کو خم دیا جائے تو مسجد کا ایک حصہ منہدم ہو سکتا تھا۔

مقامی انتظامیہ نے فیصلہ کیا کہ مندر کو نہ چھیڑا جائے۔ اس پر مسلمانوں میں تشویش بڑھی اور انھوں نے مسجد کی سلامتی کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ اسی دوران ایک انگریز ضلعی مجسٹریٹ مسجد کے معائنے کے لیے آیا تو اسے مسجد کے باہر والے حصے تک جوتوں سمیت آنے کی اجازت دے دی گئی۔ انگریز مجسٹریٹ نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ جس جگہ تک وہ جوتوں سمیت چلا گیا تھا وہ مسجد کا متبرک حصہ شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اس پر مسلمانوں نے گورنر سے مداخلت کی اپیل کی۔ گورنر نے مقامی انتظامیہ کے فیصلے کو برقرار رکھا۔

کانپور کی میونسپل کمیٹی کا چیئرمین ہندو تھا۔ اس نے مسجد کے معاملے میں مسلمانوں کے جذبات کا خیال نہ رکھا۔ ان حالات میں مسلمان رہنماؤں و علما نے فتوی دے دیا کہ مسجد کا ہر حصہ متبرک ہوتا ہے اور اس کے کسی بھی حصے کو نہ تو بیچا جا سکتا ہے اور نہ ہی اسے کسی اور مقصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

یکم جولائی 1913ء کی صبح کو مسلح پولیس نے مسجد کو گھیرے میں لے کر اس کے سڑک کے ساتھ متصل حصے کو گرا دیا۔ اسی شام کانپور میں مسلمانوں نے ایک احتجاجی جلسہ منعقد کیا اور وائسرائے کو فوری مداخلت کے تار روانہ کیے۔ 3 جولائی کو کانپور میں ایک اور جلسہ ہوا۔ اس میں ہزاروں مسلمانوں نے شرکت کی۔ جلسہ گاہ سے کچھ لوگ مسجد کی طرف آئے اور انھوں نے مسجد کے گرے ہوئے حصے کو ازسرِنو تعمیر کرنا شروع کر دیا۔ اس پر ضلعی مجسٹریٹ نے موقع پر پہنچ کر ہوائی فائرنگ کی مگر مجمع منتشر نہ ہوا۔ مجسٹریٹ نے گولی چلانے کا حکم دیا۔ اس سے 20 سے 30 مسلمان شہید کر دیے گئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔ بہت سے مسلمانوں کو گرفتار کر لیا گیا، ان میں نوعمر بچے بھی شامل تھے۔

اس واقعے پر مسلمان رہنماؤں نے شدید ردِعمل اور غم و غصے کا اظہار کیا۔ الہ آباد کے ایک مشہور وکیل، سید رضا علی نے، جو اس واقعے کے عینی گواہ تھے، لکھا ہے:-

"غیر ذمہ دار حکومت اور خاص کر جب وہ حکومت بدیسی بھی ہو (تو وہ) اپنے عہدے داروں کی حمایت کرنا فرض سمجھتی ہے۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ

مقامی حکام مسائل کو حل کرنے میں صبر و تحمل ، فہم و فراست سے کام لینے کی بجائے تشدد کرتے اور عوام پر اپنا زور دکھاتے ہیں۔"

(مسجد کانپور ، سید قمر عباس ، مجلہ پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی)

نواب وقار الملک نے اپنی علالت کے باوجود اس واقعے پر اس طرح اپنا ردعمل ظاہر کیا:۔

"بدمزاج سے بدمزاج حاکم بھی زیادہ عرصے تک اپنی بدمزاجی پر قائم نہیں رہ سکتا، اگر رعایا اپنی آزادی ، حفاظت ، اعتدال اور استقلال کے ساتھ کرتی رہے ..... یہ ایک ایسا موقعہ ہے کہ اگر ہم نے اس کو بغیر توجہ کے ہاتھ سے جانے دیا تو ٹائیلر (ضلعی مجسٹریٹ) نہیں، آئندہ ہمیں توقع رکھنی چاہیے کہ ایک انسپکٹر بھی ہمارے لیے ٹائیلر ثابت ہو گا۔ اب ہمارے ہاتھ میں ہے کہ اپنی آزادی و عزت کو برقرار رکھیں یا پیروں تلے پامال ہونے دیں۔"

مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے احتجاج کے باعث وائسرائے کو کانپور کا دورہ کرنا پڑا۔ اس نے یہاں جو خطاب کیا وہ انگریزوں کے استعماری مزاج کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس نے کہا:۔

"میں آپ کے باپ کی جگہ ہوں اور آپ سب میرے بچے ہیں۔ جب بچے غلطی کریں تو ان کے سرپرست کا فرض ہے کہ باوجود قلبی محبت کے ان کو تنبیہ کریں تاکہ انھیں عقل آئے اور وہ دوبارہ پہلی سی غلطی نہ کریں....."

(ایضاً)

وائسرائے نے تمام قیدیوں کو رہا کرنے کا حکم دیا۔ مرنے والوں کے ورثا سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ مسجد کے منہدم شدہ حصے کو بحال کرنے کے لیے آٹھ فٹ بلند ایک چھتہ بنایا گیا۔ اس پر مسجد کا منہدم کردہ حصہ ، اسی طرح اور اسی مقام پر تعمیر کروانے کا فیصلہ کیا گیا۔ چھتے کے نیچے سے سڑک نکال دی گئی۔ اس فیصلے کو عام طور پر قبول کر لیا گیا۔

مسجد کانپور کے واقعے کے تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ مقامی انتظامیہ اور میونسپل کمیٹی کے ہندو چیئرمین نے مسلمانان کانپور کے جذبات کا احترام کرنے کی بجائے محض حکومتی قوت کے ذریعے انھیں دکھ پہنچانے کی کوشش کی۔ وائسرائے نے بھی اپنے خطاب میں حکومتی قانون کے نفاذ میں طاقت کے استعمال کو جائز قرار دیا، اور طاقت کے اس استعمال کو تنبیہ کے مترادف سمجھا۔ اگرچہ اس 'تنبیہ' سے 30 مسلمانوں کو شہید کر دیا گیا، بہت سارے زخمی کر دیے گئے اور بہت سوں کو قید کی ذلت اٹھانا پڑی۔

میثاقِ لکھنؤ

1909ء میں مسلمانوں کو جداگانہ حق انتخاب تو ضرور مل گیا مگر بعد میں رونما ہونے والے واقعات میں انگریزوں کی پالیسی ان کے ہندوستان میں انتظامی اور مجموعی سیاسی عزائم کے تحت رہی۔ اس میں مسلمانوں کے مفادات کو نظرانداز کیا گیا۔ ان واقعات میں بنگال کی تقسیم کی تنسیخ، مسلم یونیورسٹی کی اجازت نہ دینا، مسجد کان پور کا واقعہ اور ترکی کی جانب برطانیہ کے رویے کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ 1913ء تک انگریز پالیسیوں کے بارے میں اس بات کی بھی وضاحت ہو گئی تھی کہ انگریز، ہندوستان میں کسی بھی قومیت سے خاص تعلق نہیں رکھنا چاہتے، ان کے تعلق کی بنیاد صرف اور صرف ان کی سیاسی مصلحت یا ضرورت ہی ہو سکتی ہے۔

اسی زمانے میں مسلمانوں میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کا گروہ سرگرم عمل ہوا۔ ان میں مولانا حسرت موہانی (1875ء - 1959ء) مولانا شبلی نعمانی (1857ء - 1914ء) اکبر الہ آبادی (1846ء - 1921ء) اور علامہ اقبال (1877ء - 1938ء) اپنی شاعری کے ذریعے مسلمانوں میں ایک نیا جذبہ پیدا کر رہے تھے۔ اس نئے انداز میں مسلمانوں میں مذہبی اور سیاسی وحدت عمل پیدا کرنا اور انھیں انگریزوں کی سامراجی حکومت کے استبداد سے آگاہ کرنا شامل تھا۔ ان مشاہیر نے جو مہم شروع کی اس میں انگریزوں کو ادھر در

امت مسلمہ کا سب سے بڑا دشمن قرار دیا گیا۔

اسی دور میں مسلمان صحافت میں ایک نیا دور شروع ہوا۔ مولانا ظفر علی خان (1872ء - 1956ء) کا زمیندار، مولانا ابو الکلام آزاد (1888ء - 1958ء) کا الہلال اور مولانا محمد علی (1878ء - 1931ء) کا کامریڈ اور ہمدرد مسلمانوں کی انگریزوں کے خلاف عوامی رائے میں اہم تبدیلی لا رہے تھے۔ ان رہنماؤں کے زیر اثر مفاہمت کی بجائے مزاحمتی تحریک کا آغاز ہوا۔

ان مشاہیر کے علاوہ بہت سے نوجوان جو انگریزی تعلیم یافتہ اور مغرب کے لبرل نظریات سے خاصے متاثر تھے عملی سیاست میں داخل ہوئے۔ ان میں محمد علی جناح (1) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ وہ ہندوؤں کے سیاست میں حوصلہ مندی سے حصہ لینے کے خواہشمند تھے۔ آپ مسلم لیگ کے 1913ء کے لکھنؤ اجلاس میں شریک ہوئے اور آپ کی کوششوں اور دوسرے رہنماؤں کے مشترکہ غور و خوض سے مندرجہ ذیل قرارداد پاس ہوئی۔

"زیر سایہ تاج برطانیہ آئینی وسائل سے بسطرز حکومت خوداختیاری حاصل کرنا جو ہندوستان کے لیے موزوں ہو اور مذکورہ بالا مقصد کے حصول کے لئے متحد دوسری قوموں کے ہندوستان کے لوگوں میں عوامی خدمت کا ذوق پیدا کر کے اور مختلف گروہوں کے درمیان تعاون قائم کر کے موجودہ نظام حکومت میں مستحکم اور مسلسل صلاح کرنا۔"

Pakistan Movement.

Historic Documents Edited by G. Alana

---

1 - محمد علی جناح 25 دسمبر 1876ء کو پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم کراچی سے حاصل کی اور 1892ء میں مزید تعلیم کے لیے برطانیہ چلے گئے۔ 1896ء میں وہاں سے بار ایٹ لاء کر کے واپس ہوئے۔ اور 1900ء میں انہیں مجسٹریٹ کی ایک عارضی اسامی پر ملازمت مل گئی۔ تین ماہ بعد یہ ملازمت ترک کر کے انہوں نے وکالت شروع کر دی اور آہستہ آہستہ وہ خوشحال ہو گئے۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

دسمبر 1913ء میں کانگریس کے اجلاس منعقدہ کراچی میں مسلم لیگ کے لکھنؤ اجلاس کی قرارداد کو خوش آئند قرار دیا اور مختلف قوموں کے درمیان تعاون کو فروغ دینے پر زور دیا گیا۔

جنگ عظیم اوّل کے شروع ہو جانے کے بعد مسلمان اور ہندو رہنماؤں میں یہ خیال دن بدن مضبوط ہو رہا تھا کہ جنگ کے نتیجے میں انگریزوں سے مزید مراعات لینے کے لیے ضروری ہے کہ دونوں اقوام مل کر انگریزوں پر دباؤ بڑھائیں۔ انھی دنوں کانگریس کا اجلاس دسمبر 1915ء میں بمبئی میں ہو رہا تھا۔ قائد اعظم کی کوششوں سے مسلم لیگ کا اجلاس بھی انھی دنوں بمبئی میں منعقد کیا گیا۔ کانگریس کے اجلاس میں ہندوؤں کے اہم رہنماؤں نے شرکت کی۔ اجلاس میں جنگ کے حوالے سے حکومت برطانیہ اور اتحادیوں سے ہمدردی کا اظہار کیا گیا۔ خود مختار نظام حکومت کے قیام کے سلسلے میں ضروری تبدیلیوں کا مطالبہ کیا گیا۔ اس کے علاوہ صوبائی خودمختاری، قانون سازی کی کونسلوں میں توسیع اور اصلاحات پر زور دیا گیا۔ جن صوبوں میں ایسی کونسلیں نہ تھیں وہاں ان کے قیام کا مطالبہ کیا گیا۔ کانگریس کمیٹی کو ہدایت دی گئی کہ وہ ان مقاصد کی روشنی میں ایک سکیم تیار کرے اور اس کی تیاری کے سلسلے میں مسلم لیگ سے بھی مشورہ کرے۔

مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت مظہر الحق (1866ء - 1930ء) نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطبے میں برطانوی حکومت پر نکتہ چینی کی اور ہندو مسلم اتحاد پر زور

بمبئی میں قیام کے دوران آپ وکالت کے ساتھ ساتھ انڈین نیشنل کانگریس کی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔ 1909ء میں آپ بمبئی سے امپیریل قانون ساز اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ 1913ء میں مسلم لیگ میں شرکت اختیار کی۔ 1916ء میں امپیریل قانون ساز کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ آپ نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے کام کرنا شروع کر دیا، مگر نہرو کمیٹی کی رپورٹ کے بعد وہ کافی بددل ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے صرف مسلمانوں کی بھلائی کے لیے کام کیے۔ مسلم لیگ کو منظم کیا اور بالآخر پاکستان حاصل کیا۔ آپ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل بنے۔ 1948ء میں آپ کی وفات ہوئی۔ قوم نے آپ کو قائد اعظم کا خطاب دیا۔

دیا۔ انھوں نے کہا:

"ہمیں اب اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی ضرورت ہے۔ ہم نے دوسروں پر بھروسہ کیا ہے۔ ہندوؤں سے بلاوجہ بددل رہے۔ ہمیں ان کے قریب ہو کر اور خود اپنی ذات میں بھروسہ کر کے پبلک لائف میں کام کرنے کی ضرورت ہے۔ جس طرح ہمارا فرض رواداری اور تعاون کا ہے اسی طرح ہمسایہ قوموں کا بھی فرض ہے کہ وہ بھی رواداری اور تعاون سے کام لیں، جب تک دونوں قوموں میں یہ جذبہ نہ ہوگا، اتحاد ناممکن ہے! اگر ایک ہی برتری محسوس کرے تو دوسرا کیوں کر اتفاق قائم کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے اتحاد دو برابر طاقتوں میں ہی ممکن ہے اور طاقتور اور کمزور میں صلح نہیں ہو سکتی۔"

برطانوی حکومت کے طرز عمل کے بارے میں انھوں نے کہا:۔

"جس طرح ہمارا فرض ہے کہ ہم حکومت سے تعاون کریں، اسی طرح برطانوی حکومت کا بھی فرض ہے کہ وہ ہماری مدد کرے۔ اس نے ہمارا بوجھ اپنے سر پر رکھا لیکن ابھی تک ہمیں اس قابل نہیں بنایا کہ ہم اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکیں۔ ہم اس قابل نہیں کہ دنیا کی قومیں ہمیں عزت کی نظر سے دیکھ سکیں۔"

مسلم لیگ اور کانگرس، ہر دو جماعتوں نے اپنے اپنے اجلاسوں میں اصلاحات کے لیے کمیٹیاں قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان دونوں کمیٹیوں کا اجلاس نومبر 1916ء کو کلکتہ میں ہوا۔ دسمبر میں دونوں کمیٹیوں نے ایک مشترکہ سکیم تیار کی۔ اس سکیم کو بعدازاں دونوں پارٹیوں نے منظور کر لیا۔ اس سکیم کو 'میثاق لکھنؤ' کا نام دیا گیا۔ میثاق لکھنؤ کو قائداعظم کی کوششوں کا حاصل قرار دیا گیا اور انھیں 'ہندو مسلم اتحاد کا سفیر' کا خطاب دیا گیا۔ قائداعظم نے میثاق لکھنؤ کی روح کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:

"ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایک معاہدہ کی وجہ یہ ہے (کانگرس کے لیڈر مجھے ایسا کہنے پر معاف کریں گے) کانگرس ایک ہندو جماعت ہے، وہ

اس کو کچھ بھی کہہ لیں، ہندو اور کانگرس کے لیڈروں کے ذہن میں ہمیشہ یہ رہا ہے کہ مسلمانوں کو کانگرس اور ہندو راج کو تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔ یہ کہ وہ اقلیت میں ہیں اور وہ اپنے تحفظ میں صرف ایک اقلیت کی حیثیت سے ہی دباؤ ڈال سکتے ہیں۔ مگر، مجھے کانگرس اور نیشنلسٹ کانگرس پارٹی کے ممبران کو یہ کہنے کی اجازت دیں کہ مسلمان ہمیشہ اپنے ذہن میں یہ بات رکھتے ہیں، اور یہ بات گذشتہ پچیس برسوں میں بھی بالکل مختلف نہیں رہی کہ وہ 1916ء سے وہ ایک علحٰدہ وجود رکھتے ہیں۔ لکھنؤ معاہدے پر دستخط اسی بنیادی اصول پر کیے گئے ہیں کہ (ہندوستان میں) دو مختلف وجود رکھنے والی (قومیتیں) بستی ہیں۔"

اِس کے علاوہ قائدِاعظم نے فرمایا:۔

"سیاسی اتحاد و اتفاق کی جانب بڑھنے کے لیے ہندوستان کی ترقی کے راستہ میں جو نہایت مہیب مسئلہ حائل تھا، اس کے قابلِ اطمینان حل کی وجہ سے ہماری آئینی جنگ قبل ازیں گویا نصف ختم ہو چکی ہے۔ ہندوستان کا یہ مطالبہ جو ملک کی حقیقی ضروریات پر مبنی ہے اور جو وقت و حالات کا لحاظ رکھ کر وضع کیا گیا ہے وہ آخرکار اپنے آپ کو ناقابل مقابلہ ثابت کر کے رہے گا۔ یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ جو حکومتِ ہند کے ذمہ دار ہیں انہوں نے باشندگان کی موجودہ شکایات کے ساتھ مصلحت و ہمدردی کے زیادہ ضیافانہ طریقہ سے سلوک کرنے کی طرف اپنا رجحان ظاہر کیا ہے۔ صلح ہوتے ہی مسئلہ ہند کو دلیرانہ اور فیاضانہ طریق پر حل کرنا ہوگا اور ہندوستان کو سلطنت برطانیہ کے آزاد ذمہ دار اور ہم مرتبہ رکن کی حیثیت سے اس کا پیدائشی حق دینا ہوگا۔"

نوٹ اس کتاب میں قائداعظم کی تقاریر کے حوالہ جات ڈاکٹر رفیق افضل اور جمیل الدین احمد کے مرتبہ مجموعہ تقاریر سے لیے گئے ہیں۔

میثاق لکھنؤ کی اہم شقیں یہ تھیں۔

1 ہندوؤں نے پہلی اور آخری مرتبہ مسلمانوں کو حق جداگانہ انتخاب دینے پر آمادگی کا اظہار کر دیا۔

2- مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلمان ممبروں کی تعداد کل کا $\frac{1}{3}$ تجویز کی گئی۔ صوبائی اسمبلیوں میں مسلمانوں کی نمائندگی کا تناسب یہ تجویز کیا گیا۔

پنجاب	50 فیصد	مدراس	15 فیصد
یو۔ پی	30 فیصد	بمبئی	1/3
بنگال	40 فیصد	مدھیہ پردیش	15 فیصد
بہار	25 فیصد		

3- صوبائی قانون اسمبلیوں کے ممبران $\frac{4}{5}$ منتخب اور $\frac{1}{5}$ نامزد ہوں۔

4- مرکزی مجلس قانون ساز کے اراکین کو براہ راست انتخاب سے چنا جائے۔

5- اگر کسی مجلس قانون ساز میں کوئی غیر سرکاری ممبر ایسی قرارداد یا مسودہ قانون پیش کرے جسے کسی فرقے کے ممبروں کی تین چوتھائی اپنے فرقے کے لیے ناقابلِ قبول یا نقصان دہ قرار دے تو ایسا بل یا ایسی قرارداد زیر بحث نہ لائی جائے گی۔

6 صوبائی حکومت کا سربراہ مجلس قانون ساز کا سربراہ نہ ہوگا۔ بلکہ ہر مجلس قانون ساز کو اپنا صدر خود چننے کی اجازت ہوگی۔

7- مجلس قانون ساز کے ہر رکن کو اضافی سوال پوچھنے کی اجازت ہوگی۔

8 صوبائی حکومت کو صوبہ کی انتظامیہ سے متعلق تمام معاملات پر مکمل اختیارات ہونے چاہئیں۔ ان میں قرض لینے، ٹیکس لگانے یا تبدیل کرنے اور بجٹ پر ووٹ دینے کے اختیارات شامل ہیں۔

9- مجلس قانون ساز کی منظور کردہ قرارداد پر عمل کرنا حکومت کا فرض ہوگا، بشرطیکہ گورنر اسے ویٹو نہ کر دے۔

10- تحریک التوا پیش کرنے کی اجازت ہوگی۔

11 کسی بھی مجلس قانون ساز کے $\frac{1}{8}$ اراکین کی درخواست پر مجلس کا خصوصی اجلاس

طلب کیا جا سکے گا۔

12- مجلس قانون ساز 5 سال کے لیے منتخب ہوگی۔

13- عدلیہ کو انتظامیہ سے علٰحدہ کر دیا جائے گا اور کسی بھی انتظامی افسر کو عدالتی اختیارات حاصل نہ ہوں گے۔

14- ہندوستان کو ڈومینین (DOMINION) کا درجہ دے دیا جائے ۔

میثاقِ لکھنؤ سے مسلمانوں کو جو اہم سیاسی فوائد حاصل ہوئے ان میں اہم یہ تھے:-

ہندوؤں نے پہلی اور آخری بار مسلمانوں کو ایک علحدہ قوم مانتے ہوئے انھیں جداگانہ حق انتخاب دینے پر رضامندی ظاہر کی۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ آل انڈیا نیشنل کانگرس ہندوستان میں بسنے والی تمام اقوام کی نمائندگی نہیں کرتی۔

میثاقِ لکھنؤ میں دونوں اطراف نے مفاہمت کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے مفادات کو دوسری قوم کے لیے کم کر دیا۔ اس معاہدے کی حیثیت محض تجویز کی تھی اور اسے حکومت کو آئینی اصلاحات کے ضمن میں دونوں قوموں کا نقطۂ نظر سمجھا جاتا تھا۔

تجزیہ

سیاست کے میدان میں کوئی بات حتمی نہیں ہوتی۔ حالات کے بدلنے کے ساتھ قوموں کی سیاسی ضروریات اور ان کے تحت معاشی تحفظات کی صورت بدل جاتی ہے۔ اسی لیے بدلتے حالات میں نئے اتحاد اور اشتراک کی بہر طور ضرورت رہتی ہے۔

ہندوستان میں سیاسی حل میں تین اہم عناصر تھے: ایک انگریز جن کی حیثیت حاکم کی تھی اور ان کی پالیسیاں خالصتاً اپنے نو آبادیاتی عزائم سے منسلک تھیں۔ وہ کسی بھی صورتحال میں اپنے مفادات کو فوقیت دیتے مگر ساتھ ہی ساتھ وہ اس بات کا بھی اہتمام کرتے تھے کہ ہندوستان میں متحرک سیاسی گروہوں میں سے ہر ایک کے ساتھ ان کا تعلق بہتر رہے تاکہ سیاسی طور پر وہ اکیلے نہ ہوں۔

ہندوستانی سیاست میں دوسرا بڑا عنصر ہندوؤں کا تھا، جو اکثریت میں تھے۔ ان

میں دو گروہ تھے ایک متشدد پروگرام رکھتے تھے اور ہندوستان کو ایک ہندو ریاست میں بدلنے کے خواہشمند تھے۔ اسی گروہ نے تقسیم بنگال کی تنسیخ میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ ہندوؤں میں دوسرا گروہ اعتدال پسند سیاست دانوں کا تھا، جو ہندوستان میں آئینی عمل کے نتیجے میں حکومت خوداختیاری قائم کرنا چاہتے تھے۔

مسلمانوں میں بھی ابھی تک مذہبی رہنماؤں نے ایک بھرپور عوامی رابطہ قائم کر رکھا تھا اور وہ اپنے مدرسوں اور شاگردوں کی وساطت سے انگریزوں کے خلاف کسی قدر ایک نظریاتی مزاحمت کا شعور پیدا کر چکے تھے۔ اردو ہندی تنازعہ اور خاص طور پر تقسیم بنگال کی تنسیخ کے معاملے پر ہندوؤں کے رویے سے باشعور مسلمانوں میں عملی سیاست کا شعور پیدا ہوا اور انھوں نے حکومت سے کسی قسم کا ٹکراؤ لیے بغیر ایک مفاہمانہ انداز میں سیاسی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ ان کے بعد بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں نوجوانوں کے مختلف گروہ سیاست میں شامل ہونے لگے۔ کچھ صحافت کے میدان سے، کچھ اپنی علمی تصنیفات کے ذریعے اور کچھ جدید لبرل نظریات کی بنیاد پر میدان سیاست میں اترے۔ ان سب نے اپنی اپنی حیثیت اور نقطہ نظر کے مطابق مسلمانوں میں حالات کے مطابق سیاسی شعور اجاگر کیا۔

ہندوستان میں تنسیخ تقسیم بنگال، خود برطانوی حکومت کے لیے بہت بڑا دھچکا ثابت ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے فوری طور پر اپنی حکمت عملی کو واضح اور مؤثر بنانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ 1905ء سے 1916ء تک حالات نے یہ ثابت کیا کہ انگریز کسی بھی قومیت سے خاص تعلق کے حق میں نہیں ہیں۔ وہ ہندوستان میں نہایت سست آئینی اصلاحات کا عمل جاری کریں گے، جس میں محض قسطوں میں ہی مقامی لوگوں کو سہولتیں، سیاسی آزادی اور اختیار مل سکے گا۔ ان آئینی اصلاحات میں سیاسی آزادیوں کو قدرے مقید کر دیا جاتا تھا اور اس میں تبدیلی کا اختیار بدستور حکومت کے پاس ہی رہتا تھا۔ اس کی شہادت 1909ء کے ایکٹ میں مقامی ممبران کو اسمبلی کی کارروائی میں حصے لینے کی شقوں سے دی جا سکتی ہے۔ ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح ہو گیا تھا کہ حکومت انتشار اور مزاحمت کی صورتحال سے حد درجہ خائف ہے

اور اسی لیے اس نے معتدل سیاسی رہنماؤں کی سرپرستی بھی شروع کر دی تھی۔

ان سب حالات میں مسلمانوں اور ہندوؤں میں ابھرتی ہوئی قیادت نے باہم اتحاد بڑھانے اور مل کر حکومت پر دباؤ ڈالنے کی طرف قدم بڑھایا۔ اس میں مسلمانوں کی طرف سے قائداعظم نے مرکزی کردار ادا کیا۔ اور اسی صورتحال میں مسلم لیگ اور کانگرس نے مل کر آئینی اصلاحات تیار کیں۔

یہ اتحاد، اگرچہ بہت بڑا کارنامہ تھا اور ایسا اتحاد بعد میں ممکن بھی نہ ہو سکا تاہم اس میں یہ بات واضح ہو گئی کہ ہندوستان میں مسلمان ایک منفرد اور علیحدہ قوم کی حیثیت کے حامل ہیں۔ اس بات کو 1909ء کے ایکٹ میں انگریزوں نے بھی تسلیم کر لیا تھا اور 1916ء کے میثاق لکھنؤ میں ہندوؤں نے بھی مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت مان لی۔ اس لحاظ سے اس غلط فہمی کا مستقل طور پر خاتمہ ہو گیا کہ کانگرس پورے ہندوستان کی نمائندہ ہے اور مسلمان بھی اس سیاسی پلیٹ فارم سے اپنے مفادات کا تحفظ کر سکتے ہیں۔

یاد دہانی

* تقسیم بنگال کے موقع پر ہندوؤں کی مزاحمتی تحریک کے دباؤ میں آ کر حکومتِ برطانیہ نے وائسرائے ہند بدل دیا۔ نیا وائسرائے لارڈ منٹو ہندوستان میں آئینی اصلاحات کے تحت سیاسی عمل آگے بڑھانا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے اعتدال پسند رہنماؤں کی سرپرستی شروع کی۔
* لارڈ منٹو نے ہندوستان میں برطانوی حکومت کو سیاسی طور پر مضبوط بنانے کے لیے جاگیرداروں کی سرپرستی کی اور ان کی خاص تعداد میں نشستوں کا اعلان کیا۔
* 1909ء کے ایکٹ میں مسلمانوں کو جداگانہ حق انتخاب دے دیا گیا۔ مجموعی طور پر اس ایکٹ سے ہندوستان میں آئینی بنیادوں پر سیاسی عمل میں پیش رفت تو ضرور ہوئی مگر یہ مقامی لوگوں کی خواہشات پر پورا نہ اترتا تھا۔
* 1913ء کے بعد مسلمانوں نے اپنی سیاسی ترجیحات میں تبدیلی کی اور اس ضمن میں حکومت کی طرف اپنے رویے میں زیادہ خوداعتمادی کا انداز اپنایا۔ اس تبدیلی میں

تنسیخِ بنگال، مسجد کانپور کے واقعے اور ترکی کے تئیں برطانوی پالیسی خصوصی طور پر اہم تھی۔

* 1913ء کے بعد کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے باہمی اشتراک عمل پر زور دیا اور اسی سلسلے میں دونوں میں اتحاد کی فضا پیدا ہوئی۔ اس کے نتیجے میں انھوں نے مشترک طور پر آئینی اصلاحات کا خاکہ تیار کیا جو میثاق لکھنؤ کے نام سے مشہور ہے۔

* میثاق لکھنؤ کے بعد مسلمانوں کو ہندوؤں نے بھی ایک الگ قوم تسلیم کر لیا۔

واقعاتی تسلسل

* اصلاحات (مسلمانوں کو جداگانہ حق انتخاب ملا) —— 1909ء
* مسلم لیگ کا مسلمانوں کو مزید سرکاری نوکریاں دینے کا مطالبہ —— 1910ء
* تقسیم بنگال کی تنسیخ —— 1911ء
* مسلم یونیورسٹی کے قیام سے حکومت کا انکار —— 1912ء
* بلقان کی ریاستوں کا ترکی پر حملہ —— 1912ء
* کانپور مسجد کا واقعہ —— 1913ء
* ہندوؤں کی طرف مسلم لیگ کا مفاہمانہ انداز —— 1913ء

غور و فکر کے لیے چند نکات

1- اُن داخلی اور خارجی عوامل کا تجزیہ کریں جن کے تحت مسلمانوں کو برطانوی حکومت کی طرف اپنے سیاسی رویے میں تبدیلی لانا پڑی اور انھوں نے ہندوؤں کے ساتھ مشترکہ سیاسی پلیٹ فارم بنانے کی کوشش کی؟

2- ہندو جماعتیں ہمیشہ سے مسلمانوں کے مفادات کے خلاف کام کرتی تھیں، آپ کے خیال میں کیا ان کے ساتھ میثاق لکھنؤ ایک غیر فطری معاہدہ تھا؟ کیا اس کے حدود بھی

مسلمان سیاسی طور پر کسی اور امکان پر چل سکتے تھے ۔ اگر آپ بھی اس دور میں مسلم لیگ کے اہم رہنما ہوتے تو آپ کن ترجیحات کو فوقیت دیتے۔ اپنی ترجیحات کے لیے ضروری دلائل بھی پیش کریں۔

3- لارڈ منٹو نے ہندوستان میں آکر جس قسم کے سیاسی عمل کو فروغ دیا، اس سے برطانوی حکومت کو کس قسم کے فائدے مل سکتے تھے؟ تجزیاتی نوٹ لکھیں۔

4- تنسیخِ تقسیمِ بنگال ، مسجد کانپور کے واقعے اور بلقان کی جنگوں میں برطانوی حکومت کی کس پالیسی کی غمازی ہوتی ہے؟

(ب) مختصر جواب دیں۔

I- لارڈ منٹو نے اعتدال پسند سیاسی رہنماؤں کی سرپرستی کیونکر شروع کی؟

II- لارڈ منٹو جاگیرداروں کے لیے خصوصی نشستوں کا اہتمام کیوں کرنا چاہتا تھا؟

III- 1909 ء کے ایکٹ میں مسلمانوں کو کون کون سے سیاسی مفادات حاصل ہوئے؟

IV- 1909 ء کے ایکٹ میں ایک رائے دہندہ کے لیے کون سی شرائط پوری کرنا ضروری تھیں۔ اس سے حکومت کیا مقصد حاصل کرنا چاہتی تھی؟

V- تنسیخ تقسیم بنگال سے مسلمانوں نے حکومت کے بارے میں کیا تاثر قائم کیا؟

VI- سرسید اور ان کے ساتھی علی گڑھ کالج کو کیوں یونیورسٹی کا درجہ دلوانا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں حکومت نے کیا روڑے اٹکائے؟

VII- ترکی کے خلاف برطانوی پالیسی سے ہندوستان کے مسلمانوں پر کیا اثر ہوا؟

VIII- مسجد کانپور کا معاملہ ، بنیادی طور پر انتظامی تھا، اس نے مسلم دشمنی کی صورت کیسے اختیار کر لی۔ اس میں انتظامیہ کے کردار کا جائزہ لیں۔؟

IX- بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں کون سے مسلمان رہنما مختلف طریقوں سے اپنی قوم میں سیاسی شعور پیدا کر رہے تھے؟

X- مسلم لیگ نے 1913 ء میں جو قرارداد پاس کی ، اس سے اس کے کن مقاصد کی نشاندہی ہوتی ہے؟

XI- محمد علی جناح نے میثاقِ لکھنؤ پر جو تبصرہ کیا، اس کا ایک مختصر جائزہ پیش کریں؟

XII- میثاق لکھنؤ کے تحت جو آئینی سفارشات تیار کی گئیں ، ان کے نتیجے میں مسلمانوں

کو کیا مفاد حاصل ہوئے۔

(ج) ہاں یا نہیں میں جواب دیں۔

1- ہندوستان میں آئینی اصلاحات نافذ کر کے انگریز مقامی/مزاحمتی قوتوں کو زیر کرنا چاہتے تھے۔

2- لارڈ منٹو نے انتہا پسند رہنماؤں کی سرگرمیوں کو کم کرنے کے لیے ، ان کی سرپرستی شروع کر دی۔

3- 1909ء کی آئینی اصلاحات میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو حکومتِ خود اختیاری کے سلسلے میں کچھ نہ ملا۔

4- تنسیخِ تقسیمِ بنگال سے یہ بات عیاں ہو گئی کہ حکومت کو تشدد اور مزاحمت سے جھکایا جا سکتا تھا۔

5- برطانوی حکومت بیسویں صدی کے اوائل میں ترکی کی قوت کو اپنے ساتھ ملا کر اسے تقویت دینا چاہتی تھی۔

6- کانپور مسجد کے واقعے میں حکومت ہندوستان کا رویہ حد درجہ تحکمانہ اور رواداری سے عاری تھا۔

7- جنگ عظیم اوّل کے دوران ہندوستان کے رہنما مل کر برطانوی حکومت پر سیاسی دباؤ بڑھانا چاہتے تھے۔

8- میثاق لکھنؤ میں کانگرس کا یہ دعویٰ درست ثابت ہوا۔ وہ ہی ہندوستان کی تمام اقوام کی نمائندہ جماعت ہے۔

(د) نیچے یک بیان کے ساتھ اس کی چند وجوہات دی گئی ہیں۔ یہ وجوہات اپنی جگہ پر درست ہیں تاہم ان میں کوئی ایک سب سے اہم اور بنیادی نوعیت کی ہے۔ ان تمام وجوہات پر کلاس میں بحث کریں اور سب سے بہتر پر ✓ کا نشان لگائیں۔

1- لارڈ منٹو کا ہندوستان میں آئینی اصلاحات پر مبنی سیاسی عمل شروع کرنے کا حقیقی مقصد:

(الف) مقامی سیاست کو اعتدال پسندی کے سیاسی نظریے پر رکھنا تھا۔

(ب) یہاں اپنی حکومت کو مضبوط سیاسی بنیاد فراہم کرنا تھا تاکہ یہ زیادہ سے زیادہ عرصے تک قائم رہے۔

(ج) انتہا پسند گروہوں اور مزاحمتی تحریکوں کے رجحان کو ختم کرنا تھا۔

2- میثاقِ لکھنؤ سے یہ بات عیاں ہو گئی کہ:

(الف) ہندو اور مسلمان باہمی مفادات کے تحت انگریزوں کے خلاف اتحاد قائم کر سکتے ہیں۔

(ب) کانگرس، ہندوستان میں بسنے والی اقوام کی واحد نمائندہ جماعت نہیں ہے۔

(ج) مسلمان علیحدہ تشخص کی حامل ایک قوم ہیں۔

8
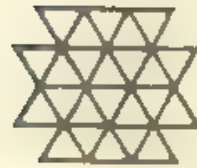
ہندوستانی معاملات

(1914ء تا 1922ء)

میثاقِ لکھنؤ اور اس سے پہلے رونما ہونے والے حالات نے ہندوستان کا پورا سیاسی منظر نامہ تبدیل کر دیا تھا۔ سیاسی جماعتوں کے ساتھ ساتھ عام لوگوں میں بھی سیاسی شعور بڑھ رہا تھا اور وہ اردگرد ہونے والے واقعات کے ان کی زندگیوں پر اثرات کو محسوس کر رہے تھے۔

برطانیہ ایک سامراجی ملک تھا اور یہ ہندوستان کے علاوہ دوسرے ایشیائی اور افریقی ممالک میں بھی اپنا سامراجی نظام پھیلا رہا تھا۔ 1914ء میں انھی حالات کے تحت جنگ عظیم اوّل کا آغاز ہوا۔ ایسے حالات میں وہ ہندوستان میں کسی قسم کی مزاحمت اور انتشار کی حالت کو برداشت نہ کر سکتا تھا۔ برطانیہ کے لیے یہ دَور، سیاسی اور معاشی لحاظ سے حد درجہ نازک تھا۔ انھی حالات میں مسلم لیگ اور کانگرس کا مشترکہ لائحۂ عمل اور اس میں مکمل خود اختیاری کا مطالبہ، برطانوی حکومت کے لیے سخت پریشانی کا باعث تھا۔ یہ دَور کسی قدر سیاسی مزاحمت اور انتشار کا دَور رہا۔ اس دَور کے رجحان کو سمجھنے کے لیے ضروری حالات و واقعات کا یہاں تذکرہ کیا جاتا ہے۔

معاشی حالات :

برطانیہ کے جنگ عظیم اوّل میں ایک اہم فریق ہونے کی وجہ سے، اس کی معاشی ضروریات بڑھ گئی تھیں۔ اس کا براہِ راست ہندوستانی خزانے پر بوجھ پڑا اور ہندوستانی معیشت میں بحرانی صورتحال پیدا ہو گئی۔ 1913-14ء میں مرکزی حکومت کے کل

اخراجات ایک ارب چوبیس کروڑ روپے تھے جو 1920-21ء میں بڑھ کر 2- ارب اڑتالیس کروڑ روپے ہو گئے۔ خزانے کی کمی کو پورا کرنے کے لیے حکومت نے قرضے لینا شروع کر دیے اور اس سے 1913-14ء تا 1920-21ء کے عرصے میں محض سود کا خرچہ دو کروڑ روپے سالانہ سے بڑھ کر سولہ کروڑ روپے ہو گیا۔ حکومتی آمدنی کو بڑھانے کے لیے ٹیکسوں اور کسٹم ڈیوٹی کی شرح میں اضافہ کیا گیا۔ کسٹم ڈیوٹیوں سے حاصل کردہ آمدنی 1913-14ء میں گیارہ کروڑ تھی جو 1920-21ء میں بتیس کروڑ روپے ہو گئی۔ 1915-16ء کے بعد انکم ٹیکس کی شرح میں بھی اضافہ کر دیا گیا۔ 1915-16ء میں انکم ٹیکس سے حاصل کردہ آمدنی 3- کروڑ روپے تھی جو 1919-20ء میں بڑھ کر 23- کروڑ روپے ہو گئی۔

ہندوستان کے حکومتی خزانے پر شدید مالی بوجھ کے ساتھ ساتھ یہاں کی زرعی پیداوار کو مقامی ضروریات سے قطع نظر برآمد کرنا شروع کر دیا گیا۔ اس کی اہم وجہ مختلف محاذوں پر فوجوں کو اجناس مہیا کرنا تھی۔ مثال کے طور پر 1911ء سے 1915ء کے درمیانی عرصے میں چھیاسی لاکھ ٹن گندم برآمد کی گئی۔ اس برآمد کے لیے ہندوستان کے تمام ذرائع نقل و حمل استعمال کیے جا رہے تھے ور داخلی ضروریت کے لیے مختلف منڈیوں میں اجناس کی نقل و حمل نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ واضح رہے کہ ریل گاڑیوں اور دوسرے ذرائع کو فوجی نقل و حمل میں استعمال کیا جا رہا تھا۔ اس صورتحال سے عام صارفین پر اثر پڑا۔ ضرورت کے مطابق رسد نہ ہونے کے باعث خوردنی اشیاء کی قیمتیں قوتِ خرید سے زیادہ ہونے لگیں۔

جنگِ عظیم اوّل (1) کے دوران خوردنی اشیا کی قیمتوں میں اضافے کی حالت یہ تھی کہ چاول کی قیمت میں 61% ، باجرے کی قیمت میں 81% ، چنے کی قیمت میں 111 فیصد ، شکر کی قیمت 173 فیصد ، خوردنی تیلوں کی قیمت میں تقریباً 100 فیصد ، سوتی

---

(1) جنگ عظیم اول کا آغاز 28- جون 1914ء کو ہوا۔ اس کی فوری وجہ آسٹریا کے شہزادہ فرڈی ننڈ (FERDINAND) کا قتل تھا۔ آسٹریا نے سربیا (SERBIA) پر اس بنا پر حملہ کر دیا کیونکہ وہاں ایک دہشت پسند نے شہزادے کو قتل کیا تھا۔ 15- اگست کو آسٹریا کے ساتھی جرمنی نے ہالینڈ اور بلجیئم کو فتح کرتے ہوئے فرانس پر ہلہ بول دیا۔ اس کے جواب میں فرانس نے بھی حملہ کیا مگر انہیں پسپا ہونا پڑا۔ بعد ازاں فرانسیسیوں اور جرمنوں کے درمیان جنگ جاری

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

کپڑے اور دھاگے کی قیمت میں 200 فیصد اضافہ ہوا۔ معاشی بدحالی اور حکومت کی عدم توجہی کے باعث ملک کے اکثر حصوں میں انفلوئنزا کی وبا پھیل گئی۔ صرف 1919ء کے سال میں چودہ لاکھ افراد لقمۂ اجل بن گئے۔ مجموعی طور پر اس بیماری سے ڈیڑھ کروڑ افراد کے قریب لوگوں کی موت ہوئی۔

اس معاشی بدحالی کا براہ راست نچلے اور درمیانے طبقے کے لوگ شکار ہوئے۔ ان حالات کو انگریزوں کی معاشی پالیسی نے مزید خراب کر دیا۔ برطانیہ کی مصنوعات، خاص طور پر کپڑے کی درآمد کے باعث مقامی دیہاتی صنعتوں کا کام تقریباً ٹھپ ہو گیا۔ شہروں میں انگریزی طرز پر نئی فیکٹریوں کے کھلنے سے دیہاتی مزدور شہروں میں آکر کام کرنے لگے۔ اس سے جہاں ایک طرف دیہاتی نظام زندگی (1) بڑی تیزی سے ٹوٹنے لگا وہیں شہروں میں آبادی بڑھنے سے بڑے شہر اور ان سے منسلک مسائل پیدا ہونے لگے۔ اس سے جہاں مجموعی معاشی توازن خراب ہوا انسانی رشتوں پر بھی اس کے منفی اثرات مرتب ہونے لگے۔

رہی۔ اس جنگ میں صرف فرانس کے تیرہ لاکھ سے زیادہ آدمی مارے گئے تھے۔ اس جنگ میں ترکی، جرمنی کا اتحادی تھا۔ پہلی جنگ عظیم کا خاتمہ 11- نومبر 1918ء کو ہوا اور اس میں جرمنی کے خلاف اتحادی ملکوں کی فتح ہوئی۔ ان اتحادی قوتوں میں برطانیہ، فرانس، روس اور امریکہ شامل تھے۔ دوسری طرف جرمنی اور اس کے اتحادی ممالک تھے۔ اس جنگ میں بالواسطہ طریقے اور بہت سی نوآبادیات کو بھی ملوث کر لیا گیا تھا۔ 1919ء میں ورسیلز معاہدہ کے تحت جرمنی پر کئی قیود لگا دی گئیں۔ ان میں فوجی اور معاشی پابندیاں شامل تھیں۔

(1) ہندوستان میں قدیم زمانے سے دیہات کسی قدر ایک خودکفیل اکائی رہا ہے۔ خوراک اور دوسری ضروریات کو مقامی طور پر ہی پورا کیا جاتا تھا۔ کسان سب کے لیے اناج اگاتے اور باقی لوگ ذات پات کے اصول کے تحت مختلف پیشے ور ایک دوسرے کی ضروریات پوری کرتے تھے۔ ایک عرصے تک اکٹھے رہنے سے ان میں ایک معاشرتی جذبہ باہم پیدا ہو جاتا اور وہ ہر قسم کے مسائل میں ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔ دیہات کے برعکس شہروں کی مصروفیات اور طرز معاش کے باعث لوگوں میں جذبہ باہم پیدا ہونا قدرے مشکل ہوتا ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں فاصلے بڑھ جانے سے انسانی تعلقات میں بھی دوری آ جاتی ہے۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

شہروں میں دیہاتی مزدوروں کی کھپت کے لیے کافی صنعتی یونٹ نہ ہونے کے باعث بیروزگاری میں اضافہ ہونے لگا۔ دوسری طرف 1911ء سے 1931ء تک مجموعی آبادی میں تین کروڑ 80 لاکھ اضافہ ہوا۔ آبادی کے تناسب سے روزگار کے مواقع بہت کم تھے۔ اِس صورتحال میں لوگ اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اپنی منقولہ یا غیر منقولہ جائدادوں کو رہن رکھ کر ساہوکاروں سے قرضے لیتے۔ یہ قرضے سود در سود کی بنیاد پر حاصل کیے جاتے تھے۔ آمدنی کے وسائل نہ ہونے کے باعث قرض دار دن بدن سود کے بوجھ تلے دبتے جاتے اور بعد ازاں جائدادیں قرق ہونے کے بعد وہ قلاش ہو کر رہ جاتے۔

برطانیہ، چونکہ ہندوستان کو اپنی نو آبادیات سمجھتا تھا، اس لیے ہندوستان کے مادی وسائل کے ساتھ ساتھ یہاں کے انسانی وسائل کو بھی اپنی اغراض کے لیے استعمال کرنے سے گریز نہ کرتا تھا۔ جنگ عظیم اول کے دوران اس نے مقامی لوگوں کو جبری طور پر فوج میں بھرتی کرنا شروع کر دیا۔ اس کے لیے پنجاب کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی۔ 1916ء کے آخر تک پورے ہندوستان سے دو لاکھ پچیس ہزار نوجوانوں کو فوج میں بھرتی کیا گیا۔ 1917ء میں مختلف محاذوں پر برطانیہ کی مخدوش صورتحال کے پیش نظر ایک مرکزی بھرتی بورڈ تشکیل دیا گیا۔ اس بورڈ نے 1918ء میں تین لاکھ سترہ ہزار نوجوانوں کو بھرتی کیا۔ بھرتی کے لیے جو طریقے اپنائے جاتے تھے۔ اس کا تذکرہ عاشق حسین بٹالوی نے اپنی کتاب 'اقبال کے آخری دو سال' میں اس طرح کیا ہے:

"ضلع کا ڈپٹی کمشنر، افسر مال کے سر پر، افسر مال تحصیلدار کے سر پر اور تحصیلدار نمبردار کے سر پر تلوار لے کر کھڑا ہو جاتا تھا کہ جوانوں کی مطلوبہ تعداد جہاں سے بن پڑے اور جس طرح ممکن ہو، مہیا کی جائے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ پورے گاؤں کو سرکاری اہل کار نرغے میں لے لیتے تھے اور ساری آبادی کو گھروں سے نکال کر قطار میں کھڑا کر دیا جاتا تھا۔

دنیا میں صنعتی انقلاب کے بعد شہر بڑے ہونے لگے تو شہروں کے انسانی ماحول میں مادی [illegible] شروع ہوئی۔ اس سے معاشرتی مسائل بڑھتے گئے۔

• جس جوان کی طرف سرکار کی انگلی اٹھ جاتی تھی، اسے پابجولاں ضلع کے صدر مقام میں بھیج دیا جاتا تھا، اور وہ 'رضاکارانہ' طور پر بھرتی کیا ہوا رنگروٹ تصوّر ہوتا تھا۔"

"۔۔۔۔ حکومت کے جابرانہ طرزِ عمل سے پنجاب میں بے شمار فساد ہوئے، دیہات کے باشندوں نے مشتعل ہو کر بھرتی کرنے والے افسروں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ بڑے بڑے بلوے ہونے شروع ہو گئے اور بعض جگہ گاؤں کی پوری آبادی کو گرفتار کر کے عدالتوں میں پیش کر دینا پڑا۔"

سیاسی حالات

انگریزوں کی ہندوستان میں نافذ کردہ پالیسیوں اور خاص طور پر جنگ عظیم اول کے زمانے میں کیے گئے اقدامات سے عام لوگوں کا حکومت پر اعتماد مکمل طور پر ختم ہو رہا تھا۔ اس صورتحال کے اہم محرکات یہ تھے:۔

1- مقامی معیشت حد درجہ نازک حالات سے گزر رہی تھی اور غریب اور درمیانے طبقے کے لوگ ان حالات میں سخت پریشان تھے۔

2- فوجی بھرتی کے طریقِ کار سے ہندوستان کے شمالی اور مغربی علاقہ جات میں انگریزوں کے خلاف شدید نفرت پھیل چکی تھی۔

3- مسلمانانِ ہند میں انگریزوں کے خلاف جذبات پیدا ہو رہے تھے اور اس کی وجہ اسلامی ممالک خصوصاً ترکی کی طرف ان کا مخاصمانہ رویّہ تھا۔ اِس پر مستزاد یہ کہ ہندوستان سے بھرتی کیے جانے والے مسلمانوں کو اسلامی ممالک کے خلاف لڑنے کے لیے بھیجا جا رہا تھا۔

4- ہندوستانی سیاست میں میثاق لکھنؤ سے مسلمانوں اور ہندوؤں میں مفاہمت کی فضا پیدا ہو چکی تھی اور وہ خالصتاً سیاسی بنیادوں پر جلد یا بدیر انگریزوں کی سامراجی حکومت کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس سے کسی ابہام کے بغیر، انگریزوں کے مقابل دونوں اقوام نے ایک مشترکہ محاذ تیار کر لیا تھا۔

مذکورہ بالا صورتحال میں انگریزوں کے خلاف سرگرم مختلف افکار کے حامل

گروہوں اور تنظیموں نے بھرپور طریقے سے اپنی سرگرمیاں تیز تر کر دیں۔ ان میں سے کئی تنظیمیں روس کے انقلاب (1917ء) سے متاثر تھیں اور خفیہ طور پر کارروائی کر رہی تھیں۔ ان میں سے چند ایک تحریکوں کا تذکرہ یہاں کیا جاتا ہے:۔

ریشمی رومال تحریک

ہندوستان میں سیاسی شعور کی ابتدا اور پرورش انگریزوں کے پیدا کردہ تعلیمی، معاشی اور سیاسی حالات میں ہوئی۔ ان حالات کا سب سے پہلے مراعات یافتہ طبقے پر اثر ہوا۔ یہ لوگ سیاسی عمل کو، انگریزوں کی مرضی کے مطابق آئینی رکھنا چاہتے تھے۔ اس کی واضح وجہ یہ تھی کہ ہندوستان میں انگریزوں کے قائم کردہ نظام کے مضر اثرات کا براہ راست اثر اس طبقے پر بہت کم تھا۔ ان کے برعکس نچلے اور درمیانے طبقے کے لوگوں پر اقتصادی بوجھ ناقابل برداشت حد تک بڑھ جانے سے ان میں انگریزوں کے لیے شدید نفرت اور احتجاج ابھر رہا تھا۔ یہ لوگ انگریزی تعلیم کی بجائے روایتی طرز تعلیم کو ہی بہتر سمجھتے تھے۔

انگریزوں کے دور میں روایتی طرز تعلیم کا سلسلہ شاہ ولی اللہ کے جانشینوں نے شروع کیا۔ اسی سلسلے میں دارالعلوم دیوبند اور کئی دوسرے ادارے قائم کیے گئے۔ یہ ادارے محض رسمی تعلیم ہی نہ دیتے تھے بلکہ انگریزوں کے پیدا کردہ حالات میں مسلمانوں کی ذمے داریوں کے بارے میں بھی آگہی پیدا کر رہے تھے۔ یہ مذہبی، معاشرتی امور کے ساتھ ساتھ سیاسی میدان میں بھی قابلِ قدر خدمات انجام دے رہے تھے۔ ان میں دارالعلوم دیوبند خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

جنگ عظیم اول کے دوران ترکی اور دوسرے اسلامی ممالک میں برطانوی عزائم کے باعث، ہندوستانی مسلمانوں میں شدید ردعمل موجود تھا۔ 1915ء میں دیوبند کے ایک عالم مولانا محمود حسن نے ہندوستان چھوڑ کر حجاز (سعودی عرب) کا رخ کیا۔ وہ یہاں رہ کر ترکوں کے لیے ہر قسم کی ممکنہ امداد فراہم کرنا چاہتے تھے۔ یہاں انھوں نے حجاز کے گورنر سے ترکوں کے حق میں فتویٰ جاری کروایا تاکہ تمام مسلمانان ہند مل کر انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ اس فتوے میں زور دیا گیا کہ مسلمان

جہاد میں ذاتی طور پر شامل ہوں۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو روپیہ پیسہ یا مال اسباب دے کر، غرض کسی بھی طریقے سے جہاد میں شریک ہوں۔

مولنا محمود حسن کے حجاز جانے سے قبل بہت سے نوجوان طالب علم ہندوستان سے خفیہ طور پر افغانستان چلے گئے۔ ان میں سے 14- طالب علم لاہور کے کالجوں میں زیر تعلیم تھے۔ اسی زمانے میں ایک ہندو انقلابی کی سرکردگی میں ایک گروہ بھی کابل پہنچ گیا۔

ہندوستان سے افغانستان آنے والے انقلابی شاہ افغانستان کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ ہندوستان پر حملہ کر کے انگریز حکومت کو جنگ میں الجھا دے۔ اس منصوبے کا مقصد انگریزوں کے حریف جرمنی اور ترکی کے ہاتھ مضبوط کرنا تھا، اور اسی ماحول میں انگریزوں کے خلاف اسلامی تحریکات کو تیز تر کرنا تھا۔ کابل (افغانستان) میں ایسی تمام کارروائیوں کی قیادت مولانا عبیداللہ سندھی (1) کر رہے تھے۔

مولانا سندھی نے کابل میں اپنی پوزیشن کو بہتر بنانے کے بعد مستقبل کے منصوبوں کی اطلاع مولنا محمود حسن کو حجاز میں پہنچانا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے چند ریشمی رومالوں پر برطانیہ کے خلاف مسلمانوں کے اتحاد کے منصوبے کو تحریر کیا اور ان کو ایک شخص کے کوٹ کے اندر سی دیا گیا۔ اس شخص نے یہ خط سندھ میں کسی کے حوالے کرنا تھے اور پھر اس نے انھیں حجاز پہنچانا تھا۔

---

(1) مولنا عبیداللہ سندھی (1873ء-1944ء) سیالکوٹ کے علاقے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے اہل خانہ سکھ تھے۔ آپ نے اسلام قبول کر لیا اور سندھ میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ بعد میں آپ دارالعلوم دیوبند چلے گئے اور وہاں مولنا محمود حسن کے زیر نگرانی تعلیم مکمل کی۔ انہی کی ہدایت پر آپ نے دہلی میں ایک مدرسہ شروع کیا۔ بعد ازاں خفیہ سیاسی سرگرمیوں میں مصروف رہے اور 1915ء سے 1921ء تک افغانستان میں ہی مقیم رہے۔ ان کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا اور انگریزوں نے ان کی تنظیم پر سختی شروع کر دی۔ رہائی ہونے پر آپ ہندوستان واپس آئے اور اپنی صاحبزادی کے پاس خان پور (بہاولپور) میں رہنے لگے۔ یہیں مولنا کا انتقال ہوا۔

راستے میں پہلا شخص جس کے کوٹ میں ریشمی رومال سیے گئے تھے نے اپنے ایک انقلابی ساتھی کی خیریت اس کے والد کو پہنچانا چاہی۔ یہیں پر ریشمی رومالوں کا راز فاش ہو گیا اور اس شخص کو انگریز حکام کے حوالے کر دیا گیا۔ اسی دوران حجاز میں ترکوں کے خلاف بغاوت ہو گئی۔ بغاوت کرنے والا مکہ کا میئر تھا۔ اُس نے مولانا محمود حسن کو پکڑ کر انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ انگریزوں نے مولانا محمود حسن کو جزیرہ مالٹا میں قید کر دیا۔ اس طرح انگریزوں کے خلاف یہ مزاحمتی تحریک آگے نہ بڑھ سکی۔

ہوم رُول تحریک

میثاق لکھنؤ، ہندوؤں اور مسلمانوں میں لبرل نظریات کے حامی رہنماؤں کے آئینی اور سیاسی اشتراکِ عمل کا آئینہ دار تھا۔ اِس معاہدے کی اہمیت کا احساس ایک مخصوص پڑھے لکھے طبقے تک ہی محدود تھا۔ 1916ء میں ہوم رُول (HOME RULE) تحریک نے اس پیغام کو کسی قدر عوام میں پہنچا دیا۔

جنگ عظیم اوّل کے شروع ہوتے ہی برطانیہ نے ہندوستانی اقوام سے مکمل تعاون کی اپیل کی اور یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ ہندوستان میں جلد از جلد آئینی اصلاحات نافذ کرے گا۔ جنگ کے پھیلاؤ کے باعث حکومتِ برطانیہ نے اِس سلسلے میں ہر قسم کی پیش رفت کو سرد خانے میں ڈال دیا۔ اس سے ہندوستان کے لبرل نظریات کے حامی رہنماؤں میں بھی سخت مایوسی پھیل گئی۔ 1916ء میں ایک تنظیم 'ہوم رول لیگ' کے نام سے قائم کی گئی۔ اس کے سرکردہ رہنماؤں میں مسز اینی بیسنٹ (1) اور بال گنگا دھر تلک تھے۔ اُس وقت تک تلک نے اپنے متشدد رویوں میں خاصی لچک پیدا کر لی تھی۔ اپنی سرگرمیوں کے اعتبار سے یہ تحریک خاصی متحرک رہی۔ اس کے اہم مطالبات یہ تھے:

---

(1) مسز اینی بیسنٹ (1847ء-1933ء) نے انگلستان، فرانس اور جرمنی سے تعلیم حاصل کی۔ بعد میں ایک پادری سے شادی کر لی۔ پانچ سال کے بعد میاں بیوی میں علیحدگی کے بعد اینی نے مذہبی دلچسپی ترک کر کے پس ماندہ طبقوں کے لیے کام شروع کر دیا۔ وہ 1893ء میں ہندوستان آئیں اور یہاں بنارس میں ایک کالج قائم کیا۔ آپ نے 1916ء میں انگریزوں کے

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

1- ہندوستان میں ہر سطح پر، گاؤں سے لے کر صوبائی اور مرکزی قانون ساز اداروں کو مکمل خودمختاری دے دی جائے۔

2- ان اداروں کو اتنے اختیارات دیے جائیں جتنے انگریزوں کے دوسرے مقبوضہ علاقوں میں خودمختار نظامات حکومت کو حاصل ہیں۔

ہوم رول لیگ کی طرف سے حکومتی پالیسیوں پر سخت تنقید کی گئی۔ مسز بسنٹ ان دنوں دو انگریزی اخبارات شائع کرتی تھیں۔ ہوم رول لیگ کا خیال تھا کہ ہندوستان کو حکومت خوداختیاری دینا، برطانیہ کی طرف سے تحفہ نہیں بلکہ یہ ہندوستانیوں کا حق ہے۔ یہ تحریک بہت جلد مقبول ہونے لگی اور اس کی واضح وجہ ہندوستان میں اس وقت کا سیاسی ماحول تھا۔ تحریک کی کامیابی کو دیکھ کر انگریز حکومت نے مسز بسنٹ کو گرفتار کر لیا۔ اس سے تحریک اور بھی متشدد اور تیز ہو گئی۔

مسز بسنٹ کے گرفتار ہونے کے بعد قائدِ اعظم اس تحریک میں شامل ہو گئے۔ آپ کو ہوم رول لیگ بمبئی کا صدر چن لیا گیا۔ آپ نے حکومت برطانیہ پر شدید تنقید کی اور حکومت پر امن عامہ کے نام پر شہریوں کے بنیادی حقوق سلب کرنے کی مذمت کی۔

ہوم رول لیگ نے اپنے مطالبات کے حق میں رائے عامہ ہموار کرنے کی غرض سے ایک وفد انگلستان بھیجنے کا منصوبہ بنایا۔ حکومت نے ان رہنماؤں کے پاسپورٹ ضبط کر لیے۔ تاہم انھی دنوں حکومت نے اگست 1917ء کو ہندوستان میں دستوری اصلاحات کے وعدے کی تجدید کر دی۔ یہ اعلان سیکرٹری آف سٹیٹ برائے ہندوستان (وزیر ہند) مسٹر مانٹیگو نے کیا۔ اس اعلان میں انتظامیہ کے ہر شعبے میں ہندوستانی باشندوں کی شمولیت کی ضرورت پر زور دیا گیا اور یہاں ایک ذمہ دارانہ طرز حکومت کے لیے تجاویز مرتب کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

خلاف ہوم رول تحریک شروع کی۔ اس میں انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ آپ نے بھگوت گیتا کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا۔ ان کی موت کے بعد ان کی میت کو ہندوؤں کے طریقے پر جلا دیا گیا۔

اس اعلان کے بعد مسٹر ماٹیگو ہندوستان آئے۔ انھوں نے دہلی، کلکتہ، مدراس اور بمبئی کا دورہ کیا اور مختلف سیاسی رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں۔ اس کی رپورٹ 1918ء میں شائع کی گئی۔ اسی سال مسلم لیگ اور کانگریس کا مشترکہ اجلاس دہلی میں ہوا۔ جس میں اس رپورٹ کو مسترد کر دیا گیا۔ اسی اجلاس میں ترکی کے تحفظ، مسلمانوں کے متبرک مقامات کی حفاظت اور خودمختار حکومت کے قیام کے لیے قراردادیں پاس کی گئیں۔

رولٹ ایکٹ

جنگ عظیم اول کے دوران برطانیہ کی معاشی پالیسیوں، اور ہندوستان میں بڑھتے ہوئے سیاسی شعور کے باعث بڑی تیزی سے تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ حکومت اس شعور کو محض آئینی اصلاحات تک مرتکز رکھنا چاہتی تھی اور یہ عمل اس قدر سست اور بے اثر تھا کہ عام لوگوں تک اس کے کوئی فوائد نہ پہنچ رہے تھے۔ عام لوگوں میں معاشی اور سیاسی بے چینی سے قطع نظر، انگریز صرف اپنی سیاسی ساکھ کو ہر قیمت برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ اس میں ان کی کوشش تھی کہ یہاں ایسے حالات کو پیدا ہونے سے ممکنہ طور روکا جائے۔ جن میں نہیں ہندوستان کو چھوڑنا پڑے یا ان کے یہاں اقتدار کی مدت کم ہو جائے۔ اس مقصد کے لیے وہ انتہائی اقدام اٹھانے سے بھی گریز نہ کرتے تھے۔

حکومت نے 1917ء میں ایک کمیٹی قائم کی، اس کا مقصد حکومت کے خلاف ہونے والی سیاسی سرگرمیوں اور خفیہ کارروائیوں کا جائزہ لینا اور ان کی روک تھام کے لیے تجاویز مرتب کرنا تھا۔ 1918ء میں اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ پر 1919ء میں ایک ایکٹ نافذ کر دیا گیا۔ کمیٹی کے سربراہ جسٹس سڈنی رولٹ تھے، اس لیے اس ایکٹ کو 'رولٹ ایکٹ' کا نام دیا گیا۔ اس ایکٹ کے اہم اجزا یہ تھے۔

1- کسی بھی شخص کی شخصی آزادی کو کالعدم کیا جا سکتا تھا۔ واضح رہے کہ شخصی آزادی میں کسی بھی فرد کی بولنے اور سوچنے کی آزادی شامل ہوتی ہے۔ اس ایکٹ کے تحت کسی بھی شخص کی زبان بندی کی جا سکتی تھی۔

2- کوئی وجہ بتائے بغیر کسی شخص کو گرفتار کیا جا سکتا تھا۔

3- سیاسی سرگرمیوں کو حسب ضرورت دبایا جا سکتا تھا۔

رولٹ ایکٹ کے نفاذ سے پورے ہندوستان میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہو گئی۔ رولٹ کمیٹی پر قائداعظم نے ان الفاظ میں تبصرہ کیا:۔

"مجرمانہ سیاسی سازش کا مسئلہ رولٹ کمیٹی نے اس طرح اٹھایا ہے، جیسے اچانک کچھ جرائم پیشہ قبائل ہم میں پیدا ہو گئے ہیں۔ اب ضروری ہے کہ ایک قانون کے ذریعے ان کا خاتمہ کیا جائے، لیکن قانون بنانا ہی مرض کا علاج نہیں۔ حکومت کو اپنی پالیسی تبدیل کرنی چاہیے۔ یہ "مجرمانہ سازشیں" خود بخود ختم ہو جائیں گی۔ اس کمیٹی نے ایسی سفارشات پیش کی ہیں، جنھیں کوئی مہذب حکومت قبول نہیں کر سکتی بلکہ ان کا تصور تک نہیں کر سکتی۔"

(جی الانا ۔ قائداعظم محمد علی جناح، ایک قوم کی سرگزشت)

جب قانون نافذ ہو گیا تو قائداعظم نے کہا:۔

"۔۔۔ انصاف کے بنیادی اصولوں کو ختم کر دیا گیا ہے اور لوگوں کے دستوری حقوق کو اس وقت ختم کر دیا گیا ہے جب کہ حکومت کو کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس سے کونسل کے ایوان میں عوام کے نمائندوں کی رائے اور باہر عوام کے جذبات اور احساسات کا بالکل خیال نہ رکھنا، ظاہر کرتا ہے کہ جو حکومت امن کے زمانے میں اس قسم کے قانون کو منظور کرے، مہذب حکومت کہلانے کی مستحق نہیں ہے۔"

(ایضاً)

رولٹ ایکٹ کے نفاذ پر احتجاج کرتے ہوئے قائداعظم اور ان کے ساتھیوں نے قانون ساز مرکزی کونسل کی ممبرشپ سے استعفی دے دیا۔ ملک کے ہر حصے میں احتجاجی جلسے جلوس شروع ہو گئے۔ اس طرح ایک مؤثر تحریک شروع ہو گئی۔ اس تحریک میں

موہن داس کرم چند گاندھی (1)، ہندوؤں کے ایک مقبول رہنما کی صورت میں متعارف ہوئے۔ انھوں نے پورے ملک میں ہڑتال کی اپیل کی جو بڑی کامیاب رہی۔

سانحۂ جلیانوالہ باغ

رولٹ ایکٹ پر احتجاج کے سلسلے میں پنجاب میں حالات خاصے خراب ہو رہے تھے۔ اس وقت پنجاب کا گورنر اڈوائر (O'DWYER, SIR MICHAEL) (1864ء - 1940ء) تھا۔ 1885ء میں انڈین سول سروس میں شامل ہوا تھا اور 1913ء سے 1919ء تک پنجاب کا گورنر رہا۔ بعد ازاں ایک محب وطن انقلابی نے اسے لندن میں گولی مار دی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ہندوستان کو انگریزوں نے تلوار سے حاصل کیا ہے اور اسی طریقے سے ہی کاروبار حکومت چلایا جا سکتا ہے۔ وہ ہندوستان میں کسی بھی بہتر تبدیلی کا مخالف تھا۔ اس تناظر میں وہ ان پڑھے لکھے مقامی لوگوں کا

---

(1) گاندھی، موہن داس کرم چند۔ (1869ء - 1948ء) بھارت کے شہر کاٹھیاواڑ (گجرات صوبہ) میں پیدائش ہوئی۔ 1889ء میں لندن سے بیرسٹری کرنے کے بعد جنوبی افریقہ چلے گئے۔ وہیں قیام کے دوران وکالت ترک کر کے 1900ء میں نسل پرست قوانین کے خلاف جدوجہد شروع کر دی۔ 1905ء میں مکمل طور پر مغربی بودوباش ترک کر کے پہلے کھدر کا سادہ تہبند کرتا اور پگڑی پہنتے رہے اور بعدازاں صرف لنگوٹ اور چادر اوڑھنے لگے۔ 1915ء میں ہندوستان واپس چلے آئے۔ 1919ء میں باقاعدہ سیاست کا آغاز کیا اور برطانوی تسلط کے خلاف پر امن عدم تعاون اور ستیہ گرہ کی تحریک شروع کی۔ ان کے سیاسی نصب العین میں متحدہ ہندوستان کی آزادی، مقامی اشیا بالخصوص سوتی مصنوعات کا احیا اور چھوت چھات کا خاتمہ شامل تھے۔ ہندوؤں نے آپ کو مہاتما کا لقب دیا۔ 1931ء میں گول میز کانفرنس میں کانگرس کی نمائندگی کی۔ کئی مرتبہ جیل میں رہے۔ 1942ء میں ہندوستان چھوڑ دو تحریک چلائی۔ یہ تحریک نہ چل سکی تو ستیہ گرہ کی تحریک شروع کر دی گئی۔ اس تحریک میں گرفتار ہوئے۔ 1944ء تک آپ جیل میں رہے۔ تقسیم ہندوستان کے موقع پر فسادات کو روکنے کے لیے مرن برت رکھ لیا۔ 30- جنوری 1948ء کو نتھو رام ایک مہاسبھائی ہندو نے گولی مار کر قتل کر دیا۔ ایم کے گاندھی نے عدم تشدد کے فلسفے کا پرچار کیا۔ انھوں نے سیاست میں مذہبی اور مبہم انداز کو بڑھاوا دیا۔

بھی سخت مخالف تھا جو ہندوستان میں آئینی اصلاحات کے لیے کوشاں تھے۔

10- اپریل 1919ء کو ایم کے گاندھی کو گرفتار کر لیا گیا۔ گرفتاری کی خبر پر لوگوں میں شدید ردّعمل ہوا۔ اگلے دن امرتسر (مشرقی پنجاب) کے دو اہم رہنماؤں ڈاکٹر سیف الدین کچلو (1) اور ڈاکٹر ستیہ پال کو گرفتار کر لیا گیا۔ یہ دونوں رہنما انگریزوں کے خلاف تحریک میں اہم کردار ادا کر رہے تھے۔ ان کی گرفتاری پر امرتسر کے لوگوں نے ایک بڑا جلوس نکالا اور ڈپٹی کمشنر کی رہائش گاہ کا رخ کیا۔ راستے میں پولیس نے جلوس پر گولی چلا دی۔ لوگ مشتعل ہو گئے اور انھوں نے انگریزوں کی املاک اور تجارتی اداروں کی توڑ پھوڑ شروع کر دی۔ کئی انگریزوں کو ہلاک کر دیا گیا۔ آخر فوج طلب کی گئی اور حالات پر قابو پا لیا گیا۔

امرتسر میں بگڑتی صورتحال کے پیش نظر جنرل ڈائر DYER, GENERAL REGINALD (1864ء - 1927ء) جو اس وقت اس علاقے کا فوجی کمانڈر تھا نے امرتسر میں ہر قسم کے جلوس اور جلسوں کی ممانعت کا حکم جاری کر دیا۔ 13- اپریل کو بیساکھی کا تہوار تھا۔ امرتسر کے جلیانوالہ (2) باغ میں ایک بہت بڑا مجمع اکٹھا ہو گیا۔ قریباً چار بجے شام کو یہاں جلسہ شروع ہوا۔ جب جنرل ڈائر کو اپنے احکامات کی خلاف ورزی کا

---

(1) ڈاکٹر سیف الدین کچلو 1886ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے۔ پہلے امرتسر، پھر علی گڑھ، کیمبرج اور جرمنی سے تعلیم حاصل کی۔ 1912ء میں بیرسٹری شروع کی۔ آپ امرتسر کی رفاہی تنظیم انجمن اسلامیہ کے کاموں میں حصہ لینے لگے۔ 1919ء میں رولٹ ایکٹ کے خلاف تحریک میں حصہ لیا۔ حکومت نے مقدمہ چلایا اور آپ کو بیس سال قید کی سزا دے دی گئی۔ بعدازاں آپ کو رہا کر دیا گیا۔ رہائی کے بعد آپ نے سیاسی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ جاری رکھا۔ 1928ء میں مسلم لیگ کے سیکرٹری بنے۔ تقسیم ہندوستان پر امرتسر سے دہلی چلے گئے اور وہاں تجارت شروع کر لی۔ حکومت روس نے انھیں امن کے لیے لینن انعام سے بھی نوازا۔ آپ کا انتقال دہلی میں ہوا۔

(2) یہ جگہ امرتسر شہر کے وسط میں واقع ہے جو ناہموار کھردری زمین کا مستطیل میدان تھا۔ اس کے چاروں طرف مکانات اور ایک جانب دو میٹر اونچی دیوار تھی۔ اس میدان میں داخلے اور باہر جانے کا ایک ہی راستہ تھا۔

پتہ چلا تو وہ بہت مشتعل ہوا۔ اُس نے فوراً اپنے ساتھ نوے سپاہی لیے اور جلیانوالہ کے باغ میں پہنچ گیا۔

ڈائر نے نہتے لوگوں پر کسی قسم کے انتباہ کے بغیر، گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ غیر مسلح مجمع پر 1650 راؤنڈ کارتوس چلائے گئے۔ سرکاری اندازے کے مطابق 379 افراد ہلاک اور 1200 زخمی ہوئے۔ گولیاں تقریباً 15 منٹ تک چلتی رہیں۔ جن لوگوں نے دیوار پر چڑھ کر جان بچانے کی کوشش کی، انھیں نیچے اتار کر مار دیا گیا۔ زخمیوں کو کسی قسم کی طبی امداد تک نہ دی گئی۔

15- اپریل 1919ء کو امرتسر اور لاہور میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ چند روز بعد گوجرانوالا، گجرات اور لائل پور (فیصل آباد) کے اضلاع میں بھی مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ مارشل لاء کے نفاذ سے جبر و تشدد کا ایک سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ اس کی داستان اگرچہ بہت طویل ہے، محض ایک اندازے کے درج ذیل واقعات پیش کیے جاتے ہیں۔

1- امرتسر کے ایک بازار میں ایک انگریز عورت کو چند لوگوں نے مارا پیٹا تو وہ اپنی جان بچانے کے لیے ایک گلی کی طرف بھاگی۔ وہاں بھی اسے زدوکوب کیا گیا۔ بعد ازاں چند لوگوں نے اسے گلی سے اٹھا کر ہسپتال پہنچا دیا۔ اس واقعے کے بعد اس گلی سے گزرنے والوں پر پابندی لگا دی گئی کہ وہ اس گلی سے رینگ کر گزریں۔ جو شخص اس حکم کی تعمیل نہ کرتا، اسے سخت سزا دی جاتی۔ بعدازاں اس گلی کا نام 'رینگنے والی گلی' پڑ گیا۔

2- لاہور کے طلبہ کو حکم دیا گیا کہ وہ مئی کی سخت دھوپ میں اپنے سروں پر بستر رکھ کر تقریباً 40 کلومیٹر کا سفر کریں۔

3- لاہور کے باشندوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی موٹر کاریں، بائیسکل، لیمپ اور بجلی کے پنکھے فوج کے حوالے کر دیں۔ اس سلسلے میں ایک ہندو جج کی گاڑی بھی ان سے چھین لی گئی۔ شہر میں بجلی اور پانی کی سپلائی بھی بند کر دی گئی۔

4- مارشل لاء کے احکام شہر کے معزز اور مشہور لوگوں کی رہائش گاہوں پر چسپاں کیے جاتے اور ان اشتہارات کی حفاظت کا ذمہ ان گھروں کے مکینوں کا ہوتا تھا۔ ان

لوگوں میں پنجاب کے چوٹی کے سیاست دان سر فضل حسین بھی شامل تھے۔

دیال سنگھ کالج، لاہور کی دیوار پر کسی نے انگریزوں کے خلاف ایک اشتہار لگا دیا۔ اس کی ذمے داری کالج کے پرنسپل پر عائد کی گئی اور انھیں جرمانے کی سزا دی گئی۔

مجموعی طور پر، انگریزوں کے ان جابرانہ اقدام سے پورا ہندوستان بالعموم اور پنجاب بالخصوص ایک جیل خانے میں بدل چکا تھا۔

تحریکِ خلافت

"سوال یہ تھا کہ کیا مسلمان اپنے ہم وطنوں پر کسی حد تک بھروسہ کر سکتے ہیں؟ نیز یہ کہ اگر انھوں نے ہندوؤں کے ساتھ متحد ہونے کا فیصلہ کر لیا تو مسلم ملت کی منزلِ مقصود کے اس تعقل کا کہ مسلمان برعظیم میں ایک آزاد و خوددار قوم کی حیثیت سے رہنا چاہتے ہیں، کیا حشر ہوگا؟ کیا یہ مقصد اس صورت میں زیادہ بہتر طریقے پر حاصل ہو سکے گا کہ مسلمان انگریزوں کے ساتھ اتحاد کر لیں؟ وہ ان سوالوں کا کوئی اطمینان بخش جواب دریافت نہیں کر سکے، کیوں کہ جمہوریت میں اقلیت کے وجود کو بہت سے خطرات لاحق ہوتے ہیں۔ اقلیت کے لیے اکثر کنوئیں اور کھائی کے درمیان انتخاب کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے، اس کی راہ میں پھولوں کا فرش بچھا ہوا نہیں ہوتا .... بیسویں صدی کی پہلی دودہائیوں میں یہ احساس بڑھتا رہا کہ ہندوؤں کے ساتھ اتحادی معاہدہ مسلمانوں کے وقار اور ان کے مفادات کے زیادہ مطابق ہوگا۔

ملت کے ان تمام فکری رجحانات میں، جو ایک دوسرے سے جُدا نہیں تھے، کوئی امتزاج پیدا ہونا ناگزیر تھا، مگر اس کے لیے کچھ مہلت ضروری تھی۔ اس دوران میں اتحاد اسلامی کے جذبات اور انگریزوں کی حکومت کو ختم کر دینے کی خواہش مسلمانوں میں بہت زور پکڑ گئی۔"

(برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ) ص 341-42)

بیسویں صدی کے دوسرے اور تیسرے عشرے میں سیاسی شعور کی جو رو چلی ۔اس میں 'بائیکاٹ' 'احتجاج' اور 'جلوس جلسوں' کی صلاحیں شامل ہو گئیں اور ان تمام سرگرمیوں کو بھرپور طریقے پر اپنایا بھی گیا۔ تحریک خلافت اس قسم کی سیاست کا نقطۂ عروج تھی۔ تحریک خلافت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے اس کے پس منظر کو بہتر طور پر سمجھا جائے۔

خلافت اور اس کا پس منظر

مسلم سلطنت ، 622 ء اور 732 ء کے درمیان دنیا کے مختلف علاقوں میں بڑی تیزی سے پھیلی ۔ 732 ء تک مسلم افواج مشرقِ وسطیٰ ، شمالی افریقہ ، سندھ اور سپین کے بعد جنوبی فرانس کے علاقوں تک پہنچ چکی تھیں۔ یہ تمام فتوحات اور وسعت سلطنت اموی خاندان کے دَور حکومت میں ہوئی۔ 750 ء میں اموی خاندان کے بعد خاندان عباسی نے حکومت سنبھالی۔ عباسی حکومت کے آخری دَور میں مسلم ریاست میں خارجی حملوں کے باعث انتشار پھیلنے لگا اور چھوٹی چھوٹی ریاستیں جنم لینے لگیں۔ گیارھویں صدی عیسوی میں سلجوق ترکوں نے حملے کیے اور فلسطین کے علاقوں پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ 1258 ء میں منگولوں کے حملوں سے عباسی خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہوا۔

قسطنطنیہ پر ترکوں نے 1453 ء میں قبضہ کیا اور اس کا نام استنبول رکھ دیا۔ یہاں پہلے ایک عیسائی بادشاہ کی حکومت تھی۔ یہاں سولھویں صدی میں عثمانی ترکوں نے ایک مضبوط سلطنت قائم کی ۔ عثمانی سلطنت کی بنیاد عثمان اوّل نے ڈالی۔ اسی کے نام پر اس خاندان کی حکومت کو عثمانیہ کہا جاتا ہے۔ اس خاندان کے کُل 38 سلاطین ہوئے۔ آخری حکمران سلطان عبدالحمید تھا ۔ جس کو معزول کر کے مصطفیٰ کمال پاشا نے انگریزوں کے نامزد کردہ شخص کو خلیفہ بنایا، جسے بعد میں معزول کر دیا گیا تھا۔

1850 ء تک سلطنت عثمانیہ میں سے مصر اور عرب نے خودمختاری حاصل کر لی اور الجزائر پر فرانسیسیوں نے قبضہ کر لیا۔ بلقان (1) کے علاقوں میں یونان نے 1830 ء میں آزادی حاصل کر لی اور اس کے ملحق علاقے بھی خود مختار ہو گئے۔ 1844 ء میں روس

1- حاشیہ اگلے صفحے پر

کے حاکم زار نکولس نے عثمانی سلطنت کو 'یورپ کا بیمار آدمی' قرار دے دیا۔ اس کے بعد یورپ کے ممالک اس کے خاتمے کا انتظار کرنے لگے۔ تاہم برطانیہ اور فرانس نے عثمانی سلطنت کے خاتمے کو روکنے کے لیے کافی کوششیں کیں۔ اس دور میں وہ عثمانی سلطنت کو روسی اثر کے روکنے کے لیے اہم دیوار سمجھتے تھے۔ اس ضمن میں انگریزوں اور فرانسیسیوں نے عثمانیوں کی طرف سے ایک جنگ (کریمیہ) بھی روس کے خلاف لڑی۔ اگرچہ اس جنگ میں روسیوں کو شکست ہوئی تاہم سلطنت عثمانیہ کا زوال بدستور جاری رہا۔ رومانیہ نے 1859ء میں ترکوں کے اثر سے آزادی حاصل کر لی۔ 1875ء میں بلقان کی ریاستوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ ان بغاوتوں میں روس کو ترکوں کے خلاف محاذ آرائی کرنے کا موقع مل گیا۔ عثمانیوں نے ان بغاوتوں کو دبانے کی کوششیں کیں مگر علیحدگی کا یہ عمل رک نہ سکا۔ آخرکار ایک معاہدے کے تحت روسیوں نے آزاد بلغاریہ کے کثیر علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ برطانیہ کو اس معاہدے پر اعتراض تھا۔ اُس نے سفارتی کوششیں کر کے تمام یورپی اقوام کو روسیوں کے خلاف متحد کر دیا۔ اس سلسلے میں ایک مشترکہ کانفرس (کانگرس آف برلن 1878ء) میں برطانیہ کو یونان اور دوسری یورپی قوتوں کو سلطنتِ عثمانیہ کے کچھ علاقوں پر اختیار حاصل ہو گیا۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں عثمانی سلطنت بلقان کے چند علاقوں تک محدود تھی۔ بلقان کے علاقوں میں قوم پرستی کے شعور کے باعث یہاں بسنے والی تمام اقوام سیاسی اور فوجی طور پر متحرک ہو رہی تھیں۔ 1912ء میں سربیہ، بلغاریہ اور یونان (یہ ریاستیں پہلے عثمانی سلطنت کا حصہ تھیں) نے عثمانیہ سلطنت پر حملہ کر دیا اور اس سے یورپ

---

(1) بلقان ایک جزیرہ نما ہے۔ یہ جنوب مشرقی یورپ میں دریائے ڈینیوب اور دریائے ساوا کے جنوب کی طرف پھیلا ہوا ہے۔ اس علاقے کے اہم ممالک میں البانیہ، بلغاریہ، یونان، جنوب مشرقی رومانیہ، یورپی ترکیہ اور یوگوسلاویہ شامل ہیں۔ یہ زیادہ تر پہاڑی علاقہ ہے۔

کے کئی علاقے چھین لیے ۔ اس جنگ کے دوران البانیہ بھی آزاد ہوگیا۔ یہ بلقان کی پہلی جنگ تھی۔

سلطنت عثمانیہ میں کثیر آبادی عیسائی مذہب کی پیرو تھی۔ جب عثمانی سلطنت کے خلاف جنگ کے حالات پیدا ہوئے تو یورپ کی تمام قوتوں خاص طور پر برطانیہ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کر دیا۔ عثمانی فوج میں موجود عیسائی فوجیوں کی ہمدردیاں بھی یورپی افواج سے ہوگئیں۔ عثمانی فوج میں نظم کی کمی کے باعث انہیں پے در پے شکستوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بہت سے ترک افسران بھی عثمانی سلطنت سے غداری کرنے لگے۔

ترکی میں 1908ء میں نوجوان ترکوں نے عثمانیہ سلطنت کے اندازِ حکومت سے اختلاف کرتے ہوئے، مغربی طرز پر دستوری حکومت کے قیام کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ 1908ء میں نوجوان ترکوں کے ایک گروہ نے سلطان عبدالحمید کی حکومت پر طاقت کے ذریعے قبضہ کر لیا اور سلطان پر آئینی اصلاحات کرنے کا دباؤ ڈالنا شروع کر دیا ۔ بعدازاں سلطان کو اپنا عہدہ چھوڑنے پر بھی مجبور کیا گیا۔ 1908ء کے بعد انور پاشا نے ترکی کی حکومت سنبھال لی اور برطانیہ کی بجائے جرمنی کو اپنا حلیف بنا لیا۔

بلقان کی جنگوں (1912-13ء) اور اس کے بعد جنگ عظیم اوّل کے دوران عثمانی سلطنت مزید محدود ہوگئی۔ مصر پر برطانیہ نے قبضہ کر لیا۔ عرب میں قوم پرستی کی بنیاد پر ایک علٰحدہ حکومت قائم ہوگئی۔ جنگ عظیم اوّل میں جرمنی کی شکست کے بعد اس کے خلاف بہت سی پابندیاں لگا دی گئیں۔ ان پابندیوں میں فوجی اور معاشی پابندیاں شامل تھیں۔ جرمنی کو اتحادیوں کی بالادستی ماننے پر بھی مجبور کیا گیا۔

ہندوستان پر اثر

پہلی جنگ عظیم میں مسلمانوں کی سب سے بڑی سلطنت ترکی نے ، برطانیہ کے خلاف جرمنی کا ساتھ دیا۔ انگریز جنگ کے دوران ہندوستان میں کسی قسم کے خلفشار کو برداشت نہ کر سکتے تھے بلکہ وہ یہاں کے وسائل بشمول انسانی وسائل کو اپنی جنگی ضرورتوں کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ مسلمانانِ ہند ، ترکی کے ساتھ یک جذباتی

اور روحانی تعلق (1) کی بنا پر اسے کسی قسم کی تکلیف میں دیکھنا گوارا نہ کر سکتے تھے۔ ان حالات میں ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے ترکی پر زور دیا گیا کہ وہ اول تو جنگ سے دور رہے یا پھر برطانیہ کی مخالفت ترک کر دے تاکہ ہندوستانی مسلمانوں کی مشکلات میں اضافہ نہ ہو کیونکہ ان کا حاکم اس وقت برطانیہ تھا۔ مگر 1914ء میں ترکی نے برطانیہ کے خلاف جنگ میں شرکت اختیار کر لی۔

1914ء میں جنگ کے شروع ہوتے ہی، وائسرائے نے حکومت برطانیہ کی طرف سے یہ اعلان کیا کہ یہ جنگ مذہبی نہیں بلکہ سیاسی ہے۔ حکومت نے یہ بھی وعدہ کیا کہ جنگ کے دوران مسلمانوں کے متبرک مقامات کی بے حرمتی نہیں کی جائے گی۔ اس اعلان سے مسلمانوں کی وقتی طور پر تسلی ہو گئی۔ بعد میں ترکی کی پے در پے شکستوں سے مسلمانوں میں پھر تشویش بڑھنے لگی۔

---

(1) ہندوستان میں خلافت کی تحریک کے دور میں سرگرم رہنما مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد پان اسلام ازم (PAN-ISLAMISM) پر سمجھتے تھے۔ اس نظریے سے یہ مراد تھی کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی مسلمان ہوں، ان کے درمیان ایک وحدت کا رشتہ قائم ہے اور اس کی بنیاد اسلام ہے۔ اسی وحدت اسلامی کو مرکزیت دینے کے لیے خلیفہ اور خلافت کے ادارے کو خصوصیت حاصل تھی۔

خلافت کا سلسلہ خلفائے راشدینؓ سے شروع ہوا اور ان کے بعد بنو امیہ اور بنو عباس کے بعد جاری رہا۔ ابتدا میں خلیفہ سیاسی طور پر مؤثر تھا مگر بنو عباس کے خاتمے کے بعد خلیفہ کی حیثیت صرف رسمی رہ گئی اور مختلف علاقوں میں آزاد ریاستوں کے وجود سے اس کی سیاسی قوت ختم ہو گئی۔ تاہم ان آزاد ریاستوں کے حکمران رسمی سطح پر ایک تعلق کی خاطر خلیفہ سے سند اور خطبہ فرمانبرداری کرتے تھے۔ ان حکمرانوں میں سلطان محمود غزنوی، التمش اور محمد بن تغلق شامل تھے۔ عثمانی سلطنت جب خلافت کی وارث بنی تو اس کے ہم عصر مغل بادشاہوں نے اس سے کسی قسم کی راہ و رسم نہ قائم کی۔ مغلوں کے زوال کے بعد جب سلطان ٹیپو نے انگریزوں کے خلاف سرگرمیاں شروع کیں تو عثمانی خلیفہ نے اسے انگریزوں کے خلاف فرانسیسیوں سے مل کر اتحاد بنانے سے منع کیا۔ 1857ء کی جنگ آزادی میں بھی خلیفہ عبدالمجید نے ہندوستانیوں کو اس کے حلیف انگریزوں کے خلاف بغاوت نہ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

مسلم صحافت کا کردار

ہندوستان میں باقاعدہ صحافت کی ابتدا انیسویں صدی میں ہوئی۔ اُس زمانے میں اس کا حلقۂ اثر خاصا محدود تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستان میں معاشی اور سیاسی صورتحال بدلنے سے صحافت کے انداز اور دائرۂ اثر میں تبدیلی رونما ہوئی۔ ہندو قوم پرستی کو اجاگر کرنے کے لیے بنگال میں صحافت نے خاص طور پر مرکزی کردار ادا کیا۔ اس کی عملی مثال تقسیم بنگال کے موقع پر ہندو صحافت کے انداز میں نظر آتی ہے۔

مسلمانوں کی صحافت میں اہم تبدیلی کا نقطۂ آغاز بھی یہی دَور تھا۔ اس سے ہندوستان میں مسلم قوم پرستی کو ایک نیا اور فعال رُخ دیا۔ بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں مسلم صحافت نے خاص طور پر نہ صرف مسلمانوں کی رہنمائی کی بلکہ ان کے احساسات اور مفادات کی بہتر طور پر ترجمانی کی۔ اخبارات میں مولٰنا ظفر علی خان کا 'زمیندار' (لاہور)، محمد علی جوہر- (1878ء-1931ء) -کے ہفت روزہ کامریڈ (انگریزی) اور روزنامہ ہمدرد، حسرت موہانی کا اردوئے معلّیٰ اور مولانا ابو الکلام ازاد (1888ء-1958ء) کے الہلال اور البلاغ (کلکتہ) شامل ہیں۔ ان اخبارات کی خبروں اور اداریوں نے مسلمانوں میں ایک نیا سیاسی شعور پیدا کیا۔ ن اخبارات کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انگریز حکومت آئے دن ان اخبارات کو بند کر دیتی تھی اور ضمانتیں طلب کرتی تھی۔ ان اخبارات کے مدیران اکثر قید کر دیے جاتے تھے۔ اس دور میں ان اخبارات نے مسلمانوں میں مندرجہ ذیل رجحانات بطور خاص ابھارے:۔

1- مسلمانوں کو صرف ہندوستان میں درپیش مسائل تک ہی اپنے آپ کو محدود نہیں رکھنا چاہیے بلکہ انھیں اپنے آپ کو عالم اسلام کا ایک حصہ سمجھتے ہوئے، ترکی اور دوسرے بلادِ اسلامیہ کے مفادات اور تحفظ کے لیے بھی ممکنہ کوششیں کرنا چاہییں۔

2- ہندوستان میں برطانوی پالیسیوں اور خاص طور پر ان کے مسلمانوں پر اثرات کو اجاگر کرنا۔

3- عالمِ اسلام میں رونما ہونے والے واقعات کی تازہ ترین صورتحال عوام تک پہنچانا اور یہاں برطانوی حکومت کی کارستانیوں کے خلاف شدید مخاصمت آمیز جذبات کو پیدا کرنا۔

حکومتِ برطانیہ پہلے ہی ہندوستان اور عالمی سطح پر شدید مشکلات کا شکار تھی، اس

قسم کا مزاحمتی انداز صحافت انھیں قطعی طور پر قابلِ قبول نہ تھا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس صحافت سے وہ عوام میں حد درجہ نامقبول ہو رہی تھی۔

خلافت کمیٹی

جنگ عظیم اوّل کے خاتمے پر سلطنتِ عثمانیہ کے بیشتر علاقوں پر اتحادیوں (برطانیہ اور اس کے حیف ممالک) کا قبضہ ہوگیا تھا۔ سلطان عبدالحمید کی سلطنت ایک مختصر سے علاقے تک محدود ہو گئی۔ جنگ کے مابعد کے حالات سے لگتا تھا کہ برطانیہ اور اس کے اتحادی ترکی کو کئی حصوں میں تقسیم کر دیں گے اور اپنے وعدے کے خلاف مسلمانوں کے متبرک مقامات پر بھی قبضہ کر لیں گے۔ ان حالات میں مسلمان رہنماؤں میں شدید تشویش پیدا ہوئی ۔ دسمبر 1918ء کو مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ دہلی میں مولوی فضل الحق نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا کہ جنگ کے خاتمے سے مسلمانوں کے سامنے ایسے مسائل آگئے ہیں، جن پر غور کرنا اشد ضروری ہے۔ اسلامی ریاستیں ایک ایک کر کے عیسائی طاقتوں کا شکار ہو گئی ہیں... ان ریستوں نے چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے تحفظ کا جو نعرہ لگایا تھا وہ ایک ڈھکوسلا تھا.... اب یورپ کی طاقتیں ترکی کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنا چاہتی ہیں۔ ترکی کی قسمت کے فیصلے کا ہندوستان کے مسلمانوں سے گہرا تعلق ہے۔ یہ تعلق عہدہ خلافت اور مقاماتِ مقدسہ کی وجہ سے ہے۔

مئی 1919ء میں جنگ عظیم اوّل کے صلح نامے میں ترکی کے بارے میں جو تجاویز پیش کی گئی تھیں، وہ مسلمانوں کے جذبات اور انگریزوں کے مسلمانوں سے کیے گئے وعدوں سے یکسر مختلف تھیں۔ ان میں درج تھا کہ عراق ، شام اور فلسطین کا انتظام حکومت برطانیہ کے سپرد کر دیا جائے۔ اٹلی اور یونان کے قریب ترک علاقوں کو ان دونوں ممالک کے سپرد کر دیا جائے۔ قسطنطنیہ کو بین الاقوامی شہر قرار دے دیا جائے۔

یہ تمام تجاویز ، مسلمانوں کے لیے نہ صرف ناقابلِ قبول تھیں بلکہ ان سے ، ان میں ایک شدید ہیجانی کیفیت پیدا ہو گئی۔ ان درپیش مسائل سے نمٹنے کے لیے 3۔جولائی 1919ء کو بمبئی میں آل انڈیا خلافت کمیٹی قائم کی گئی۔ اس کمیٹی کے قیام میں نمایاں کردار

ادا کرنے والوں میں مولانا عبدالباری ، حکیم اجمل خان ، ڈاکٹر ایم ۔ اے انصاری اور سیٹھ چھوٹانی وغیرہ شامل تھے۔ خلافت کمیٹی کا پہلا اجلاس دہلی میں 24- نومبر 1919ء کو منعقد ہوا۔ اس کی صدارت مولوی فضل الحق نے کی۔ اس اجلاس میں بہت سے ہندو رہنما بھی تھے جن میں ایم کے گاندھی ، موتی لال نہرو (1) اور پنڈت مدن موہن مالویہ شامل تھے۔ اس اجلاس میں اتحادیوں کے مسلمانوں کے مقدس مقامات اور ترکی کے بارے میں رویے کی سخت مذمت کی گئی۔ اس سلسلے میں ہندوستان کی غیر مسلم آبادی کی تائید حاصل کرنے پر بھی غور کیا گیا۔ مسلمانانِ ہندوستان پر زور دیا گیا کہ وہ حکومت کی طرف سے جنگ میں فتح کے جشن میں شرکت کی بجائے، حکومت کے خلاف مظاہرے کریں۔ اس اجلاس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ جنگ کے صلح نامے کی تجاویز کو اگر مان بھی لیا جائے تو بھی ہندوستان میں برطانوی مال کا بائیکاٹ کیا جائے۔

ہندو مسلم تعاون

جنگ عظیم اوّل کے زمانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلافات کے باوجود ، دونوں اقوام میں شتراک کی فضا برقرار رہی۔ جنگ کے خاتمے پر جب مسلمان ، مقاماتِ مقدسہ اور خلافت کے تحفظ کے لیے سرگرم عمل تھے ، ہندوؤں نے بھی ان مخصوص حالات میں مسلمانوں کے ساتھ عملی اشتراک کو مناسب خیال کیا۔ اس معاملے پر ہندو رہنماؤں میں تین قسم کے گروہ قائم ہوئے۔

---

(1) پنڈت موتی لعل نہرو (1861ء - 1930ء) کا اصل وطن کشمیر تھا۔ ان کے دادا اتر پردیش چلے آئے اور یہاں الہٰ آباد میں نہر کے کنارے رہنے لگے۔ اسی نسبت سے ان کا خاندان نہرو کہلایا۔ اپنی عملی زندگی کی ابتدا وکالت سے شروع کی۔ اس سے ان کی معاشی حالت بہت بہتر ہوئی اور وہ ٹھاٹھ باٹھ سے رہنے لگے۔ 1917ء میں ہوم رول لیگ میں شامل ہوئے۔ ترک موالات کے موقع پر وکالت ترک کر دی اور ٹھاٹھ باٹھ ترک کر کے کھدر پہننا شروع کر دیا۔ 1923ء میں سوراج پارٹی کی بنیاد رکھی۔ 1929ء میں ان کی نہرو رپورٹ سے ہندوؤں اور مسلمان رہنماؤں میں آئینی اختلافات شروع ہوئے۔ اس رپورٹ کے جواب میں قائداعظم نے چودہ نکات پیش کیے تھے۔ پنڈت موتی لعل اپنے نظریات میں لبرل اور بے باک تھے۔ ان کو گاندھی کے نظریات سے اختلاف تھا اور آخری عمر تک وہ اس کا اظہار کرتے رہے۔

1- ایک گروہ کا خیال تھا کہ گر مسلمان گاؤ کشی ترک کر دیں تو ان سے تعاون کیا جا سکتا ہے۔

2- دوسرے گروہ کا خیال تھا کہ مسلمان رہنما اپنی قوم پرستی کو ہندوستان کی بجائے ممالک اسلامیہ سے منسلک کرتے ہیں اور اس تعلق میں بنیادی محرک ان کا مذہب اسلام ہے۔ اس کے برعکس ہندوؤں کی قوم پرستی کی بنیاد ہندوستان کی سرزمین پر ہندوستانی ہونے کے حوالے سے بنتی ہے۔ قوم پرستی کے اس بنیادی اختلاف کی صورت میں، مسلمانوں سے خلافت کے معاملے پر تعاون کرنا درست نہیں۔ مزید یہ کہ چند مسلمان رہنما، افغانستان کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ اگر یہ ممکن ہو گیا تو ہندوستان پر پھر سے مسلمانوں کی حکومت قائم ہونے سے ہندوؤں کا کیا حال ہو گا؟

3- تیسرے گروہ کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ خلافت کے مسئلے پر بغیر کسی شرط کے تعاون کرنا چاہیے۔ اس ضمن میں مسلمانوں پر کسی قسم کا شک نہیں کرنا چاہیے۔

یہ گروہ کانگرس کے رہنماؤں پر مشتمل تھا۔ اُس دَور میں ایم۔ کے گاندھی، کانگرس کے ایک طاقتور رہنما کے طور پر ابھر رہے تھے۔ ایم کے۔ گاندھی نے گاؤ کُشی کے مسئلے کو نہ اٹھانے پر زور دیا اور اس کے لیے ان کے دلائل یہ تھے۔

"میرا خیال یہ ہے کہ ہندوؤں کو اس وقت گائے کے ذبیحے کے ترک کرنے کے مسئلے کو نہیں اٹھانا چاہیے۔ دوستی کا امتحان بُرے وقت میں معاونت سے ہوتا ہے اور یہ معاونت غیر مشروط ہونی چاہیے۔ تعاون جس میں سوچنے کی بھی ضرورت ہوتی ہو، وہ تجارت تو ہو سکتی ہے، دوستی نہیں۔ مشروط تعاون اُس خراب سیمنٹ کی طرح ہوتا ہے جو جوڑنے کا کام نہیں کرتا۔ ہندوؤں کا فرض ہے کہ اگر وہ مسلمانوں کے مقصد میں انصاف دیکھیں تو ان کو ضرور اپنا تعاون پیش کریں۔ اگر مسلمان خود اعزازی طور پر ہندوؤں کے جذبات کا خیال کریں تو گاؤ کشی ترک کر دیں۔ ان کو ایسا کرنا چاہیے، تاہم یہ کوئی بات نہیں

اگر ہندو ان کے ساتھ تعاون کریں یا نہ کریں۔ غیر مشروط تعاون کا مطلب گائے کی حفاظت ہے۔"

(رام گوپال ، انڈین مسلمانز ص 36-135)

ایم ۔ کے گاندھی کے ان تاثرات کی مولنا عبدابباری (1878ء - 1926ء) نے مناسب طور پر پذیرائی کی اور انھوں نے مسلمانوں کو گائے کا ذبیحہ ترک کرنے کی صلاح دی۔ مولنا عبدالباری فرنگی محل مدرسے کے معزز عالموں میں شامل ہیں۔ یہ مولنا محمد علی اور مولنا شوکت علی کے مرشد تھے۔

ہندو مسلم اتحاد کی اس فضا میں ، دسمبر 1919ء کو مسلم لیگ اور کانگرس دونوں کے اجلاس امرتسر میں منعقد ہوئے۔ انھی دنوں مولانا محمد علی اور مولنا شوکت علی جیل سے رہا ہوے تھے۔ ان کو انگریزوں کے خلاف مزاحمتی تحریک کی پاداش میں 1916ء کو قید کر دیا گیا تھا۔ یہ دونوں رہا ہو کر سیدھے امرتسر پہنچے۔ انھی دنوں خلافت کمیٹی کا اجلاس بھی یہیں منعقد ہو رہا تھا۔ اس اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ مسلمانوں کے مطالبات اور ان کے خلافت اور مقامات مقدسہ کے بارے میں جذبات کو حکومتِ برطانیہ کے ایوانوں تک پہنچایا جائے، نیز ایک خلافت فنڈ کو قائم کیا جائے جس میں کم از کم دس لاکھ روپے جمع کیے جائیں۔

وفد کی انگلستان روانگی سے قبل ، جنوری 1920ء میں ایک وفد نے وائسرائے سے ملاقات کی۔ اس وفد میں ایم ۔ کے گاندھی ، مولانا ثناء اللہ امرتسری ، مولانا ابو الکلام آزاد ، مفتی کفایت اللہ ، مولانا حسرت موہانی ، مولنا عبدالبدری ، حکیم اجمل خان ، سیف الدین کچلو ، مختار احمد انصاری ، مولانا محمد علی ، مولانا سلیمان ندوی ، آغا اشرف قزلباش ، راجا صاحب محمود آباد ، پنڈت موتی لال نہرو اور قائداعظم شامل تھے۔ اس وفد نے وائسرائے کو یہ یادداشت پیش کی:۔

"اگر حکومتِ برطانیہ نے اپنے تمام وعدے حرف بہ حرف پورے نہ کیے تو اس کو ایسا سخت اخلاقی دھکا لگے گا کہ بڑے سے بڑے زرخیز علاقے اور عظیم ترین سیاسی منفعت سے اس کی تلافی نہ ہو سکے گی اور پھر اخلاقی وقار

کی بربادی اس وجہ سے اس کو اور بھی گراں گزرے گی کہ اس اعلان شاہی کی قلعی کُھل جائے گی جو حضور والا کے پیش رو وائسرائے نے ترکیہ سے جنگ شروع ہونے پر کیا تھا۔"

اِس پر وائسرائے کا جواب اطمینان بخش نہ تھا۔ خلافت کانفرنس نے فروری 1920ء کو اپنے بمبئی کے اجلاس میں مذکورہ یادداشت سے ملتا جلتا بیان جاری کیا اور ساتھ ہی اس مسئلے کے حل کے لیے ہندوؤں کو بھی شامل ہونے کا اشارہ دیا۔

مارچ 1920ء کو خلافت وفد برطانیہ روانہ ہوا اور یہاں انھوں نے برطانوی وزیرِاعظم سے ملاقات کی۔

خلافت وفد کی قیادت مولانا محمد علی کر رہے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کے خیالات اور جذبات کو وزیراعظم کے سامنے پیش کیا۔ وزیراعظم نے وفد کی باتوں کو کسی قسم کی اہمیت دینے کی بجائے ایک رسمی سیاسی بیان جاری کیا اور وفد کے مطالبات کو کلی طور پر نظرانداز کر دیا۔

برطانوی وزیراعظم کے اس رویّے پر ہندوستان کے عام مسلمانوں اور ان کے رہنماؤں میں سخت غصے کی فضا پیدا کر دی۔ مسلمانوں نے 19- مارچ 1920ء کو یوم غم منایا۔ اُس دِن انھوں نے روزے رکھے، دعائیں کیں اور عام ہڑتال کی۔ انھی دنوں ایم۔ کے گاندھی نے بھی اعلان کر دیا کہ اگر ترکی کو ایسی شرائط پر صلح کرنے کے لیے مجبور کیا گیا جو ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات کے مطابق نہ ہوئیں تو وہ 'عدم تعاون' کی تحریک شروع کر دیں گے۔ اس ضمن میں انھوں نے ایک منشور بھی جاری کر دیا۔

---

(1) مولانا محمد علی ۔ (1878ء - 1931ء) ریاست رامپور (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی عمر میں ہی والد کے انتقال کے بعد ان کی والدہ صاحبہ نے پرورش کی۔ ابتدائی تعلیم رامپور میں حاصل کی اور پھر علی گڑھ چلے گئے۔ انڈین سول سروس کے امتحان کے لیے برطانیہ گئے مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ واپس آکر ریاست رامپور اور بعد میں ریاست بڑودہ میں ملازمت کرتے رہے۔ بعدازاں نوکری ترک کر کے کلکتہ سے ایک انگریزی اخبار (کامریڈ) شروع کیا۔ اس اخبار میں مولانا محمد علی کی انگریزی انشا پردازی کے باعث اندرون ملک کے ساتھ ساتھ بیرونی

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

خلافت وفد ابھی انگلستان میں ہی تھا کہ مئی 1920ء کو اتحادیوں نے مسلمانانِ ہند کے مطالبات اور جذبات کے برعکس معاہدے پر دستخط کر دیے۔ یہ معاہدہ 'سیورے' کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی اہم شقیں یہ تھیں:۔

1۔ ترکی کا سلطان ، اتحادیوں کی حمایت کے ساتھ قسطنطنیہ میں حکومت کرے گا۔

2۔ اتحادیوں کو یہ حق حاصل ہو گا کہ وہ آبی گزرگاہوں پر قبضہ کر لیں اور ترکی کے ایشیائی حصّوں پر قابض ہو جائیں۔

3۔ سلطنت عثمانیہ کے یورپی علاقوں پر امریکہ کی مدد سے ریاست آرمینیا قائم کی جائے گی۔

4۔ ترکی ، عرب (بشمول مقاماتِ مقدسہ) سے متعلق اپنے تمام دعوؤں سے دستبردار ہو جائے۔

5۔ شام کا ملک فرانس کو اور عراق اور اردن برطانیہ کو سونپ دیے جائیں گے۔ نیز یہ کہ یورپ میں ترکی کے چند علاقوں کو اٹلی اور یونان کے سپرد کر دیا جائے گا۔

اس معاہدے میں مسلمانانِ ہندوستان سے کیے گئے وعدوں کا کہیں بھی احترام نظر نہیں آتا۔ پہلے ہی ہندوستانی عوام اپنی اقتصادی صورتحال کے باعث برطانیہ سے ناخوش تھے۔ ان حالات میں مسلمانوں نے شدید ردِّعمل ظاہر کیا۔ خلافت کمیٹی نے 28۔ مئی 1920ء کو حکومت کے خلاف عدم تعاون کی تحریک شروع کر دی۔

ممالک میں بھی یہ اخبار بڑا مقبول ہوا۔ آپ اردو کے بھی صاحب طرز ادیب اور شاعر تھے۔ شاعری میں آپ جوہر تخلص استعمال کرتے تھے۔ آپ نے ایک اردو اخبار 'ہمدرد' جاری کیا۔
آپ مسلمانوں کو حقیقی معنوں میں باوقار قوموں کی صف میں کھڑا کرنا چاہتے تھے اور اس سلسلے میں تمام رکاوٹوں خاص طور پر انگریزی استعمار کا خاتمہ چاہتے تھے۔ تحریک خلافت بھی آپ نے ہی شروع کی مگر اس تحریک کے دوران زیادہ عرصہ آپ کو قید رکھا گیا۔ جنوری 1931ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کی غرض سے آپ لندن گئے۔ اس وقت آپ کی طبیعت خاصی ناساز تھی۔ آپ نے گول میز کانفرنس کے ایک اجلاس میں فرمایا: "اگر تم (انگریز) میرے ملک کو آزاد نہ کرو گے تو میں واپس نہ جاؤں گا اور تمہیں میری قبر بھی یہیں بنانا ہوگی" چند روز کے بعد آپ کا انتقال ہو گیا اور آپ کو آپ کی وصیت کے مطابق بیت المقدس میں دفن کر دیا گیا۔

تحریکِ عدم تعاون

حکومت نے مولانا محمد علی کو پانچ سال کے لیے نظر بند کر دیا تھا ۔ خلافت اور اس کے تحت چلائی جانے والی تمام تحاریک کی عملی رہنمائی ایم کے گاندھی کر رہے تھے ۔ انھوں نے تحریک عدم تعاون کے عملی پروگرام اور اس کے مراحل کا اس طرح خاکہ استوار کیا :

1- حکومت کی طرف سے دیے گئے خطابات / القابات کو ترک کر دیا جائے۔
2- حکومت کے تعلیمی اداروں اور عدالتوں کا بائیکاٹ کرنا ۔
3- پولیس اور فوج کے علاوہ باقی تمام محکموں سے ابتدائی طور پر استعفے دے دیے جائیں اور بعد ازاں ان دونوں اداروں سے مکمل طور پر علحدگی اختیار کر لی جائے ۔
4- حکومت کو ہر قسم کے ٹیکس دینے سے انکار کر دینا چاہیے ۔

اِس تحریک کے بارے میں اِس بات پر خصوصی توجہ دی گئی کہ اس کے ہر قدم پر احتیاط کی جائے ۔ اس کو آہستہ آہستہ ، تدریجاً آگے بڑھایا جائے ، اور سخت سے سخت اشتعال کی صورت میں بھی حالات کو قابو سے نہ نکلنے دیا جائے ۔

عوام میں یہ تحریک حد درجہ مقبول ہوئی ۔ ہر گھر میں اِس تحریک کا کوئی نہ کوئی کارکن ضرور موجود تھا ۔ ستمبر 1920 ء میں مسلم لیگ اور کانگرس کے خصوصی اجلاسوں میں تحریک عدم تعاون کے فیصلے کو رسمی منظوری دے دی گئی ۔ مسلمان رہنماؤں میں قائداعظم اور سر فضل حسین نے عدم تعاون کی تحریک کی مخالفت کی ۔ ان کا خیال تھا کہ ایم کے گاندھی کی سرپرستی میں یہ تحریک مسلمانوں کے مفادات کے منافی رُخ اختیار کر لے گی اور اس میں تشدد بھی بڑھ سکتا ہے ۔

جمیعت العلمائے ہند (1) نے ایک فتویٰ جاری کیا جس میں ترک موالات کو جائز

1- جمیعت العلمائے ہند کی تشکیل 1919 ء میں کی گئی ۔ اس تنظیم میں علمائے دیوبند ، فرنگی محل اور علمائے ندوۃ العلماء شامل تھے ۔ جمیعت کے قیام سے اکثر مکاتبِ فکر کے علما کے باہم علمی مفاہمت کی فضا پیدا ہوئی ۔ اس کے مقاصد یہ تھے ۔ (1) مسلمانوں کی سیاسی اور غیر سیاسی معاملات میں رہنمائی کرنا (2) اسلامی مراکز اور مقامات مقدسہ ، اسلامی روایات ، رسوم اور اسلامی

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

قرار دیا گیا ۔ ہزاروں لوگوں نے اپنے خطابات واپس کر دیے ۔ حکومت کی امداد سے چلنے والے سکولوں اور کالجوں سے بچوں کو اُٹھا لیا گیا ۔ عدالتوں اور کالجوں کے بائیکاٹ میں گو اتنی کامیابی نہ ہوئی مگر لوگوں کے دلوں میں انگریزی عدالتوں کا وقار کم ہو گیا ۔ بہت سے وکیلوں نے وکالت کا پیشہ ترک کر دیا اور تحریک میں شامل ہو گئے ۔ بہت سے طلبہ نے بھی تعلیم کو ترک کر کے تحریک میں شمولیت اختیار کر لی ۔ صرف کلکتے میں تین ہزار طلبہ نے اپنے کالج چھوڑ دیے ۔

8 تا 10 جولائی 1921ء کراچی میں خلافت کانفرنس ہوئی ۔ اس کانفرنس میں تقریباً 5 ہزار نمائندوں نے شرکت کی ۔ اس کانفرنس میں مندرجہ ذیل قراردادیں پاس کی گئیں ۔

1- یہ کانفرنس سلطانِ ترکی سے اپنی وفاداری کا اعلان کرتی ہے اور انھیں یقین دلاتی ہے کہ مسلمان اس وقت تک چین سے نہ بیٹھیں گے ، جب تک خلافت کے بارے میں اپنے مطالبات منظور نہ کروا لیں ۔

2- کانفرنس اعلان کرتی ہے کہ منصبِ خلافت ، عرب علاقوں اور مقدس مقامات کا تحفظ کرنا ، ہر مسلمان کا فرض ہے اور اس کو پورا کیے بغیر مسلمان آرام سے نہ بیٹھیں گے ۔

قومیت کو ہر قسم کے ناسامعد حالات سے بچانا (3) ہندوستان کی تمام غیر مسلم اقوام سے تعلقات کو بہتر بنانا (4) ملک کی آزادی کے لیے کوشاں رہنا (5) اسلامی ممالک کے ساتھ اتحاد اور بھائی چارہ قائم رکھنے کی کوشش کرنا ۔

ہندوستان میں مسلم حکومت اور معاشرے میں انحطاط کے ساتھ ہی مختلف رہنماؤں نے اپنی سوچ کے مطابق کوششیں شروع کر دی تھیں ۔ ان میں سب سے اہم شاہ ولی اللہؒ تھے ۔ انھیں کی پیروی میں بعد میں دارالعلوم دیوبند اور دوسرے ادارے کھولے گئے ۔ ان اداروں کا نچلے اور درمیانے طبقے کے مسلمانوں میں بڑا اثر تھا اور ان کے نظریات اور انداز سوچ کو بڑی وقعت دی جاتی تھی ۔ اسی تناظر میں ان اداروں سے منسلک علما سے سیاسی اور معاشرتی مسائل پر رہنمائی بھی طلب کی جاتی تھی ۔ بیسویں صدی عیسوی کے ابتدائی عشروں میں قائم ہونے والی خالصتاً سیاسی جماعتوں کو عام لوگوں میں مقبولیت حاصل نہ تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں مذہبی جماعتوں اور علما کا کردار خاصا مؤثر نظر آتا ہے ۔ اس کی سب سے بڑی مثال تحریک خلافت ہے ۔

3- یہ کانفرنس مصطفےٰ کمال پاشا (اتاترک) اور انگورا کی حکومت کو اسلام کے قوانین کے لیے کوششیں کرنے پر مبارکباد دیتی ہے ۔
4- یہ کانفرنس اعلان کرتی ہے کہ مسلمانوں کے لیے برطانوی فوج میں نوکری کرنا ، مذہباً ناجائز اور غلط ہے ۔
5- یہ کانفرنس اعلان کرتی ہے کہ اگر برطانوی حکومت نے انگورا کی حکومت کے خلاف کسی قسم کی فوجی کارروائی کی تو مسلمانانِ ہند قانون شکنی پر مجبور ہو جائیں گے اور کانگرس سے مل کر جمہوریہ ہندوستان ، کے قیام کے لیے تحریکِ سول نافرمانی شروع کر دیں گے ۔

ان قراردادوں میں سے چند کی زبان کافی سخت تھی ۔ اس پر حکومت برطانیہ نے بہت سے رہنماؤں کو گرفتار کر لیا ۔ ان میں مولانا محمد علی ، مولانا شوکت علی اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو شامل تھے ۔ بعد میں 1921ء کے اواخر میں پرنس آف ویلز کی آمد پر بمبئی میں سخت ہنگامہ ہوا ۔ اس وقت ایم کے گاندھی کے علاوہ سب سرکردہ رہنما جیل میں تھے ۔

تحریکِ ہجرت

تحریکِ خلافت کے دوران مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالباری نے فتویٰ دے دیا کہ اب ہندوستان میں اسلامی تعلیمات کی پیروی کماحقہٗ ، ممکن نہیں رہی ۔ اس لیے یہ ملک اِس قابل نہیں کہ یہاں رہا جائے ۔ اس لیے کسی ایسے ملک میں چلے جانا چاہیے جہاں اسلام کی خدمت انجام دینا اور اسلامی قوانین کے مطابق عمل کرنا بہتر طریقہ پر ممکن ہو ۔

اِس فتویٰ کو یکم مئی 1920ء کو ایک اخبار میں شائع کیا گیا ۔ اس کی اشاعت کے ساتھ ہی ہزاروں مسلمانوں نے اپنی جائدادیں بیچ کر ہندوستان کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور افغانستان کی طرف روانہ ہو گئے ۔ ان میں زیادہ تر لوگ سندھ ، پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبوں سے تھے ۔ ان کی تعداد تقریباً 18000 تھی ۔ ان کا خیال تھا کہ حکومت

افغانستان ان کا خاطر خواہ خیال رکھے گی مگر افغانستان کی حکومت کے لیے اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کے رہائش و طعام کا بندوبست کرنا خاصا مشکل تھا ۔ انھوں نے اپنی سرحدات بند کر دیں ، جو لوگ یہاں تک پہنچے ان کو واپس جانا پڑا ۔ بے شمار لوگ راستے میں مر گئے ، جو واپس لوٹے ان کو اپنے آپ کو معاشی طور پر بہتر کرنے میں سخت مشکلات اٹھانا پڑیں ۔

موپلا بغاوت

تحریک خلافت کے دوران ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد و تعاون اپنے عروج پر تھا ۔ اس دوران مسلمانوں نے ہندوؤں کے خلافت کے معاملے پر تعاون کو بڑا سراہا اور انھوں نے ہندوؤں کے بارے میں اپنے روایتی تصورات میں بھی ترمیم کر لی ۔ اِس میں خاص طور پر گائے کے ذبیحہ کا مسئلہ سرفہرست تھا ۔

1921ء میں مالابار میں ایک بغاوت ہوئی ، جس میں بہت سے ہندو قتل کر دیے گئے ۔ اس واقعے سے ایک طرف ہندو مسلم اتحاد کو شدید ٹھیس پہنچی تو دوسری طرف تحریکِ خلافت کو شدید دھچکا لگا ۔

جنوبی ہندوستان میں بمبئی کے قریب مالابار کی پہاڑیوں میں قدیم زمانے سے عرب ملاح اور مزدور آباد تھے ۔ ان لوگوں نے مقامی باشندوں سے شادیاں کیں اور اس طرح نسلی اختلاط سے ایک نیا قبیلہ وجود میں آیا ، جسے موپلا قبیلہ کہا جاتا ہے ۔ یہ لوگ مذہبی طور پر اسلام کے پیروکار تھے ۔

1921ء کے اوائل میں ، اس علاقے میں تحریکِ خلافت کا پیغام پہنچا ۔ موپلے پہلے ہی اپنے معاشی حالات کی وجہ سے سخت پریشان تھے ۔ اِس علاقے میں ہندو جاگیرداروں اور سیٹھوں کے ہاتھوں انھیں سخت ذلت کی زندگی گزارنا پڑتی تھی ۔ جاگیرداروں اور سیٹھوں کو مقامی انتظامیہ کی اعانت حاصل تھی ۔ چونکہ تحریکِ خلافت بنیادی طور پر حکومتی نظام کے خلاف تھی ، اس لیے موپلوں نے اس تحریک کے جھنڈے تلے اپنے معاشی حالات پر احتجاج کے لیے ایک تحریک شروع کر دی ۔ اس تحریک کا بنیادی مقصد جاگیرداروں اور سیٹھوں کے خلاف بغاوت کرنا تھا ۔ بغاوت اِسقدر

شدید تھی کہ مقامی پولیس اس کا مقابلہ نہ کر سکی ۔ فوج طلب کی گئی تو موپلوں نے گوریلہ انداز جنگ اپنا لیا اور کئی ماہ تک فوج کا مقابلہ کرتے رہے ۔ اس جنگ میں کئی ہندو اور یورپی باشندے قتل کر دیے گئے ۔ کثیر تعداد میں جائدادیں تباہ ہوگئیں ۔

فوج ، موپلوں کی مزاحمت کو دبانے کے لیے ہر قسم کے حربے استعمال کر رہی تھی مگر موپلے بھی اِن حربوں کا بڑی جرأت سے جواب دے رہے تھے ۔ بالآخر حکومت کو اس علاقے میں مارشل لأ نافذ کرنا پڑا ۔ اس جنگ میں 2226 موپلے ہلاک ہوئے ، 1615 زخمی اور 5688 کو گرفتار کر لیا گیا ۔ 38256 موپلوں نے ہتھیار ڈال دیے ۔ اِس جنگ میں ایک افسوسناک واقعہ بھی پیش آیا جب 150 موپلوں کو پکڑ کر مال گاڑی کے ایک ڈبے میں بند کر کے کالی کٹ سے مدراس لے جایا جا رہا تھا ۔ اس دِن گرمی عروج پر تھی اور گاڑی کی رفتار بھی سُست تھی ۔ جب ڈبے کو کھولا گیا تو معلوم ہوا کہ 60 موپلے دم گھٹنے سے مر چکے تھے اور بقیہ کی حالت نازک تھی ۔

موپلہ بغاوت کے محرکات بنیادی طور پر اقتصادی تھے ۔ جب اس کو شمالی ہندوستان میں منظرِ عام پر لایا گیا تو اس کے محض مذہبی پہلوؤں کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ۔ اس سے شمالی ہندوستان میں موجود ہندو مسلم اتحاد کی فضا میں شدید دراڑیں پڑ گئیں اور ہندوؤں میں سخت بے چینی پھیلنے لگی ۔ انھی حالات میں انتہا پسند ہندوؤں نے شدھی اور سنگٹھن جیسی متشدد تنظیموں کی ابتدا کی ۔

موپلہ بغاوت کے بارے میں ایک مخصوص تاثر کے باوجود تحریکِ عدم تعاون کی شدت میں کسی قسم کی کمی نہ آئی ۔ گاندھی تحریک عدم تعاون کو مزید تقویت دینے کے لیے سول نافرمانی شروع کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے جو حکومت کے لیے سخت نازک صورت حال پیدا کر سکتی تھی ۔ اس صورت حال میں اعتدال پسند رہنماؤں نے حکومت اور تحریک کے سرگرم رہنماؤں کے درمیان مفاہمت کی کوششیں شروع کر دیں ۔ تحریک کے رہنماؤں کا مطالبہ تھا کہ سب سے پہلے گرفتار رہنماؤں کو رہا کیا جائے جو حکومت کے لیے ناقابلِ قبول تھا ۔ حکومت تحریک کے زور کو کم کرنے کے لیے انتہائی اقدام کر رہی تھی ، جس سے معاملہ زیادہ بگڑ رہا تھا ۔ انھی دنوں 11 فروری 1922ء کو ضلع

گورکھپور (یو پی) کے ایک قصبے چوراچوری میں بہت سے پولیس والوں کا ایک جلوس سے ٹکراؤ ہوگیا ۔ جلوس نے مزاحمت کی اور پولیس والوں کو بھاگنے پر مجبور کر دیا ۔ پولیس والوں نے بھاگ کر تھانے میں پناہ لے لی ۔ ہجوم میں اشتعال زوروں پر تھا ، انھوں نے تھانے کو آگ لگا دی ۔ اس سے تھانے میں بند سپاہی بھی جل گئے ۔

ان حالات میں ایم ۔ کے گاندھی نے تحریک کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا ۔ اس سے کانگرس میں پھوٹ پڑ گئی ۔ کانگرس میں ایک گروہ تحریکِ عدم تعاون اور بائیکاٹ کو جاری رکھنے کے حق میں تھا جبکہ دوسرا گروہ تمام قانون ساز کونسلوں کے بائیکاٹ کے حق میں تھا تاکہ حکومت پر حکومتی خود اختیاری کے سلسلے میں پرامن دباؤ ڈالا جا سکے ۔ خلافت کمیٹی میں بھی گاندھی کے فیصلے سے دو گروہ پیدا ہو گئے ۔ ان میں ایک تحریک کو جاری رکھنے کے حق میں تھا ۔ اس ماحول میں گاندھی کی قیادت کے بارے میں عدم اطمینان کی فضا پیدا ہو گئی ۔ ایک گروہ بدستور گاندھی کی قیادت اور ان کے فیصلوں کو درست مانتا رہا ۔

ترکی میں خلافت کا خاتمہ

ہندوستان کی داخلی سیاست میں تبدیلی کے باعث خلافت کا معاملہ کمزور پڑ گیا ۔ ترکی میں روایتی حکومت کا خاتمہ بھی انھی دنوں ہوگیا ۔ 1922ء کے آخر میں خلیفہ سلطان عبدالحمید کی جگہ عبدالحمید آفندی کو سلطان مقرر کر دیا گیا ۔ یہ فیصلہ ترکی کی پارلیمنٹ نے کیا ، جو مصطفیٰ کمال پاشا (اتاترک) کی قیادت میں جدید لبرل انداز سیاست کو فروغ دے رہی تھی ۔ سلطان عبدالحمید آفندی کے اختیارات اپنے پیشرو کے برعکس محض مذہبی معاملات تک محدود ہو گئے ۔ خلافت کا ادارہ اپنی کارکردگی میں تقریباً ختم ہو چکا تھا ۔ اکتوبر 1923ء کو ترکی کی پارلیمنٹ نے مصطفیٰ کمال پاشا کو جمہوریہ ترکی کا سربراہ چن لیا ۔ ان اقدامات سے خلافت کے ادارے کو شدید دھچکا پہنچا ۔ ہندوستان کے مسلمان رہنماؤں نے خلافت کے تحفظ کے لیے کئی قراردادیں پاس کیں اور اسی قسم کے کئی تار ترکی کی حکومت کو روانہ کیے ۔ ترکی کی حکومت نے ان تمام قراردادوں کو مسترد کر دیا ۔ بعد ازاں مارچ 1924ء کو ترکی کی پارلیمنٹ نے خلافت کے ادارے کو

ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا ۔ ترکی میں خلافت کے خاتمے کے بعد ، ہندوستان میں خلافت کی تحریک آہستہ آہستہ ختم ہو گئی ۔

تجزیہ

عملی سیاست میں تحاریک کو بڑی اہم حیثیت حاصل ہے ۔ جب سے ریاستی ڈھانچے میں قانون کی بالادستی کو مرکزیت حاصل ہوئی ہے ، تحاریک کی نوعیت اور کردار میں بھی فرق آگیا ہے ۔ اگرچہ حکومتی پالیسیوں اور عمومی رویوں پر احتجاج کے لیے پارلیمنٹ اور صحافتی طریقوں کو بہتر طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے ، تاہم بعض اوقات حکومتی گروہ کی غیر ہموار پالیسیوں کے خلاف عوامی احتجاج ایک تحریک کی شکل اختیار کر لیتا ہے ۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ حکومت میں مخصوص مفادات کے حامل گروہ اپنی سیاسی اجارہ داری قائم کرتے ہیں ۔ اس سیاسی اجارہ داری کے پردے میں ان کو معاشی مفادات حاصل ہوتے ہیں اور وہ یک طرفہ طور پر اپنے معاشی تجاوزات میں مصروف رہتے ہیں ۔ ایسی سیاسی صورت حال میں ان کا عوامی ضروریات اور خواہشات سے ٹکراؤ یقینی ہو جاتا ہے ۔ اس سے عوامی مفادات اور احساسات پر مبنی تحاریک جنم لیتی ہیں ۔ ایسی تحاریک کا مقصد حکومت اور اس کے اداروں کو رد کرنا ہوتا ہے ۔ چونکہ ایسی تحاریک سے حکومت کے خلاف اپنے غصے کا اظہار کرنا مقصود ہوتا ہے ، اس لیے اِن میں تشدد بھی ابھر آتا ہے اور ان کی سرگرمیاں منفی ہو جاتی ہے ۔

جدید سیاسی حربوں میں تحریک کو حکومتی آلۂ کار کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے ۔ ایسی صورت میں کسی بھی 'رہنما' کو حکومتی سرپرستی میں استعمال کیا جاتا ہے اور اصل مسائل سے عوام کی توجہ ہٹانے کے لیے ایک تحریک شروع کروا دی جاتی ہے ۔ ایسی تحریک میں ایسے قضیے کا انتخاب کیا جاتا ہے جو عوام میں مقبول ہو سکتا ہو ۔ خواہ اس کا عوام کی حقیقی زندگی یا مسائل سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اس کے لیے اخبارات اور عوامی رائے ہموار کرنے والے اداروں سے بھی مدد لی جاتی ہے ۔ ایسی تحاریک کو نہایت احتیاط سے شروع کیا جاتا ہے اور اس بات کو یقینی بنانے کی سعی کی جاتی ہے کہ تحریک اس کے 'رہنماؤں' کے کنٹرول سے باہر نہ جائے ۔ تحریک کے کنٹرول سے باہر ہونے

کی صورت میں عوام تشدد پر اتر آتے ہیں اور ان کا رُخ فرضی قضیے کی بجائے اصل حالات کی جانب ہو جاتا ہے ۔ اگر تحریک کے ہاتھ سے نکلنے کا خدشہ ہو تو عام طور پر تحریک کے خاتمے کا اعلان کر دیا جاتا ہے ۔

ہندوستان میں سیاسی عمل کی ابتدا اس دَور میں ہوئی جب عوام کی معاشی حالت دن بدن خراب ہو رہی تھی اور ان حالات میں کسی قسم کی تبدیلی کی بھی گنجائش موجود نہ تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں باقاعدہ سیاسی عمل کی ابتدا کے ساتھ ہی تحاریک کی سیاست بھی شروع ہو گئی ۔ اس کا سب سے بڑا مظاہرہ تقسیمِ بنگال کے موقع پر نظر آتا ہے ۔ یہ پہلا موقع تھا جب ہندوستان کے ایک پڑھے لکھے گروہ نے ایک تحریک چلا کر حکومت کے خلاف احتجاج کیا اور حکومت کو ان کے مطالبات ماننے پر مجبور کر دیا ۔

تحریکِ خلافت ایک طاقتور تحریک تھی ۔ یہ اپنی نوعیت اور کارکردگی کے اعتبار سے بالکل مختلف درجہ رکھتی ہے ۔ گو یہ تحریک ناکام ہو گئی اور اس سے مسلمانوں کو اقتصادی نقصان بھی پہنچا مگر اس تحریک سے مسلمانانِ ہند کو ایک نیا اعتماد ملا ۔ اس تحریک سے ان کی سیاسی تربیت ہوئی اور وہ ایک اہم اور مؤثر سیاسی جماعت کے طور پر اُبھرے ۔ ولولہ انگیز قائدین نے مسلمانوں کو سیاسی جلوسوں اور جلسوں کو منظم کرنے کے ڈھنگ سکھائے۔ اس کے بعد کے دَور میں مسلمانوں کی سیاست کا انداز مزید حقیقت پسندانہ اور بامقصد ہو گیا ۔

یاددہانی

* جنگِ عظیم اوّل کے دوران ہندوستان کو شدید اقتصادی بحران سے گزرنا پڑا ۔ اس کی اصل وجہ انگریزوں کی پالیسیاں تھیں ۔
* جنگِ عظیم اوّل کے زمانے میں معاشی دباؤ کے تحت ، عام ہندوستانیوں میں سیاسی شعور پیدا ہوا اور انھوں نے انگریزوں کے خلاف مزاحمتی تحاریک شروع کر دیں ۔ ان تحاریک میں ریشمی رومال تحریک اور دوسری شامل تھیں ۔

* کانپور مسجد کا واقعہ ، انگریزوں کی غیر انسانی انتظامی پالیسیوں کی گواہی دیتا ہے ۔
* رولٹ ایکٹ کے خلاف ہندوستانیوں نے تحریک شروع کی۔ اس زمانے میں جلیانوالہ باغ میں بہت سے لوگوں کو قتل کر دیا گیا ۔
* موپلہ بغاوت کے حقیقی محرکات معاشی تھے اور اس میں موپلہ قبیلے نے جاگیرداروں کے خلاف ایک تحریک شروع کر دی تھی ۔

واقعاتی تسلسل

جنگِ عظیم اوّل	1914ء - 1918ء
ریشمی رومال تحریک	1915–16ء
ہوم رُول تحریک کا قیام	1916ء
رولٹ ایکٹ کا نفاذ	1919ء
سانحۂ جلیانوالہ	اپریل 1919ء
خلافت کمیٹی کا پہلا اجلاس	24 نومبر 1919ء
تحریک عدم تعاون	28 مئی 1920ء
تحریک ہجرت	1920–21ء
موپلا بغاوت	1921ء
چورا چوری کا واقعہ	1922ء
ترکی میں خلافت کا خاتمہ	1924ء

غور و فکر کے لیے چند نکات

(الف)

1- جنگِ عظیم اوّل کے زمانے میں ہندوستان میں جو اقتصادی بدحالی رہی ، اس کے زیرِ اثر سیاسی خلفشار اور تحاریک کا تجزیہ کریں ؟

2- تحریک خلافت کی نوعیت اور اس کے نتائج پر تبصرہ کریں ۔

(ب) مختصر جواب دیں ۔

1- جنگ عظیم اول کے زمانے میں ہندوستانی معیشت کی صورت حال کیا تھی اور اس کا کون ذمے دار تھا ؟

2- جنگ عظیم اول کے زمانے میں مقامی لوگوں کو فوج میں بھرتی کے لیے انگریز کون سے طریقے اپناتے تھے ؟

3- ریشمی رومال تحریک کیا تھی اور کیوں ناکام ہوگئی؟

4- ہوم رول تحریک کو انگریز کیوں ایک حکومت مخالف تحریک سمجھتے تھے ؟

5- رولٹ ایکٹ کیوں نافذ کیا گیا ، اس سے انگریز حکومت کو کس قسم کے سیاسی فوائد مل سکتے تھے ؟

6- سانحۂ جلیانوالہ میں جنرل ڈائر کا کردار ، انگریزی انداز حکومت کی ایک نمائندہ مثال ہے ۔ تبصرہ کریں ۔

7- خلافت کے ارتقا پر نوٹ لکھیں اور مسلمانوں کی اس کے ساتھ وابستگی کی، وضاحت کریں ۔

8- تحریک خلافت کے مختلف ادوار پر روشنی ڈالیں ۔ اس میں ہندوؤں کا کردار کیسا رہا ؟

9- تحریکِ ہجرت کا کیا مقصد تھا ؟

10 تحریک خلافت کیونکر ختم ہوئی ۔ اس میں داخلی اور خارجی محرکات کا جائزہ لیں ؟

ج — 'ہاں' یا 'نہیں' میں جواب دیں ۔

(i) پہلی جنگ عظیم کے دوران خوردہ اجناس کی قیمتوں میں ناقابلِ برداشت حد تک اضافہ ہوگیا ۔

(ii) رولٹ ایکٹ کے نفاذ کا مقصد ، مقامی لوگوں کے انفرادی حقوق میں اضافہ کرنا تھا ۔

(iii) جلیانوالہ باغ میں مسلح افراد پر گولی چلائی گئی ۔

(iv) بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں ترکی کی سلطنت دِن بدن کمزور ہو رہی تھی ۔

(v) ہندوستانی مسلمان ، خلافت کے ادارے کے تحفظ کے لیے انگریزوں سے تعاون کر رہے تھے ۔

(vi) بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں مسلمانوں میں سیاسی شعور پیدا کرنے میں مسلمان صحافیوں نے مرکزی کردار ادا کیا ۔

(vii) تحریک خلافت میں ہندوؤں نے مسلمانوں کے برعکس انگریزوں کا ساتھ دینا پسند کیا ۔

(viii) تحریک ہجرت میں افغانستان کی حکومت نے مسلمانوں سے تعاون نہ کیا ۔

(ix) تحریکِ خلافت کو اس وقت ختم کر دیا گیا ، جب اس پر اس کے رہنماؤں کا کنٹرول ختم ہو رہا تھا ۔

(د) نیچے ایک بیان کے ساتھ اس کی چند وجوہات دی گئی ہیں۔ یہ وجوہات اپنی جگہ پر درست ہیں تاہم ان میں کوئی ایک سب سے اہم اور بنیادی نوعیت کی ہے۔ ان تمام وجوہات پر کلاس میں بحث کریں اور سب سے بہتر پر ✓ کا نشان لگائیں۔

(1) جنگ عظیم اوّل کے دوران ہندوستان میں سیاسی انتشار کی وجہ :

(i) یہاں کی اقتصادی بدحالی تھی ۔

(ii) ہندوستانیوں میں انگریزی استعمار کے خلاف شعور کی بیداری تھی ۔

(iii) انگریزی حکومت کا اپنی جنگی ضروریات کے لیے ہندوستان کے تمام وسائل کو اپنے تصرف میں لانا تھا ۔

2- تحریک خلافت کے خاتمے پر یہ بات واضح ہو گئی کہ

(i) خلافت کے مسئلے کو ہندوستانی مسئلہ بنانا غیر حقیقت پسندانہ تھا ۔

(ii) اِس تحریک کو ایم کے گاندھی نے اپنی سیاسی ساکھ اور کانگرس کی عوامی مقبولیت کے لیے استعمال کیا ۔

9
ہندوستان میں سیاسی جدوجہد
(1919ء - 1929ء)

کسی بھی علاقے کی سیاست کے رجحانات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ وہاں کے اقتصادی ڈھانچے، پیداواری انداز اور ان دونوں کے عام لوگوں پر اثرات کو سمجھا جائے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ہندوستان میں سیاسی جدوجہد میں ایک نیا رُخ متعارف ہوا۔ اس کو سمجھنے کے لیے پہلے اس دَور کے معاشی رجحانات کو پیش کیا جاتا ہے:-

معاشی حالات

پہلی جنگ عظیم کے بعد چند سالوں میں ہندوستان کی مجموعی معاشی حالت خاصی بہتر رہی۔ اس عرصے میں یہاں درمیانے درجے کی صنعتوں میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل جدول سے لگایا جا سکتا ہے۔

	1914ء	1918ء	1919ء	1921ء
1- کارخانوں کی تعداد	495	475	[illegible]	740
2- کاٹن یارن (ملین پاؤنڈ)	652	615	636	694
3- لوہا (000 ٹن)	235	247	317	368

جنگ کے دوران ہندوستان کی برآمدات متاثر ہونے کے باعث خام مال کی کھپت مقامی صنعتوں میں ہونے لگی۔ حکومت کو بھی اِن حالات میں اپنی ضروریات کو مقامی وسائل سے ہی پورا کرنا پڑا۔ اس صورت حال میں تیار شدہ اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ

ہوا جبکہ خام مال کی قیمتوں میں نسبتاً مندے کا رجحان رہا ۔ اسی زمانے میں ہندوستان میں خلافت تحریک کے دوران تحریک عدم تعاون میں برطانوی مال و اسباب کے بائیکاٹ کے باعث مقامی طور پر تیار کردہ اشیاء کی کھپت بڑھنے سے مقامی صنعتی داروں کو خاصہ فائدہ پہنچا ۔

بیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں عالمی منڈی میں خام مال کی قیمتوں میں کمی کے باعث ہندوستانی معیشت پر ناگوار اثرات مرتب ہوئے۔ 27–1926ء میں گزشتہ سالوں کے مقابلے میں ہندوستانی برآمدات میں 20 فیصد کمی ہوئی ۔ اس کے مقابلے میں اسی عرصے میں ہندوستان میں درآمدہ اشیاء پر پچھلے سالوں کے مقابلے میں زیادہ قیمتیں ادا کرنا پڑیں ۔ برآمدات کا جدول یہ ہے

1926–27ء	1929–30ء	1930–31ء	1931–32ء	1932–33ء
309 کروڑ روپے	311 کروڑ روپے	227 کروڑ روپے	161 کروڑ روپے	126 کروڑ روپے

خام مال کی پیداوار کا زیادہ تر حصہ دیہات سے آتا تھا ۔ خام مال کی برآمدات میں کمی کے باعث دیہات میں رہنے والے اور برآمدات کے شعبے سے منسلک لوگوں کو شدید معاشی بدحالی کا سامنا کرنا پڑا ۔ اس زمانے میں ہندوستان کی کل آبادی کا 74 فیصد حصہ دیہات میں رہتا تھا ۔ ان معاشی احوال کے نتیجے میں بے روزگاری میں اضافہ ہونے لگا ۔ تعلیم یافتہ جوان محض پندرہ ، بیس روپے ماہوار کے کام کے لیے دربدر پھر رہے تھے ۔ ان میں سے کئی ایک نے شہروں میں بوٹ پالش کر کے روزی کمانی شروع کر دی ۔ سرکاری ملازمین کی تنخواہوں سے جبری کٹوتی کی جانے لگی جو 1935ء تک جاری رہی ۔

اِسی زمانے میں گندم اور پٹ سن کی قیمتوں میں 50 سے 65 فیصد کمی ہو گئی ۔ اس سے کسانوں کے اخراجات بھی پورے نہ ہو پاتے تھے ۔ انھی دِنوں حکومت نے زمینوں پر ٹیکس بڑھانے کا سوچنا شروع کیا تو لوگوں میں شدید بے چینی پھیل گئی ۔ اس کے ساتھ زمینوں کے مالکان نے اپنے مزارعین سے حاصل کردہ پیداوار سے بٹائی کی بجائے روپے کی صورت میں حصہ مانگنا شروع کر دیا ۔ اس کی ادائیگی نہ ہونے کی صورت

میں کسانوں (مزارعین) کی زمینوں سے بے دخلی شروع ہوگئی ۔ بہت سے کسانوں کی زمینیں قرضوں کی عدم ادائیگی کی صورت میں ساہوکاروں کے ہاتھ چلی گئیں ۔ اس زمانے میں زرعی پیداوار سے منسلک لوگوں پر 9- ارب روپے کا قرضہ واجب الادا تھا۔

جن لوگوں کے پاس سونا یا دوسری قیمتی اشیا تھیں، انھوں نے گزر اوقات کے لیے انھیں بیچ دیا یا رہن رکھ کر روپیہ حاصل کر لیا۔ اس زمانے میں بینکوں نے ساہوکاروں سے مل کر 3- ارب روپے کا سونا مقامی لوگوں سے حاصل کر کے برطانیہ بھجوا دیا۔

اقتصادی بحران کے نتیجے میں چھوٹے درجے کی فیکٹریاں بند ہوگئیں ۔ صرف ان درمیانے یا اعلیٰ درجے کے کارخانوں کی حالت قدرے بہتر رہی جن میں انگریز سرمایہ کاروں کے حصے تھے ۔ کارخانوں میں اطمینان بخش پیداوار نہ ہونے کے باعث صنعتی مزدوروں میں عدم تحفظ اور بے چینی بڑھنے لگی ۔ 1926ء میں 11 لاکھ دِن کے برابر وقت ہڑتالوں کی نذر ہوا اور یہ نقصان 28-1927ء میں دوگنا ہوگیا۔ 29-1928ء میں 31.6 ملین دِنوں کے برابر وقت ہڑتالوں میں ضائع ہوا۔

سیاسی رجحانات

مذکورہ بالا اقتصادی حالات میں ، جب عام لوگوں میں معاشی عدم تحفظ تھا اور وہ اپنی معمولی بنیادی ضروریات بھی بہتر طور پر پورا کرنے سے قاصر تھے ، ان میں سیاسی سوچ پیدا ہونا شروع ہوگئی ۔ وہ اپنے معاشی حالات کے محرکات کو جانتے کے عمل میں اس بات سے لازماً آگاہی حاصل کرتے کہ ان کی پس ماندگی کی اصل وجہ وہ سیاسی نظام ہے جو انگریزوں نے یہاں قائم کر رکھا تھا ۔ اس دور میں مجموعی صورتحال یہ رہی ۔

1- بیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں کچھ ایسی جماعتیں متحرک نظر آتی ہیں ، جن کا خیال تھا کہ متشدد کارروائیاں کر کے انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے ۔ ان تنظیموں میں اکثر کی کارروائیاں زیرزمین اور مخفی رہیں ۔ ان میں سب سے زیادہ شہرت 'نوجوان بھارت سبھا' کو حاصل ہوئی ۔ یہ تنظیم 1925ء میں بھگت سنگھ نے قائم کی ۔ ان کی سرگرمیوں کا مرکز لاہور میں تھا ۔ اس تنظیم نے

مختلف اوقات میں مختلف جگہوں پر بم دھماکے کروائے ۔ حکومت نے اس تنظیم کی کارروائیوں کا بڑی سختی سے نوٹس لیا اور اِس کے رہنماؤں کو 1931ء میں پھانسیاں دے دی گئیں ۔ ان میں بھگت سنگھ بھی شامل تھا ۔ اِس تنظیم کے علاوہ مزدوروں اور کسانوں کی بھی بہت سے تنظیمیں وجود میں آئیں اور انھوں نے حکومتِ وقت کی پالیسیوں کے بدے میں لوگوں میں آگہی پیدا کرنے کی کوشش کی ۔

2- اِسی دَور میں مختلف مکاتبِ فکر سے منسلک جماعتیں وجود میں آئیں ۔ ان میں مسلم نیشلسٹ ، مجلسِ احرار ، خدائی خدمتگار اور شیعہ کانفرنس شامل تھیں ۔ یہ جماعتیں 1929ء میں قائم ہوئیں ۔ مسلم لیگ ان تمام جماعتوں کے مقابلے میں ایک مستحکم جماعت تھی تاہم اس کی فعالیت محدود سیاسی سرگرمیوں تک ہی مقید تھی (1) ۔

ہندوؤں میں بہت سی جماعتیں مذہبی قوم پرستی کی بنیاد پر سرگرم تھیں ۔ تاہم کانگرس خلافت کی تحریک کے بعد پورے ہندوستان میں ایک اہم جماعت کے طور پر ابھر چکی تھی ۔ کانگرس کے اندر مختلف دھڑے سرگرم تھے جن میں لبرل نظریات پر مبنی غیر مذہبی سیاست کرنے والے اور مذہبی بنیادوں پر قوم پرستی کو فروغ دینے والے گروہ نمایاں تھے ۔

حکومت ہند کا ایکٹ مجریہ 1919ء

کسی بھی آئین یا قانون (2) کی تیاری میں اس کے معاشرے کی سماجی ، اقتصادی اور سیاسی ضروریات کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے ۔ ماہرینِ سیاسیات کسی

---

(1) مسلم لیگ کے 1930ء کے سیشن میں کورم پورا کرنے کے لیے 75 ممبران بھی میسر نہ تھے ۔ 1931ء میں یہ تعداد 75 کی بجائے 50 کر دی گئی ۔ سالانہ چندہ -/6 روپے کی بجائے یک روپیہ اور داخلہ فیس -/5 روپے کا خاتمہ کر دیا گیا ۔ اس کے باوجود ممبران کی تعداد کم رہی ۔ 1933ء میں مسلم لیگ کی سالانہ آمدنی -/1316 روپے 11 آنے اور 6 پائی تھی ۔ سالانہ خراجات میں -/564 روپے کا گھاٹا تھا ۔ (شریف الدین پیرزادہ Foundation of Pakistan)(حاشیہ 2 اگلے صفحہ پر)

بھی معاشرے کے فرد کی اپنی ریاست میں حیثیت کو محض ایک ووٹ دہندہ تک محدود نہیں سمجھتے ، بلکہ فرد کی جہاں ایک اقتصادی اور معاشرتی حیثیت ہوتی ہے وہیں اس کا ایک باعمل سیاسی کردار بھی ضروری ہوتا ہے ۔ یہ سیاسی کردار وہ اپنے روزمرہ کے امور میں ظاہر کرتا ہے اور اسی سے ریاست کی سیاسی تنظیم ہوتی ہے ۔ اسی سیاسی تناظر میں کسی بھی آئین یا قانون کی تیاری میں ہر فرد کی سماجی ، اقتصادی اور سیاسی خواہشات اور مفادات کا خیال رکھا جاتا ہے ۔

انگریزی تسلّط کے دَور میں آئین/قانون سازی کی صورت حال یکسر مختلف رہی ۔ اس کی سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ انگریزوں کا اس سرزمین سے کوئی تعلق نہ تھا ۔ وہ یہاں ایک نوآبادیاتی نظام چلا رہے تھے ۔ آئینی اصلاحات کا جو عمل شروع کیا گیا تھا ، اس کا مقصد یہاں اپنے راج کو طول دینے کے سوا کچھ نہ تھا ۔ اگر کوئی اصلاحات کی بھی گئیں تو وہ خاص سیاسی دباؤ کے تحت ممکن ہوئیں ۔ مثال کے طور پر 1857ء

---

(2) ۔ ابتدا میں انسان جانوروں سے قریب تر زندگی گزارتا تھا ۔ آہستہ آہستہ اس نے اپنی قوت تخلیق کی مدد سے اپنے اردگرد کے ماحول کو سمجھا ۔ اس سے اس کے رویوں میں بھی تبدیلی آنے لگی ۔ انھی رویّوں کے باعث اس کی زندگی میں ترتیب اور نظم پیدا ہوا ۔ اب وہ محض اپنی ذاتی خواہشات اور غرض مندیوں کا غلام نہ تھا بلکہ وہ اپنے ساتھی باشندوں کا بھی خیال رکھتا تھا ۔ دوسروں کے احترام میں وہ اپنی خواہشات اور ضرورتوں سے بھی ہاتھ کھینچ لیتا تھا ۔

دوسرے لوگوں کے لیے زندگی کے اس احساس سے قانون بنانے کی ابتدا ہوئی ۔ اس دور میں لوگ کسی بھی معاملے پر باہم مشورہ کر کے ایک اصول طے کر لیتے تھے ۔ مثال کے طور پر ، اس سے پہلے جب کوئی شخص شکار کرتا تو کوئی بھی طاقتور شخص اس سے محض اپنی طاقت کے بل بوتے پر شکار چھین لیتا تھا ۔ ایسی صورت میں کمزور شخص کی حق تلفی ہو جاتی تھی ۔ کمزوروں کے خیال اور باہم جذبۂ مخاصمت کو کم کرنے کے لیے یہ اصول طے کر لیا گیا کہ شکار کا گوشت اسی کا ہو گا جو شکار کرے گا ۔ اس سے گوشت چھیننا کسی طور مناسب نہیں ، یہ علٰحدہ بات ہے کہ وہ اسے اپنی مرضی سے دے دے ۔

اسی اجتماعی جذبے کے تحت جیسے جیسے انسانی ضروریات بدلتی گئیں ، قوانین کی شکل اور ہیئت میں تبدیلی آتی گئی ۔ قبائلی زندگی میں پنچیت میں سب فیصلے ہوتے تھے اور پنچایت میں سب لوگ مل کر فیصلے کرتے تھے ۔ بادشاہت کے دور میں بادشاہ اپنی مرضی اور مفادات کے مطابق قانون بناتا تھا ۔

کی جنگ آزادی کے بعد 1861ء کا ایکٹ آیا۔ انڈین نیشنل کانگرس کے قیام 1885ء اور بنگالی پڑھے لکھے ہندوؤں کی سیاسی سرگرمیوں اور دباؤ کے تحت 1892ء کا ایکٹ نافذ کیا گیا۔ 1905ء میں تقسیم بنگال کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں میں سیاسی تفاوت کے سامنے آنے اور امن و سلامتی کی مخدوش حالت میں 1909ء کی اپنی اصلاحات نافذ کی گئیں۔ میثاق لکھنؤ اور اس کے نتیجے میں ہندو مسلم اتحاد کے دباؤ کے تحت 1919ء کی اصلاحات نافذ کی گئیں۔ اگرچہ ان اصلاحات میں سیاسی تحفظات دیئے گئے تھے مگر عوام کو ان سے کوئی فائدہ نہ مل سکا۔

1919ء کی اصلاحات کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:۔

میثاق لکھنؤ اور اس کے بعد کے سیاسی حالات سے ہندوستانیوں میں یہ رائے تقویت پکڑ رہی تھی کہ برطانیہ، اپنے ملک میں تو جمہوریت کے فروغ کا داعی بنا ہوا ہے مگر اپنی نوآبادی، ہندوستان میں جمہوری اقدار کو کیوں پروان چڑھنے نہیں دیتا؟ اسی وجہ سے ہندوستانیوں کو آئینی مراعات دینے کی طرف توجہ دی جانے لگی۔ تاہم برطانوی حکومت نے ہندوستان کو 'خوداختیاری' دینے کی بجائے ذمہ دار حکومت، پر زور دینا شروع کر دیا۔

اس ضمن میں 20- اگست 1917ء کو سیکرٹری آف سٹیٹ (وزیر ہند) ایڈون مانٹیگو SAMUEL EDWIN MONTAGUE (1879ء - 1924ء) نے برطانوی دارالعلوم میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے یہ اعلان کیا:

> "ملک معظم کی حکومت کی حکمت عملی، جس سے حکومت ہند کو پوری طرح اتفاق ہے، یہ ہے کہ نظمِ حکومت کے ہر شعبے میں ہندوستانیوں کی شرکت بڑھائی جائے اور برطانوی سلطنت کے ایک جزو لاینفک کی حیثیت سے ہندوستان میں ذمہ دار حکومت کے روز افزوں حصول کے پیش نظر حکومتِ خوداختیاری کے اداروں کو بتدریج نشوونما دی جائے۔۔۔"

"میں اس بات کا اور اضافہ کرتا ہوں کہ اس حکمتِ عملی میں کامیابی صرف متواتر مرحلوں کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہے۔ ہر اقدام کے وقت اور پیمانے کا اندازہ

برطانوی حکومت اور حکومت ہند کو ہی لگانا چاہیے جن پر تمام ہندوستانیوں کی فلاح اور ترقی کی ذمے داری عائد ہوتی ہے ، اور ان کی رہنمائی اس تعاون سے ہونی چاہیے جو ان لوگوں سے حاصل ہوا ہو ، جنھیں نئی حکومت کے یہ مواقع اس طرح عطا کیے جائیں گے اور اس امر سے ہونا چاہیے کہ ان لوگوں کے حساس ذمہ داری پر کس حد تک اعتماد کیا جا سکتا ہے۔" (اشتیاق قریشی ص 69,68 جدوجہد پاکستان)

اسی اعلان کو عملی شکل دینے کے لیے 1917-18 ء کے سرما میں مانٹیگو نے ہندوستان کا دورہ کیا اور مختلف مکاتب فکر کے لوگوں سے ملاقاتیں کیں۔ جولائی 1918 ء کو مانٹیگو نے وائسرائے ہند لارڈ چیمس فورڈ کے ساتھ مل کر ایک رپورٹ تیار کی۔ رپورٹ میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ ہندوستان میں تعلیمی کمی اور سیاسی شعور نہ ہونے کے باعث ذمہ دار حکومت کا قیام ممکن نہیں ہے ۔ اس لیے اس قسم کی حکومت کو درجہ بدرجہ قائم کیا جائے گا ۔ اس منصوبے کو عملی شکل دینے کے لیے 'دو عملی نظام' (DYARCHY) کو نافذ کرنے کا مشورہ دیا گیا ۔ اسی رپورٹ کی بنیاد پر 1919 ء میں اصلاحات کا اعلان کیا گیا ۔ ان اصلاحات کو مانٹیگو چیمس فورڈ اصلاحات کا نام دیا گیا ۔ ان اصلاحات کی اہم خصوصیات یہ ہیں :۔

1- اصلاحات کا مقصد ہندوستانیوں کو ذمہ دار حکومت چلانے کی تربیت دینا تھا اس لیے تربیت کا آغاز صوبوں سے کیا گیا اور مرکزی اداروں میں ہندوستانیوں کو ذمہ داریاں سونپی گئیں ۔

2- مرکزی قانون ساز اسمبلی کو دو ایوانوں پر مشتمل کر دیا گیا ۔ ایوان زیریں ، قانون ساز اسمبلی اور ایوانِ بالا کونسل آف سٹیٹ کہلاتا تھا ۔ قانون ساز اسمبلیوں کی تعداد 145 اور کونسل آف سٹیٹ کے اراکین کی تعداد 60 مقرر کی گئی ۔

3- دونوں ایوانوں کے اراکین کا انتخاب براہ راست ہوتا تھا ۔ جداگانہ انتخاب کے اصول کو برقرار رکھا گیا۔ رائے دہندہ بننے کے لیے ایک خاص حد تک ٹیکس دینا یا جائیداد کی ملکیت رکھنا ضروری تھا ۔

4- مرکزی قانون ساز اسمبلی کو پورے برطانوی ہند یا اس کے کسی حصے کے لیے قانون بنا سکتی تھی ۔ اس کو کسی بھی موجودہ قانون میں ترمیم کا بھی حق حاصل تھا ۔ تاہم

یہ اسمبلی برطانوی پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے کسی بھی قانون کو منسوخ یا اس میں ترمیم نہ کر سکتی تھی اور نہ ہی ایسا قانون بنا سکتی تھی جو برطانوی پارلیمنٹ کے پاس کیے ہوئے قانون سے متصادم ہو۔

5- مندرجہ ذیل امور سے متعلق مسودۂ قانون پیش کرنے سے پہلے گورنر جنرل کی پیشگی اجازت ضروری تھی۔

(i) سرکاری قرضوں اور حکومتِ ہندوستان کے مالیاتی امور

(ii) برطانوی شہریوں، جو ہندوستان میں مقیم ہوں، کے مذاہب اور مذہبی اصول

(iii) فوج کے تمام شعبوں سے متعلق امور

(iv) حکومت ہند کے خارجہ تعلقات سے متعلق امور

(v) کوئی ایسی قرارداد یا مسودہ جو مرکزی قانون یا گورنر جنرل کے آرڈی نینس کو تبدیل یا منسوخ کرنے سے متعلق ہو

گورنر جنرل کو یہ اختیار بھی حاصل تھا کہ وہ مرکزی مقننہ کو کسی بھی مسودۂ قانون یا اس کے کسی حصے پر غور کرنے سے منع کر دے۔ قانون ساز اسمبلی کا پاس کردہ قانون گورنر جنرل کی منظوری کے بغیر نافذالعمل نہ ہو سکتا تھا۔

6- بجٹ کے سلسلے میں مرکزی قانون ساز اسمبلی کے اختیارات محدود تھے۔ بجٹ کے کچھ حصوں پر ممبران بحث کر سکتے تھے اور نہ ہی ووٹ دے سکتے تھے۔

7- مسلمانوں کے جداگانہ حق انتخاب کو جاری رکھا گیا۔

8- سیکرٹری آف سٹیٹ (وزیر ہند) کی تنخواہ کا بوجھ ہندوستانی خزانے پر ڈال دیا گیا اس سے پہلے یہ تنخواہ برطانوی خزانے سے ادا کی جاتی تھی۔

9- دس سال کے بعد ایک کمشن مقرر کیا جائے گا جو ان اصلاحات کی کامیابی یا ناکامی کا جائزہ لے گا۔

10- مرکز اور صوبوں میں اختیارات کی تقسیم میں ضرورت اور حلقۂ اثر کا خیال رکھا گیا۔ جن امور کے لیے تمام ہندوستان میں یکساں قوانین کی ضرورت تھی، کو مرکز کے سپرد کر دیا گیا۔ مرکز کے ذمے جو امور تھے، ان میں دفاع، امور خارجہ، سیاسی

تعلقات ، کسٹم ، مالیاتی امور ، ڈاک ، کرنسی ، رسل و رسائل اور دیوانی و فوجداری قوانین وغیرہ اور صوبوں کے پاس مقامی خودمختاری کی حکومت ، عوامی صحت اور صفائی ، تعلیم ، واٹر ورکس ، واٹر سپلائی ، آبپاشی ، ریونیو ، جنگلات ، زراعت ، قحط ، ریلیف اور امنِ عامہ وغیرہ کے شعبے تھے ۔ اختیارات کی تقسیم کچھ اس طرح رکھی گئی تھی کہ مرکزی حکومت بعض معاملات میں بآسانی صوبائی امور میں دخل دے سکتی تھی ۔ اس کے علاوہ گورنر جنرل ہنگامی صورتحال کا بہانہ بناکر صوبائی معاملات میں مداخلت کر سکتا تھا ۔ صوبائی گورنر اسمبلی کی موجودگی میں بھی اپنی مرضی سے احکامات جاری کر سکتا تھا ۔

11- صوبائی اسمبلیوں کے اراکین میں اضافہ کر دیا گیا ۔ ان میں 70 فیصد اراکین منتخب ہو کر آتے تھے اور 30 فیصد کو نامزد کیا جاتا تھا ۔ اِن اسمبلیوں کی قانون سازی میں حتمی فیصلہ گورنر کے پاس ہی تھا ۔

12- صوبائی حکومت کے اختیارات کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ۔

(i) منتقل شدہ TRANSFERRED

(ii) مخصوص شدہ RESERVED

اِس کو دو عملی نظام (DYARCHY) کہا جاتا ہے ۔ منتقل شدہ امور کی ذمے داری وزیروں کو سونپی گئی تھی جو اسمبلی کے رکن ہوتے اور اپنے کاموں اور کارکردگی کے لیے اسمبلی کے سامنے جوابدہ ہوتے تھے ۔ ان کے پاس جو محکمے ہوتے تھے ان میں لوکل سیلف گورنمنٹ ، تعلیم ، امداد باہمی ، زراعت اور صنعت و حرفت وغیرہ شامل تھے ۔

مخصوص امور کا انتظام گورنر اپنے سیکرٹریوں کی وساطت سے چلاتا تھا ۔ مخصوص امور میں پولیس ، آبپاشی ، جنگلات ، عدالت اور مالگزاری کے محکمے شامل تھے ۔

جب اس ایکٹ کو نافذ کیا گیا تو اس زمانے میں ہندوستان کے سیاسی حالات حد درجہ دگرگوں تھے ۔ حکومت کے خلاف لوگوں میں شدید ردِعمل موجود تھا ، اس لیے ان اصلاحات کا کوئی خاص خیر مقدم نہ ہوا ۔ یہ ایکٹ 1937ء تک نافذ رہا ۔ واضح رہے کہ

1935ء کا ایکٹ اسی سال نافذ ہوا تھا۔

مجموعی طور پر یہ آئینی اصلاحات اس طرح سے استوار کی گئی تھیں کہ حکومت مکمل طور پر تمام انتظامی، عدالتی، مالیاتی اور قانون سازی سے متعلق امور پر اپنا کنٹرول برقرار رکھ سکے۔ اس طرح ایک طرف بظاہر لگتا تھا کہ حکومت ہندوستانیوں کو اختیارات دے رہی ہے مگر دوسری جانب ان کی کارکردگی کو مشروط کر دیا جاتا تھا۔ اس کی سب سے اہم مثال صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں میں گورنر اور گورنر جنرل کے اختیارات اور حق مداخلت ہے۔ صوبوں میں دو عملی نظام کے نفاذ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حکومت نے صرف وہی محکمے مقامی لوگوں کے سپرد کیے جو اس وقت کی حکومت کو اپنے سیاسی مفادات کے حوالے سے غیر اہم نظر آتے تھے۔

1919ء کی اصلاحات اپنے حقیقی مقاصد اور اس میں ہندوستانیوں کی محدود اور مشروط شمولیت کے باعث ناکام ہو گئیں۔

نہرو رپورٹ

ہندوستان میں انگریزی حکومت سے آئینی و سیاسی حقوق حاصل کرنا مسلمانوں اور ہندوؤں ہر دو اقوام کی بقا کا مسئلہ تھا۔ اس ضمن میں دونوں قوموں میں کچھ رہنما یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ فرقہ وارانہ جذبات اور مذہبی بنیادوں سے قطع نظر صرف سیاسی بنیادوں پر انگریزوں کے خلاف اپنی سیاسی جدوجہد کو مضبوط اور تیز کیا جائے۔ اسی سلسلے میں میثاق لکھنؤ ہوا مگر اس کے چند سال بعد پیدا ہونے والی صورتحال میں اس کی روح اور اس کے داعی رہنماؤں کو پس پشت ڈال دیا۔ تحریک خلافت کے خاتمے کے ساتھ ہی ہندوستان میں مذہبی بنیادوں پر فرقہ وارانہ ماحول پیدا ہونے لگا۔ انہی دنوں ایم۔ کے گاندھی نے اپنے خیالات کا اظہار، اپنے اخبار YOUNG INDIA میں اس طرح کیا۔

> "مسلمان یا تو عرب حملہ آوروں یا ان لوگوں کی اولاد ہیں جو ہم سے الگ ہو گئے۔ اگر ہم اپنے وقار کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو اس کے تین علاج ہیں۔ ایک یہ کہ انہیں اسلام سے زبردستی الگ کر کے ان کے پرانے

دھرم (مذہب) کی طرف واپس لایا جائے ۔ دوسرا ، اگر یہ ممکن نہیں تو انھیں اپنے آبائی علاقوں (عرب) کی طرف واپس چلے جانا چاہیے ، تیسرا ، اگر یہ بھی مشکل ہو تو انھیں ہندوستان میں غلام بنا کر رکھنا چاہیے ۔"

(رام گوپال — انڈین مسلمانز)

1922 ء میں بنارس میں 'ہندو مہاسبھا' نام کی ایک تنظیم قائم کی گئی ۔ اس تنظیم کے اغراض و مقاصد میں بنیادی بات ہندوؤں میں معاشرتی اور سیاسی بیداری پیدا کرنا تھا ۔

اس سے اس تنظیم کا نشانہ براہ راست مسلمانوں کو بنا دیا گیا ۔ ہندو مہا سبھا نے دو تحریکات کو فروغ دیا ۔ ان میں ایک کا مقصد ہندوستان سے مسلمانوں کو نکال کر اسے بقول ان کے پاک کرنا تھا ۔اس تحریک کا نام 'شدھی' تھا ۔ دوسری تحریک کا نام سنگٹھن تھا اور اس کا مقصد ہندوؤں میں داخلی اتحاد قائم کرنا اور مذہبی بنیادوں پر قوم پرستی کو فروغ دینا تھا ۔ ہندو مہا سبھا اور اس کی ذیلی تنظیموں کی سرگرمیوں سے ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے ۔ ان میں سینکڑوں افراد ہلاک اور زخمی ہوئے ۔

اس مسلم دشمن ماحول میں مسلمان رہنماؤں کا رویہ بدستور معتدل رہا اور انھوں نے کسی طور بھی کشیدگی میں اضافے کی کوشش نہ کی ۔ انھی دنوں مولانا محمد علی نے کہا :-

"یہ وقت نہیں ہے کہ ایک قوم دوسری کے سر الزام تھوپے ، بلکہ موزوں یہی ہے کہ ہر شخص اپنے ہم مذہبوں کو تنبیہ کرے" ۔

مئی 1924 ء میں جب یہ فضا جاری تھی ، قائداعظم نے کہا :-

"ہندوستان میں غیر ملکی حکومت کا آغاز اور اس کا جاری رہنا محض اس سبب سے ہے کہ ہندوستان کی قومیں اور بالخصوص ہندو اور مسلمان متحد نہیں ہیں اور ایک دوسرے پر باہم اعتماد نہیں کرتے --- میں قریب قریب بالکل یہ کہنے کی طرف مائل ہوں کہ جس دن ہندو اور مسلمان

متحد ہو جائیں گے ۔ ہندوستان کو نوآبادی کے درجے کی ذمہ دار حکومت
مل جائے گی ۔"

اب تک ہندوؤں اور مسلمانوں میں آئینی معاملات پر لکھنؤ معاہدہ کو ہی بنیاد سمجھا جاتا تھا ۔ ہندو مہاسبھا کے رہنماؤں نے اِس بنیاد کو ختم کرنے کی غرض سے مسلمانوں کے جداگانہ حقِ انتخاب کی دوبارہ مخالفت شروع کر دی ۔ وہ اس مطالبے کو ہندو قوم پرستی کے اصول کے خلاف سمجھتے تھے ۔

ہندو مہاسبھا کے مسلمانوں کے جداگانہ حقِ انتخاب کے مطالبے پر رویے سے مسلمان رہنماؤں نے پھر سوچ بچار شروع کیا ۔ اس سلسلے میں 1927 ء کو دہلی میں مسلمان رہنماؤں نے قائداعظم کی صدارت میں مندرجہ ذیل شرائط پیش کیں اور یہ بھی اعلان کیا کہ اگر ان شرائط کو مان لیا جائے تو مسلمان اپنے جداگانہ حق انتخاب کے مطالبے کو ترک کر دیں گے :

1- سندھ کو بمبئی سے علٰحدہ کر کے ایک علٰحدہ صوبہ بنا دیا جائے ۔
2- صوبہ سرحد اور بلوچستان میں اسی سطح اور معیار کی اصلاحات نافذ کی جائیں جو کہ دوسرے صوبوں میں کی گئی ہیں ۔
3- مذکورہ بالا شرائط کے تحت جو صوبے نئے بنیں ، ان میں مسلمان ، ہندو اقلیت کو وہی مراعات دیں گے جو ہندو اپنے اکثریتی صوبوں میں مسلمانوں کو دینے پر رضامند ہوں گے ۔ ان صوبوں میں مخلوط انتخاب کو منظور کر لیا جائے گا ۔
4- پنجاب اور بنگال میں نیابت کا تناسب آبادی کے مطابق ہو گا ۔ مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کی نیابت ایک تہائی سے کم نہ ہو گی اور انتخابات بھی مخلوط ہوں گے ۔

اِن تجاویز پر قائداعظم نے ایک اخباری بیان میں یہ وضاحت کی :-

"——— مجھے امید ہے کہ ان تجاویز پر رواداری اور فراخ دلی سے غور کیا جائے گا ۔ جہاں تک طریقِ انتخاب کا تعلق ہے ، وہ بجائے خود مقصود بالذات نہیں ۔ انتخاب جداگانہ رہے تو کیا اور مخلوط ہو تو کیا ۔ مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنے قومی حقوق اور اپنی قومی ہستی

کے تحفظ و بقا کا پورا یقین ہو جانا چاہیے ۔ اور انھیں اس امر کا اطمینان ہو جائے کہ اکثریت محض اپنی تعداد کے بل بوتے پر ان کے حقوق پامال نہیں کر سکے گی ۔"

ان تجاویز پر ابتدا میں کانگرسی رہنماؤں نے مفاہمت کا اظہار کیا مگر چھ ماہ بعد، انھوں نے اپنے فیصلے میں تبدیلی کر لی ۔ پنجاب مسلم لیگ نے بھی جداگانہ طرز انتخاب کے قضیئے پر ان تجاویز کو غیر موزوں قرار دیا ۔ پنجاب میں ان دنوں سر فضل حسین، سر محمد شفیع اور سر محمد اقبال سرگرم رہنما تھے ۔ یکم مئی 1927ء کو لاہور میں پنجاب مسلم لیگ کے زیر اہتمام ایک جلسے میں سر محمد اقبال نے ان خیالات کا اظہار کیا ۔

"پنجاب مسلم لیگ اپنے اس عقیدے کا اعلان کرتی ہے کہ ملک کی موجودہ سیاسی حالت میں جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب ہی کے ذریعے سے مرکزی مجلس وضع قانون اور صوبوں کی وضع قوانین باشندگان ہند کی حقیقی نمائندہ مجلس بن سکتی ہیں ۔ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب ہی کے ذریعے سے باشندوں کے حقوق و فوائد محفوظ رہ سکتے ہیں اور اسی صورت میں وہ فرقہ وارانہ کشمکش دور ہو سکتی ہے جو وقتاً فوقتاً پیش آتی رہتی ہے اور جو مخلوط و مشترک حلقہ ہائے انتخاب سے پیدا ہوگی ۔ اس لیے لیگ کی یہ قطعی رائے ہے کہ جب تک اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کا مؤثر انتظام نہ ہو، اس وقت تک مسلمان فرقہ وارانہ حلقہ ہائے انتخاب کو دستور ہند کے ایک اساسی جزو کی حیثیت سے قائم رکھنے پر مصر ہیں ۔"

سائمن کمیشن

1919ء کے آئین ہند میں ایک شق یہ بھی تھی کہ دس سال کے بعد ایک کمیشن مقرر کیا جائے گا، جو ہندوستان میں طرز حکومت اور یہاں ذمے دار حکومت قائم کرنے کے سلسلے میں ضروری حقائق کا مطالعہ کرے گا اور اپنی رپورٹ پیش کرے گا ۔ 1928ء کے اوائل میں حکومت برطانیہ نے سر جان سائمن (SIR JOHN, SIMON 1873ء – 1954ء) کی سرکردگی میں ایک کمیشن ہندوستان روانہ کیا ۔ اس کمیشن کے تمام

اراکین انگریز تھے ۔

ہندوستان میں اہم سیاسی جماعتوں نے اس کمیشن سے تعاون کرنے سے انکار کر دیا ۔ کمیشن میں ہندوستانیوں کی عدم شمولیت کی بنا پر مختلف جماعتوں نے سخت احتجاج کیا ۔ کانگرس نے کمیشن کا بائیکاٹ کیا ، مسلم لیگ میں دو آرا تھیں ۔ ایک بازو کے قائد محمد علی جناح تھے اور وہ بائیکاٹ کے حق میں تھے ۔ دوسرے گروپ میں سرفہرست سر محمد شفیع تھے ، جنھوں نے کمیشن سے تعاون کو پسند کیا ۔

کمیشن کے بارے میں ہندوستانی جماعتوں کے مجموعی رویے پر وزیر ہند لارڈ برکن ہیڈ (LORD BIRKEN HEAD 1872ء - 1930ء) نے 1928ء کے اوائل میں یہ تبصرہ کیا :۔

"بجائے اس کے کہ وہ حکومت کے خلاف ہمیشہ انہدامی نکتہ چینیاں کرتے رہیں وہ (ہندوستانی) اپنی طرف سے دستور کی کوئی متحدہ اسکیم پیش کریں ۔"

(رام گوپال — انڈین مسلمانز)

آل پارٹیز کانفرنس

کانگرس نے لارڈ برکن ہیڈ کے چیلنج کا جواب دینے کے لیے مارچ 1928ء کو دہلی میں تمام سیاسی جماعتوں کی کانفرنس منعقد کی ۔ اس کانفرنس میں جن مسلمان جماعتوں نے شرکت کی ، ان میں آل انڈیا مسلم لیگ ، مرکزی خلافت کمیٹی ، جمیعت العلمائے ہند اور ہندوؤں کی طرف سے ہندو مہاسبھا ، کانگرس اور کئی دوسری جماعتیں شامل تھیں ۔ ان سب کے علاوہ سکھوں اور مزدوروں کی تنظیموں نے بھی اس کانفرنس میں شرکت کی ۔

دو ماہ کے عرصے میں کانفرنس کے 25 اجلاس ہوئے مگر کسی معاملے پر اتفاق نہ ہو سکا ۔ کانگرس اور اس کی حلیف سیاسی جماعتیں مسلمانوں کے تحفظات اور بہتر سیاسی مستقبل کے لیے کسی بھی تجویز کو ماننے سے گریز کر رہی تھیں ۔ کانفرنس کا ایک اجلاس 19 مئی کو بمبئی میں ہوا ۔ اس اجلاس میں بہت کم نمائندوں نے حصہ لیا ۔ بعض رہنماؤں

سے اجلاس کے التوا اور بعض نے کانفرنس توڑنے کی تجویز دی ۔ تاہم ایم کے گاندھی کی تجویز پر ایک کمیٹی تشکیل دی گئی ۔ اس کمیٹی کے ذمے ہندوستان کے لیے دستور مرتب کرنا تھا ۔ اس کمیٹی کے سربراہ پنڈت موتی لعل نہرو تھے ۔ اس کمیٹی نے جو رپورٹ پیش کی اسے نہرو رپورٹ کہا جاتا ہے ۔ نہرو رپورٹ پر بحث و تمحیص کے لیے لکھنؤ میں 28 تا 30 اگست 1928ء کو آل پارٹیز کانفرنس کا اجلاس ہوا ۔

اس جلسے میں مولانا محمد علی ، مولانا شوکت علی اور مولانا حسرت موہانی (1) بھی موجود تھے ۔ مولانا حسرت موہانی نے نہرو رپورٹ کی ہر شق پر بحث کی اور انھیں مسلمانوں کے لیے نقصان دہ قرار دیا اور ان کی متبادل تجویز پیش کیں ۔

نہرو رپورٹ

نہرو رپورٹ میں مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے اہم نکات یہ تھے ۔

1- جداگانہ انتخابات کے اصول کو قومی جذبے کی نشوونما کے لیے نقصان دہ قرار دیتے ہوئے ، اسے مسترد کر دیا گیا ۔ ان کا خیال تھا کہ اس سے فرقہ وارانہ جذبات پیدا ہوتے ہیں ۔ مسلمان جداگانہ انتخاب کے مطالبے کو بعض شرائط پر ترک کرنے کو تیار تھے ، ان میں مرکزی اسمبلی میں 33 فیصد نمائندگی کا مطالبہ شامل تھا ۔ نہرو رپورٹ میں اس مطالبے کو بھی رد کر دیا گیا اور اس کے لیے یہ دلیل دی کہ مسلمان ہندوستان میں ایک چوتھائی سے بھی کم ہیں ، اس لیے انھیں 33 فیصد نمائندگی نہیں دی جا سکتی ۔

---

(1) مولانا حسرت موہانی (1875ء–1951ء) ان کی ولادت [illegible] ایک قصبے موہان میں ہوئی ۔ ابتدائی تعلیم حاصل [illegible] بعد علی گڑھ میں [illegible] اور 1903ء میں [illegible] [illegible] رسالہ شروع کیا [illegible] انگریزوں کے خلاف سخت مضامین لکھنا شروع [illegible] [illegible]

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

2- پنجاب اور بنگال کے بارے میں مسلمان چاہتے تھے کہ یہاں ان کی آبادی کے تناسب سے نشستیں مخصوص کر دی جائیں ۔ ان دونوں صوبوں میں مسلمانوں کی آبادی بالترتیب 56 فیصد اور 55 فیصد تھی ۔

اس مطالبے کا پس منظر مسلمانوں کے تعلیمی اور اقتصادی حالات تھے جن کے باعث رائے دہندگی کے معیار کے مطابق ان کے ووٹروں کی تعداد دوسری اقوام کے مقابلے میں کم ہو جاتی تھی ۔ مخلوط انتخاب کی صورت میں مسلمان ، اسمبلیوں میں اپنی اکثریت بحال نہ رکھ سکتے تھے ۔ انھی حقائق کی بنا پر مسلمانوں کا مطالبہ تھا کہ انھیں کچھ عرصے کے لیے مخصوص کوٹہ دیا جائے تاکہ ان کے مسائل بہتر طور پر ایوانِ حکومت تک پہنچ سکیں ۔ نہرو رپورٹ میں اس مطالبے کو بھی رد کر دیا گیا ۔ تاہم ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے نمائندگی دینے پر رضامندی کا اظہار کیا گیا ۔ اسی اصول کو مسلم اکثریت کے صوبوں میں ہندوؤں کے لیے بھی تجویز کیا گیا ۔ نمائندگی کے معاملے پر مسلمانوں سے ترجیحی سلوک کے اصول کو ترک کر دیا گیا ۔

3- انگریزوں نے سندھ کے صوبے کو بمبئی کا حصہ قرار دے دیا تھا ۔ اس سے سندھ کی مسلم اکثریت غیر مؤثر ہو گئی تھی ۔ مسلمان رہنما ، اس صوبے کی مسلم اکثریت کے حوالے سے سیاسی اہمیت کو بحال کروانا چاہتے تھے ۔ نہرو رپورٹ میں سندھ کو علٰحدہ صوبہ بنانے کی سفارش کی گئی مگر اس کے ساتھ یہ شرائط بھی عائد کر دی گئیں ۔

(i) سندھ کا صوبہ پہلے مالی لحاظ سے خودکفیل ہو ۔

(ii) اگر صوبہ مالی طور پر خودکفیل نہ ہو تو یہ معاملہ عوام کے سامنے پیش کیا جائے ۔ اگر عوام کی اکثریت علٰحدہ صوبہ بنانے میں مالی مشکلات کو برداشت کرنے کے حق میں ہوں تو ایسا کر دیا جائے ۔

کر دیا گیا ۔ آپ نے تحریک خلافت میں بھرپور حصہ لیا ۔ بعد ازاں آپ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے ۔ قیام پاکستان کے بعد بھارت میں ہی قیام پذیر رہے ۔ آپ بھارتی پارلیمنٹ کے ممبر بھی رہے ۔ آپ اپنی طرز کے یک اعلیٰ شاعر تھے ۔ آپ کا دیوان دس جلدوں پر مشتمل ہے ۔

4- ہندوستان میں مختلف صوبوں میں مختلف معاشرت اور مختلف اقوام کی تعدادی حیثیت کے پیش نظر صوبوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دینا بہتر ہو سکتا تھا ۔ اس سے سیاسی طور پر مقامی لوگوں کی حکومت میں شرکت اور نمائندگی بڑھ سکتی تھی اور یہاں انگریزوں کا عمل دخل بھی کم سے کم ہو سکتا تھا ۔ یہ طرزِ حکومت ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے سیاسی طور پر مناسب ہو سکتا تھا ۔

نہرو رپورٹ میں صوبوں کو اختیارات دینے کے برعکس مرکز کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دینے کی سفارش کی گئی ۔ اس کے علاوہ اضافی اختیارات بھی صوبوں کی بجائے مرکز کے پاس ہی رہنے کی تجویز دی گئی ۔

5- نہرو رپورٹ میں ہندوستان کو ڈومینین (DOMINION) کی حیثیت دینے کی سفارش بھی کی گئی ۔

نہرو رپورٹ پر مختلف رہنماؤں کی رائے معلوم کرنے کے لیے دسمبر 1928ء کو کلکتے میں آل پارٹیز کنونشن بلوانے کا فیصلہ کیا گیا ۔ قائداعظم نے باہم مشورے کے لیے مسلم لیگ کا اجلاس بلوایا اور اس میں مشترکہ طور پر سیاسی فیصلے کرنے کے بعد آل انڈیا پارٹیز کانفرنس میں شرکت کی ۔ اس کنونشن میں انھوں نے مسلمانوں کا نقطۂ نظر پیش کیا ۔ قائداعظم نے نہرو رپورٹ میں کچھ ترامیم پیش کیں اور ساتھ ہی یہ اعلان بھی کیا کہ اگر ان ترامیم کو قبول کر لیا جائے تو وہ نہرو رپورٹ کو تسلیم کر لیں گے ۔ ترامیم یہ تھیں :-

1- مرکزی اسمبلی کے منتخب ممبروں میں سے $\frac{1}{3}$ مسلمان ہوں ۔

2- اگر پنجاب اور بنگال میں مخلوط انتخاب رائج نہ کیے جائیں تو کم از کم دس سال کے لیے مسلمانوں کی نشستیں، ان کی آبادی کے تناسب سے مخصوص کر دی جائیں ۔ دس سال کے بعد مسلمانوں کو یہ حق حاصل ہو گا کہ وہ اِس تجویز پر نظر ثانی کر لیں ۔

3- اضافی اختیارات مرکزی حکومت کی بجائے صوبوں کو تفویض کیے جائیں ۔

اِسی اجلاس میں قائداعظم نے مصالحت اور ملک میں اتحاد و یگانگت کی ضرورت پر زور دیا ۔ اس یادگار تقریر کا کچھ حصہ یہاں دیا جاتا ہے :-

۔۔۔۔۔۔ جب ایک قوم آزادی کی جدوجہد میں مصروف ہو اور فرزندانِ وطن حصولِ آزادی کے لیے بدیشی حکومت کے خلاف برسرِپیکار ہوں تو اس وقت آپ کو لامحالہ اقلیتوں کا مسئلہ طے کرنا ہو گا ۔ آپ جس نوع کے دستورِ اساسی چاہیں ، وضع کر لیں ۔ جب تک اقلیتیں یہ محسوس نہیں کریں گی کہ ان کے حقوق محفوظ ہیں ، وہ اِس دستور کی حمایت کرنے میں ہمیشہ تامل سے کام لیں گے ۔ اس لیے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس ضمن میں اقلیتوں کی حفاظت ہی قوم پرستی کی سب سے پُرامن آزمائش ہے ۔۔۔۔

میں اس وقت ایک مسلمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ہندوستانی کی حیثیت سے تقریر کر رہا ہوں اور میری آرزو ہے کہ میں آزادی کی جدوجہد میں نو کروڑ مسلمانوں کو اپنے ساتھ لے کر آگے بڑھوں ۔ کیا آپ محض اس خیال سے مطمئن ہو جائیں گے کہ چند مسلمان آپ کا ساتھ دینے کو تیار ہیں ؟ کیا آپ صرف اس بات پر مطمئن ہو جائیں گے کہ جناح یہ کہتا ہے کہ میں آپ کے ساتھ ہوں ۔ کیا آپ جناح کی شرکت کے متمنی ہیں ، یا پوری مسلمان قوم کے اشتراک کے خواہاں ہیں ۔۔۔ خدارا یہ نہ سمجھ لیجیے کہ میں آپ کو دھمکیاں دے رہا ہوں ۔ مجھے یہی اندیشہ ہے کہ کہیں میری باتوں کو غلط معنی نہ پہنائے جائیں ۔ اگر اقلیتوں کا یہ مسئلہ آپ نے آج حل نہ کیا تو لازماً کل کو حل کرنا پڑے گا ۔ ہم ایک ہی مادرِ وطن کے فرزند ہیں ۔ ہمیں مل جل کر اس ملک میں زندگی بسر کرنا اور یہیں روزمرہ کا کام کاج کرنا ہے ۔ اس لیے اگر ہمارے درمیان باہمی اختلاف ہے بھی تو ان کی وجہ سے دشمنی اور عداوت مول نہ لیجیے ۔ اگر ہم اتفاق اور یگانگت پیدا کرنے سے معذور ہیں تو کم از کم اتنا تو کریں کہ دشمن کی مانند ایک دوسرے کا سر پھوڑ کر نہیں ، بلکہ دوستوں کی طرح مصافحہ کر کے جدا ہوں ۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد اور متفق دیکھنا میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو ہے اور میں پورے یقین سے

کہہ سکتا ہوں کہ ہندو مسلم اتحاد کے بغیر ہندوستان کی ترقی ناممکن ہے ۔
اس لیے ہندو مسلم اتحاد کی تعمیر کے راستے میں کسی خیال ، منطق ، کسی
فلسفے اور کسی بھی کشمکش کو حائل نہ ہونے دیجیے ۔"

(رفیق افضل۔ ص 293-94)

کنونشن میں قائداعظم کی اپیل اور اخلاص پر مبنی خیالات کی پذیرائی کرنے کی بجائے ، ان کی مجوزہ ترامیم کو رد کر کے نہرو رپورٹ کو منظور کر لیا گیا ۔ اسی کنونشن میں یہ قرارداد بھی منظور کی گئی کہ حکومت نے اگر 31 دسمبر تک نہرو رپورٹ کی جملہ سفارشات کو منظور نہ کیا تو کانگرس مکمل آزادی کے لیے جدوجہد شروع کر دے گی ۔

قائداعظم کے چودہ نکات

کانگرس میں انتہا پسندانہ اور مسلم مفادات کے منافی رویوں کے باعث مسلمانوں میں مختلف سیاسی گروہوں (1) نے باہم مل کر صلاح مشورے شروع کر دیے ۔ 31 دسمبر 1928 ء تا یکم جنوری 1929 ء سر آغا خاں کے زیر صدارت آل پارٹیز کانفرنس کا اجلاس ہوا ۔ اس کانفرنس میں مسلمانوں کے صوبائی اور مرکزی قانون ساز اسمبلیوں کے نمائندے ، خلافت کمیٹی ، جمیعت العلمائے ہند ، مسلم لیگ (شفیع گروپ) کے علاوہ کئی چھوٹی بڑی سیاسی جماعتوں نے شرکت کی ۔ مسلم لیگ (جناح گروپ) نے اس اجلاس میں اس دلیل کی بنیاد پر شرکت نہ کی کہ مسلم لیگ کے مقابل جماعتیں کھڑی کرنے سے مسلمانوں کے مفادات کو نقصان پہنچے گا ۔

آل مسلم پارٹیز کانفرنس کے اجلاس سے مسلمان سیاسی گروہوں میں کسی قدر یک نظری پیدا ہوئی ۔ مارچ 1929 ء کو مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں ، لیگ کے دونوں گروہوں نے شرکت کی ۔ اس اجلاس میں مسلمانوں کے سیاسی تحفظات کے لیے چند تجاویز مرتب کی گئیں ۔ ان کو قائداعظم کے 14 نکات کا نام دیا گیا ۔ ان نکات کا خلاصہ یہ ہے :۔

1۔ نیشنلسٹ ، لبرل ، دائیں بازو کی جماعتیں ۔

1- ملک میں آئندہ دستور وفاقی طرز کا ہو اور زیادہ سے زیادہ اختیارات صوبوں کے پاس رہیں ۔

2- ہندوستان کے تمام صوبوں کو کسی بھی استثنٰی کے بغیر اندرونی خودمختاری دی جائے ۔

3- ملک کے قانون ساز اور دوسرے منتخب اداروں کی تشکیل اس اصول پر ہو کہ ہر صوبے میں اقلیت کو مؤثر نمائندگی حاصل رہے اور کوئی اکثریت اقلیت میں نہ بدل دی جائے ۔

4- مرکزی قانون ساز اسمبلی میں مسلمانوں کی نمائندگی ایک تہائی سے کم نہیں ہونی چاہیے ۔

5- مختلف فرقوں کی نمائندگی جداگانہ انتخاب کے اصول پر ہو جیسا کہ اب ہوتی ہے ۔ البتہ ہر قوم یا فرقے کو اختیار حاصل ہو کہ وہ اپنی مرضی سے اس حق سے دستبردار ہو جائے ۔

6- ہندوستانی صوبوں کی حدود میں کوئی ایسی تبدیلی نہ کی جائے جس کا اثر صوبہ سرحد ، پنجاب اور بنگال کی مسلم اکثریت پر پڑے ۔

7- تمام اقوام کو مذہبی ، تنظیم و اجتماع کی آزادی ، عبادات و رسوم کی آزادی اور تعلیم و تبلیغ کی آزادی حاصل ہو ۔

8- کوئی مسودۂ قانون ، قرار داد یا اس کا کوئی حصہ مجلسِ قانون ساز میں منظور نہ ہو سکے گا ، اگر کسی قوم کے منتخب اراکین کی تین چوتھائی تعداد اسے اپنے قومی مفادات کے منافی قرار دے ۔

9- سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے ایک علٰحدہ صوبے کا درجہ دیا جائے ۔

10- ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی طرح صوبہ سرحد اور بلوچستان میں اصلاحات نافذ کی جائیں ۔

11- مسلمانوں کو دوسری قوموں کے ساتھ ساتھ حکومت کے ذمے دار عہدوں اور سرکاری ملازمتوں میں صلاحیت اور کارکردگی کا لحاظ رکھتے ہوئے ، مناسب حصہ دیا جائے ۔

12- دستور میں ایسے تحفظات دیے جائیں جن کی وجہ سے اسلامی ثقافت ، تہذیب و تمدن

کی حفاظت ، ترقی ، مسلمانوں کی تعلیم و زبان ، مذہبی پرسنل لأ اور دوسرے اسلامی
اداروں کی ترقی اور حمایت ہو سکے ۔ اس ضمن میں حکومت کی طرف سے مناسب
مالی امداو بھی دی جائے ۔

13- ہر وزارت (صوبائی یا مرکزی) میں مسلمانوں کی نمائندگی ایک تہائی سے کم نہیں ہونی
چاہیے ۔

14- مرکزی قانون ساز ادارہ ، دستور میں اس وقت تک کوئی ترمیم نہ کرے جب تک
وفاقِ ہند میں شامل تمام اکایاں اِس ترمیم کی منظوری نہ دیں ۔

تجزیہ

بیسویں صدی کے دوسرے عشرے کی ہنگامہ خیز تحاریک کے بعد ، ہندوستان
میں آئینی اصلاحات اور اس ضمن میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں آئینی تحفظات کا سلسلہ
شروع ہوا ۔ اس میں مسلمان رہنماؤں خاص طور پر قائداعظم کا رویہ مثبت رہا اور انھوں
نے ممکنہ طور پر یہ کوشش کی کہ میثاقِ لکھنؤ کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مفاہمت برقرار
رہے ۔ نہرو رپورٹ نے کلی طور پر اِس کوشش کو نظر انداز کیا اور ایسی تجاویز پیش
کیں جن میں مسلمانوں کو ایک علٰحدہ سیاسی حیثیت حاصل کرنے سے روکنا مقصود تھا ۔
نہرو رپورٹ میں ہندوؤں کی اکثریتی حیثیت کو اِس طریقے سے پیش کیا گیا تھا کہ مسلمان
ان کے محتاج بن کر رہ جائیں ۔ اِس ضمن میں صوبوں اور مرکز میں اختیارات کی تقسیم
کو بطورِ مثال پیش کیا جا سکتا ہے ۔ مرکز میں زیادہ سے زیادہ اختیارات دینے سے ،
صاف ظاہر ہے کہ اکثریتی گروہ ہندوؤں کو ہی فائدہ پہنچتا تھا ۔ دوسری طرف مسلمانوں
کو ان کے مطالبے کے مطابق ترجیحی حیثیت نہ دینے سے ان کی نمائندگی نہ ہونے کے
برابر رہ جاتی تھی ۔ ایسی صورت حال میں مرکزی اسمبلی میں ہندو ممبران کی اکثریت ہونا
لازم تھی ۔ مسلمان صرف چند صوبوں میں ہی بہتر انتخابی نتائج حاصل کر سکتے تھے ۔
اس طرح مسلمانوں کو ہندوستان کی سطح پر سیاسی نقصان بھی ہونا تھا اور وہ محض چند
صوبوں کی سیاست تک محدود ہو جاتے ۔

قائداعظم کے چودہ نکات ، دراصل ہندوؤں کے سیاسی نظریات اور مقاصد کا

دے ۔ قائداعظم اور دوسرے مسلمان رہنماؤں نے اس درجے پر یہ بخوبی سمجھ لیا تھا کہ ہندو باہمی مفاہمت ور مسلمانوں کے تحفظات سے قطع نظر اپنی اغراض کو ہی فوقیت دے رہے ہیں ۔

نہرو رپورٹ سے یہ بات بھی عیاں ہو گئی کہ اب برطانوی حکومت کے خلاف ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترکہ محاذ بھی ممکن نہ رہے گا ۔ یہ محاذ میثاقِ لکھنؤ کی روح تھا ۔ نہرو رپورٹ سے یہ فضا ختم ہو گئی اور اب ہندوستان میں سیاسی منظر نامہ نئے حوالوں سے استوار ہونے لگا ۔ اس سے مسلمانوں میں داخلی اتحاد کی صورتحال ابھرنے لگی اور ان میں ایک قومی تشخص کی فضا پیدا ہونے لگی ۔ انگریزوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں آئینی اختلافات کو اپنے مفادات میں استعمال کیا اور اس سے انھیں اپنے نوآبادیاتی نظام کو تقویت دینے میں مدد ملی ۔

یادِ دہانی

☆ پہلی جنگ عظیم کے بعد چند سالوں میں مقامی صنعتی پیداوار میں اضافہ ہوا مگر خام مال کی قیمتوں میں کمی کے باعث زرعی شعبہ متاثر ہوا اور یہاں بے روزگاری بڑھنے لگی ۔

☆ تحریک خلافت کے دوران عام لوگوں میں سیاسی شعور بڑھا اور اس کا اظہار برطانیہ کے خلاف قائم ہونے والی مختلف انتہا پسند تنظیموں کی صورت میں ہونے لگا ۔ اسی دور میں مسلم لیگ کے علاوہ بھی بہت سی تنظیمیں قائم ہوئیں جو اپنے نقطۂ نظر کے مطابق سرگرم عمل تھیں ۔

☆ 1919ء کے ایکٹ میں مقامی خواہشات اور سیاسی ضروریات سے قطع نظر ایسی آئینی تجاویز پیش کی گئیں جن سے نوآبادیاتی نظام کو طول دینے میں مدد مل سکتی تھی ۔ مقامی رہنماؤں نے اس کو رد کر دیا تھا ۔

☆ نہرو رپورٹ نے مسلمانوں اور ہندوؤں میں برطانیہ کے خلاف پیدا شدہ اتحاد کو ختم کر دیا اور مسلمانوں کو انفرادی حیثیت میں سوچنے اور عمل کرنے پر مجبور کر دیا ۔ اس

رپورٹ میں مسلمانوں کے تحفظات کو سرے سے نظرانداز کیا گیا تھا۔

☆ قائداعظم کے چودہ نکات سے مسلمانانِ ہندوستان کی علیحدہ سیاسی جدوجہد کی ابتدا ہوئی اور قائداعظم جیسے ہندو مسلم اتحاد کے حامی رہنما نے بھی مسلمانوں کے تشخص کے لیے سوچنا شروع کر دیا۔

غور و فکر کے لیے اہم نکات

(الف)

1- ہندوستان میں 1919ء سے 1929ء کے درمیانی عرصے میں جو اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں، ان کا مسلمانانِ ہند کے نقطۂ نظر سے تجزیہ کریں؟

2- نہرو رپورٹ اور قائداعظم کے چودہ نکات میں جس نظریاتی اساس کی تفریق واضح ہوتی ہے، اس کا تقابلی جائزہ پیش کریں؟

(ب) مختصر جواب دیں۔

(i) بیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں ہندوستان میں جو معاشی حالات رہے، ان کا عام لوگوں پر کیا اثر ہوا؟

(ii) میثاقِ لکھنؤ سے پیدا شدہ سیاسی صورتحال کو پس منظر میں رکھتے ہوئے 1929ء تک کے سیاسی حالات کا جائزہ لیں؟

(iii) 1919ء کے ایکٹ میں پوشیدہ برطانوی پالیسی کا تجزیہ پیش کریں۔ حکومت کس طرح اس ایکٹ کو محض اشک شوئی کے لیے استعمال کر رہی تھی؟

(iv) دو عملی (DYARCHY) سے حکومت کس قسم کے مفادات حاصل کرنا چاہتی تھی؟ اس سے کیا مقامی لوگوں کو کچھ فائدہ مل سکتا تھا؟

(v) تحریکِ خلافت کے بعد ہندو رہنماؤں کے مسلمانوں کے تئیں بدلتے ہوئے رویے پر مسلمان رہنماؤں کے تاثرات کا جائزہ لیں؟

(vi) نہرو رپورٹ کے سلسلے میں آل پارٹیز کانفرنس کے اجلاس میں قائداعظم کی تقریر

کا اس وقت کے حالات کے تناظر میں تجزیہ کریں ؟

(vii) قائداعظم کے چودہ نکات میں مسلمانوں کے جن سیاسی تحفظات کا تذکرہ ملتا ہے ، ان کی وضاحت کریں ؟

(ج) 'ہاں' یا نہیں میں جواب دیں ۔

1- بیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں پیدا ہونے والی معاشی صورتحال میں خوردہ اجناس کی قیمتوں میں شدید کمی ہو گئی ۔

2- سیاسی نقطۂ نظر سے کسی بھی آئین یا قانون کی تیاری میں ہر فرد کی سماجی ، اقتصادی اور سیاسی خواہشات اور مفادات کا خیال رکھا جاتا ہے ۔

3- 1919 ء کی آئینی اصلاحات میں ہندوستان کے باشندوں کی خواہشات کا مکمل طور پر خیال رکھا گیا تھا ۔

4- 1919 ء کے ایکٹ کے تحت رائے دہندہ بننے کے لیے خاص حد تک ٹیکس دینے یا جائداد کی ملکیت رکھنا ضروری تھا ۔

5- سندھ کو علٰحدہ صوبہ بنانے سے مسلمانوں کو اس صوبے میں مکمل طور پر اکثریت مل سکتی تھی ۔

6- سائمن کمیشن سے مسلم لیگ (جناح گروپ) نے تعاون کرنا قبول کر لیا تھا ۔

7- نہرو رپورٹ میں پوشیدہ ہندوؤں کی ذہنیت اور ان کے مسلمانوں کی جانب خیالات واضح ہو گئے تھے ۔

8- قائداعظم کے چودہ نکات میں مسلمانوں کے قومی مزاج اور سیاسی مستقبل کے لیے لائحۂ عمل کی نشاندہی ہوتی ہے ۔

9- نہرو رپورٹ اور قائداعظم کے چودہ نکات کے بعد برطانوی حکومت کو میثاقِ لکھنؤ سے پیدا ہونے والے ہندو مسلم اتحاد سے آزادی حاصل ہو گئی ۔

10

تصوّرِ پاکستان

علّامہ اقبال کا خطبۂ الٰہ آباد

ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کے قیام کے بعد ، یہاں کی دونوں بڑی اقوام ، ہندوؤں اور مسلمانوں کے سامنے سب سے اہم مسئلہ اپنی شناخت اور قومیت کی استواری کا تھا ۔ ہندوؤں نے اپنی قومیّت کی اساس ہندو مذہب اور اس پر مبنی معاشرتی روایات کو قرار دیا ۔ انیسویں صدی میں ہی ایسی قوم پرستی کی تحریکات نے جنم لینا شروع کر دیا تھا ۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد ایک حکومتی گروہ کی حیثیت سے ہوئی مگر انگریزوں کی آمد تک مقامی لوگوں کے مسلمان ہونے سے ان کی حیثیت اور معاشرتی ہیئت بدل چکی تھی ۔ ان کا اپنا ایک مزاج اور روایات کا ایک مخصوص ڈھانچہ استوار ہو چکا تھا ، جو ہندوؤں سے قطعی طور پر مختلف تھا ۔ اس انفرادیت کی بنیاد ان کا مذہب تھا جو تاریخی طور پر ایک مختلف کردار اور اثر کا حامل رہا ہے ۔

ہندوستان میں مسلم قومیّت کے ارتقا کا نتیجہ خیز زمانہ تحریکِ خلافت کے بعد کا زمانہ ہے ، اور اس میں ایک مؤثر کردار علامہ محمد اقبالؒ نے ادا کیا ۔ علامہ اقبال نے اپنی عملی سیاسی زندگی کا آغاز 1927 ء میں کیا ۔ اسی سال وہ پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے ۔ آپ نے 1930 ء میں مسلم لیگ کے الٰہ آباد کے اجلاس کی صدارت کی اور یہاں اپنے صدارتی خطبے میں ہندوستان میں مسلم قومیت کی فکری اساس اور ہندوستان میں فرقہ وارانہ سیاست کے حل کے لیے علٰحدہ یا وفاق ہندوستان میں شامل ایک مسلم ریاست کے قیام کی وجوہات بیان کیں ۔

خطبے کے ابتدائی حصے میں علامہ اقبال نے ہندوستانی مسلمانوں کی قومی حیثیت اور انفرادیت کی بنیاد اسلام کو قرار دیا ۔ انھوں نے فرمایا ۔

" ــــــ اسلام ہی ایسا جزو ترکیبی تھا جس سے مسلمانانِ ہند کی تاریخِ حیات متاثر ہوئی ۔ یہ وہ بنیادی جذبات اور وفاداریاں وجود میں لایا جنھوں نے رفتہ رفتہ منتشر افراد اور جماعتوں کو یکجا کر دیا اور بالآخر ان لوگوں نے متمیز اور واضح قوم کی صورت اختیار کر لی ۔ درحقیقت یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ دنیا میں شاید ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے ، جس میں اسلام کی وحدت خیز قوت کا بہترین اظہار ہوا ہے ۔"

اس کے بعد علامہ اقبال نے اسلام کی اخلاقی طاقت اور اس کی روح کی وضاحت کی ۔ انھوں نے اسلام اور عیسائیت کا تقابلی جائزہ پیش کیا اور اس بات پر زور دیا۔ عیسائی مذہب ایک رہبانی نظام کی حیثیت رکھتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا عمل دخل زندگی کے دوسرے شعبوں پر نہ ہونے کے برابر رہا ۔ تاریخی طور پر یہ محض آخرت کے تصورات اور چند اخلاقی ضابطوں تک محدود رہا ۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ معاشرتی ، سیاسی اور دیگر شعبہ جات کی ضروریات سے ہم آہنگ نہ ہونے کے باعث یورپ میں مختلف تحریکات نے جنم لیا جو بظاہر مذہبی لگتی تھیں مگر حقیقت میں ان کا تعلق بدلتے ہوئے معاشرتی اور سیاسی تقاضوں سے تھا ۔ اسی سے سیاسیات کے معیار بدلے گئے اور قومی نظاموں نے اپنی جگہ بنا لی ۔ عیسائی مذہب کے اس تاریخی کردار سے اہلِ مغرب نے یہ نتیجہ نکال لیا کہ مذہب ہر فرد کا ذاتی معاملہ ہے اور انسان کی دنیاوی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے ۔

علامہ اقبال نے موجودہ دور میں اسلام کو ایک زندہ قوت قرار دیا اور اس کی ہم گیریت پر زور دیتے ہوئے انھوں نے فرمایا :۔

" ـــــــ اسلام اب بھی ایک زندہ قوت ہے ، جو ذہن انسانی کو نسل اور وطن کی قیود سے آزاد کر سکتی ہے ۔ جو یہ یقین رکھتا ہے کہ مذہب کو فرد اور ریاست کی زندگیوں میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور جو یہ

یقین رکھتا ہے کہ اسلام کی تقدیر خود اس کے ہاتھ میں ہے ، اسے کسی دوسری تقدیر کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔"

علامہ اقبال ہندوستان میں قومیتوں کے مسئلے کو خاصا پیچیدہ سمجھتے تھے ۔ وہ ہندوستان کو ایک چھوٹا ایشیا قرار دیتے تھے جس میں مختلف نسلوں کے لوگ آباد تھے ۔ مگر یہ سب باہمی اشتراک و تعاون کو فروغ دینے کی بجائے انفرادیت کو فروغ دے رہے تھے ۔ اِس کی وضاحت انھوں نے اس طرح کی ۔

"——— یہ امر باعثِ تکلیف ہے کہ اب تک باہمی اشتراک و تعاون کی ہماری تمام کوششیں ناکام ہوئی ہیں ۔ ہم کیوں ناکام ہوئے ؟ غالباً ہم ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اندرونی طور پر دوسروں پر غالب آنا چاہتے ہیں ۔ غالباً یہ وجہ بھی ہے کہ باہمی اتحاد و تعاون کے لیے ہم ان اجارہ داریوں سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں ہیں جو کسی نہ کسی طرح ہمیں حاصل ہو گئی ہے ۔ ہم اپنی انانیت کو قومیت کے چوغہ میں چھپاتے ہیں ۔ ظاہراً ہم رواداری اور حب الوطنی کا ورد کرتے ہیں لیکن اندرونی طور پر ذات پات اور فرقہ آرائی کا جذبہ بدستور کام کر رہا ہے ۔

جہاں تک مسلم دماغ کے میرے مطالعہ کا تعلق ہے میں بلا جھجک اعلان کر سکتا ہوں کہ اگر فرقہ وارانہ مسئلہ کے مستقل حل کے لیے یہ اصول تسلیم کر لیا جائے کہ مسلمانوں کو اپنی روایات و تمدن کے ماتحت اس ملک میں آزادانہ نشوونما کا حق ہے تو وہ ہندوستان کی آزادی کے لیے بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے ۔"

مگر اِس کے ساتھ ہی انھوں نے ہندوستان میں بسنے والی مختلف اقوام کی جداگانہ حیثیت کو ایک تاریخی حقیقت تسلیم کرتے ہوئے فرمایا :

"ہندوستان ایسے انسانی گروہوں کا براعظم ہے جو مختلف نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں ، مختلف زبانیں بولتے ہیں اور مختلف مذاہب کے پیروکار

ہیں ۔ ان کے اعمال کا تعین واحد نسل کے جذبہ اور احساس سے نہیں ہوتا ۔ ہندو بھی واحد الجنس گروہ نہیں ہیں ۔ فرقہ وارانہ گروہوں کی حقیقت کو تسلیم کیے بغیر برطانوی جمہوریت کا نظام ہندوستان میں رائج نہیں کیا جا سکتا ۔ لہٰذا مسلمانوں کا مطالبہ کہ ہندوستان میں ایک اسلامی ہندوستان قائم کیا جائے ، بالکل جائز ہے ۔"

"میری خواہش ہے کہ پنجاب ، صوبہ سرحد ، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک ریاست بنا دیا جائے ۔ سلطنتِ برطانیہ میں رکھ کر یا اس سے باہر رکھ کر خود مختار طرزِ حکومت رائج کیا جائے ۔ شمال مغربی مسلم ریاست کا قیام مسلمانوں یا کم از کم شمال مغربی علاقوں کے مسلمانوں کا نوشتۂ تقدیر ہے ۔"

علٰحدہ مسلم ریاست کے قیام کی مزید وضاحت اور اس سے حاصل ہونے والے متوقع فوائد کے بارے میں علامہ اقبالؒ نے فرمایا :۔

"ہندوستان مسلمانوں کا سب سے بڑا ملک ہے ، اسلام کے ایک تمدّنی قوّت کی حیثیت سے زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ ایک مخصوص علاقے میں اس کی مرکزیت قائم ہو --- اس سے مسلمانوں میں احساس ذمے داری مضبوط ہو گا اور جذبۂ حُب الوطنی فروغ پائے گا ۔"

اپنے اسی خطبے میں علامہ اقبال نے مجوزہ ریاست کے قیام سے ہندوؤں میں موجود خدشات کا ازالہ کرتے ہوئے اِس بات پر زور دیا کہ اس ریاست میں مذہبی حکومت نہ ہو گی بلکہ اس کا انحصار ایک اخلاقی نصب العین پر ہے جس کے مطابق انسان کسی خاص خطۂ زمین سے وابستہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک روحانی ہستی ہے جو ایک اجتماعی ترکیب میں حصہ لیتی ہے اور اِس کے زندہ جزو کی حیثیت سے چند فرائض اور حقوق کی مالک ہے ۔ اِس ریاست کے قیام سے یہ فائدہ ہو گا کہ ہندوستان میں اندرونی توازن قوت کی وجہ سے امن و امان قائم ہو جائے گا اور اِسلام کو موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی شہنشاہیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں ، اس جمود کو توڑ

ڈالے جو اس کے تہذیب و تمدن ، تعلیم اور قانون پر صدیوں سے طاری ہے ، اس سے نہ صرف اسلام اپنی حقیقی روح کے زیادہ قریب ہو جائے گا بلکہ وہ زمانۂ حال کی روح کے بھی قریب تر ہو جائے گا ۔"

علامہ اقبال نے اپنے اس خطبے میں مجموعی طور پر جن امور پر زور دیا اور جن کو ہندوستان میں مسلم قومیت کی بنیاد کے طور پر پیش کیا ، وہ یہ ہیں :۔

1۔ اسلام کے ساتھ مسلمانوں کی وابستگی کو ان کے سیاسی مطمحِ نظر کی اساس قرار دیا ۔ اس سے مروّجہ سیاسی معیار میں تبدیلی کی گنجائش پیدا ہو گئی ۔

2۔ اسلام کو ایک عالمگیر پیغام مانتے ہوئے انھوں نے امتِ مسلمہ میں اسلامی تمدّن اور تہذیب کو وحدت کی علامت قرار دیا ۔ اِسی تہذیبی اور تمدنی اساس کو انھوں نے مسلمانانِ ہند کی قومی تشکیل میں ایک بنیادی محرک کے طور پر پیش کیا ۔ ہندوؤں کے مقابل مسلمانوں کی انفرادیت اور تشخص کی بنیاد بھی یہی محرکات تھے ۔

3۔ علامہ اقبال نے مسلمانانِ ہندوستان کی قومی تشکیل میں چونکہ مرکزی محرک اسلامی تہذیب و تمدّن کو قرار دیا تھا ، اس لیے سیاسی ، معاشی ، تاریخی اور قوم پرستی کے معاملات کو بھی اسی محرک کے تابع کر دیا گیا ۔

علامہ اقبال سے پہلے بھی کئی مشاہیر نے ہندوستان کو مذہبی بنیادوں پر تقسیم کرنے کا خیال دیا تھا اور ان کے خیال میں ہندوستان میں موجود فرقہ واریت کا واحد حل بھی یہی تھا ۔ تاہم علامہ اقبال نے علٰحدہ مسلم ریاست کے تصور کو اسلامی نظریات کی بنیاد فراہم کی اور اس کو ہندوستان کے مسلمانوں کی قومیت سے وابستہ کر دیا ۔ اِسی خیال کو بعد ازاں مسلم لیگ نے اپنا نصب العین بنایا ۔

چوہدری رحمت علی

علامہ اقبال کے خطبۂ الٰہ آباد کے تین سال بعد چودھری رحمت علی نے نہ صرف مسلمانوں کی علٰحدہ ریاست بلکہ اس کا نام بھی تجویز کر دیا ۔

آپ مشرقی پنجاب کے ضلع ہوشیار پور کے ایک گاؤں میں 1893ء میں پیدا

ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اسلامیہ کالج لاہور سے 1918 ء میں بی اے کرنے کے بعد ایچیسن کالج لاہور میں بطور استاد بھرتی ہو گئے ۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ ملازمت ترک کر دی اور 1930 ء میں انگلستان چلے گئے ۔ وہاں کیمبرج اور ڈبلن یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی ۔ قیام پاکستان کے بعد 1948ء میں پاکستان پہلی بار آئے مگر موافق حالات نہ ہونے کے باعث واپس انگلستان چلے گئے ۔ 1951 ء کو کیمبرج میں ہی آپ کا انتقال ہوا ۔

اپنی شعوری زندگی کی ابتدا سے لے کر اپنے سفر انگلستان تک آپ ہندوستان میں رہے اور آپ نے اپنی زندگی اور اردگرد ہندو مسلم تضادات کا نہ صرف بغور مطالعہ کیا بلکہ اس کا براہ راست تجربہ بھی کیا ۔ آپ نے لاہور میں اپنے زمانہ طالب علمی میں ہی ہندوستان میں ہندو مسلم تضادات کا واحد حل مسلم ریاست کے قیام کو قرار دیا تھا ۔ آپ کا خیال تھا کہ علحدہ ریاست کے قیام سے نہ صرف ہندوستانی سیاست میں جاری خلفشار کا خاتمہ ہو جائے گا بلکہ مسلمان اور اسلام کو منفی ہندی اثرات سے بھی چھٹکارا مل جائے گا ۔ علحدہ مسلم ریاست کا قیام مسلمانوں اور اسلام دونوں کے لیے بہتر ہو گا ۔

جنوری 1933 ء کو ، انگلستان میں قیام کے دوران آپ نے اپنے چند ساتھیوں سے مل کر ایک کتابچہ 'NOW or NEVER' شائع کیا ۔ اس وقت انگلستان میں گول میز کانفرنس ہو رہی تھی ۔ اس کتابچے کو ہندوستانی سیاست دانوں میں تقسیم بھی کیا گیا ۔ اس کتابچے میں مسلمانوں کی علحدہ ریاست کا نام پاکستان تجویز کیا گیا ۔ اس نام میں

پ — پنجاب سے

الف — صوبہ سرحد یا افغانیہ سے

ک — کشمیر سے

س — سندھ سے

تان — بلوچستان سے لیے گئے تھے ۔

چودھری رحمت علی کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی اپنی ایک تاریخ اور تہذیب ہے ۔ انھی کی بنیاد پر ان کی قومیت ہندوستانی ہونے کی بجائے پاکستانی ہے ۔ آپ سمجھتے تھے

کہ ہندوستان میں متحدہ قومیت کا تصور نہ صرف تاریخی طور پر غلط ہے بلکہ اس کے قبول کرنے سے انسانی سطح پر مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ آپ ہندوستان میں فرقہ واریت کی صورتحال کا واحد حل یہ سمجھتے تھے کہ ہندو، ہندوستان اور مسلم، ہندوستان کا واضح تعین کر دیا جائے۔ وہ یقین رکھتے تھے کہ مسلمان ایک ایسی قوم ہیں جو ہندوستان میں دوسرے بسنے والوں سے مختلف ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا تصادم مذہبی، فرقہ وارانہ اور معاشی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ یہ ایک ایسا تصادم ہے جس میں مسلمان اپنی بقا کے لیے اور ہندو اپنا غلبہ قائم کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔"

بعد ازاں ہندوستان کے سیاسی حالات میں مسلمان رہنماؤں نے محسوس کر لیا کہ ہندوستان کا سیاسی حل مسلم ریاست کا قیام ہے۔ اس کا پہلا اظہار 23 مارچ 1940ء کو قراردادِ لاہور میں ہوا۔

یاد دہانی کے لیے چند نکات

☆ ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کے قیام کے بعد یہاں دونوں بڑی اقوام، ہندوؤں اور مسلمانوں کے سامنے سب سے اہم مسئلہ اپنی شناخت اور قومیت کی استواری کا تھا۔

☆ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد ایک حکومتی گروہ کی حیثیت سے ہوئی۔

علامہ اقبال نے ہندوستانی مسلمانوں کی قومی حیثیت اور انفرادیت کی بنیاد اسلام کو قرار دیا۔

☆ علامہ نے اپنے خطبۂ الہ آباد میں ہندوستانی مسلمانوں کی انفرادیت اور تشخص کو برقرار رکھنے اور ہندوستان میں جاری سیاسی خلفشار کے خاتمے کے لیے شمال مغربی مسلم اکثریت کے علاقوں کو سلطنت برطانیہ میں رکھ کر یا اس سے باہر رکھ کر ایک ریاست بنانے کی تجویز پیش کی۔

☆ چودھری رحمت علی نے مسلمانوں کی علٰحدہ ریاست کا نام پاکستان تجویز کیا۔

☆ چودھری رحمت علی نے 1933ء میں ایک کتابچہ NOW or NEVER شائع کیا۔

☆ چودھری رحمت علی ہندو مسلم تضادات کو محض معاشی یا مذہبی نہ سمجھتے تھے، وہ اسے ایک بین الاقوامی مسئلہ گردانتے تھے۔

غور و فکر کے لیے چند نکات

1- علامہ اقبال نے ہندوستان میں جاری سیاسی خلفشار کا واحد حل شمال مغربی علاقوں پر مشتمل ایک ریاست کے قیام کو قرار دیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے جو دلائل پیش کیے ان کا تجزیہ کریں؟

2- پاکستان کے قیام کے بارے میں چودھری رحمت علی کے خیالات پر مبنی ایک نوٹ لکھیں؟

11
گول میز کانفرنسیں اور 1935ء کا آئین

"مائی لارڈ، تقسیم کرو اور حکومت کرو کا دستور آج دنیا میں عام ہے۔
مگر ہندوستان میں ہم تقسیم ہوتے ہیں اور آپ حکومت کرتے ہیں۔
لیکن آج میں لندن میں یہ فیصلہ کرنے آیا ہوں کہ آپ میرے ملک میں
اور کتنے دِن قیام کریں گے۔
مَیں اپنے وطن کی آزادی کا پروانہ لینے یہاں آیا ہوں۔ میں اس کے بغیر
یہاں سے نہیں جاؤں گا، یا پھر میری لاش یہاں سے اُٹھے گی۔"

یہ اعلان مولانا محمد علی نے گول میز کانفرنس کے ایک اجلاس میں کیا۔ برطانوی حکومت نے اس کو محض جذباتی تقریر قرار دیتے ہوئے اِس پر توجہ نہ دی تاہم اِس اقتباس کے پہلے حصے میں جس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے اس کا احساس ہندوستان کے عوام میں بڑی گہرائی تک موجود تھا۔ اِس احساس کو برطانوی حکومت ایک مخصوص آئینی سلسلے میں گم کرنے کے لیے کوشاں تھی۔ اب ان کو بھی یہ احساس ہو چلا تھا کہ ہندوستان میں حقیقی آئینی اصلاحات کے بغیر کام چلانا ممکن نہیں۔ اسی عمل کے نتیجے میں 1935ء کا آئین نافذ کیا گیا جس میں مقامی لوگوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے بہت کچھ تھا۔

پس منظر

نہرو رپورٹ اور قائداعظم کے 14 نکات کے بعد یہ بات واضح ہو گئی کہ ہندو اور مسلمان مشترکہ آئینی تجاویز پر متفق نہیں ہیں۔ اِس صورتحال میں برطانیہ نے اپنے طے کردہ آئینی عمل کو آگے بڑھاتے ہوئے، ہندو اور مسلمان رہنماؤں میں آئینی اتفاق

رنے کے لیے کوششیں شروع کر دیں ۔ اس وقت کے وائسرائے لارڈ ارون LORD IRWIN ء (1881 - 1959 ء) نے 31 اکتوبر 1929 ء کو آئینی اصلاحات کے ضمن میں یہ اعلان کیا ۔

"1919 ء کا آئین وضع کرنے میں حکومت برطانیہ کا جو ارادہ تھا اس سے متعلق ہندوستان اور برطانیہ میں شبہات ظاہر کیے گئے ہیں ۔ اس تناظر میں بادشاہ معظم نے مجھے یہ اختیار دیا ہے کہ میں ان کی طرف سے اعلان کروں کہ گورنمنٹ کا اس سے متعلق جو فیصلہ ہے ، اس کی رو سے 1919 ء کے اعلان میں یہ بات صاف ہے کہ اس میں جو کچھ سوچا گیا ہے ، ہندوستان کی آئینی ترقی کا طبعی نتیجہ 'مرتبہ نو آبادی' (1) کا حصول ہے ۔"

اس اعلان کے ساتھ ہی حکومت برطانیہ نے سائمن کمیشن کی رپورٹ پر ہندوستانی ریاستوں اور یہاں کے رہنماؤں سے مشورے کا پروگرام بنایا ۔ اس ضمن میں برطانوی حکومت نے لندن میں کانفرنس بلانے کا اعلان کیا ۔

سائمن کمیشن کی رپورٹ ہندوستان کی سیاسی ، معاشرتی اور معاشی زندگی سے متعلق نہایت اہم معلومات مہیا کرتی ہے ۔ 1935 ء کا آئین بناتے وقت اسی کو بنیاد بنایا گیا تھا ۔

پہلی گول میز کانفرنس ، پہلا اجلاس (12- نومبر 1930 ء)

جب ہندوستان میں دوسرے رہنما گول میز کانفرنس میں شرکت کی تیاریاں کر رہے تھے ، کانگرس نے حکومت پر دباؤ ڈالنے کے لیے سول نافرمانی کی تحریک شروع کی ۔ ایم ۔ کے گاندھی اس تحریک کے بانی تھے ۔ انھوں نے کانفرنس میں شرکت کے لیے یہ شرط رکھی تھی کہ یہ اعلان کیا جائے کہ کانفرنس ایک ایسا آئین تیار کرے گی جس کے تحت ہندوستان کو درجہ نوآبادی دے دیا جائے گا ۔ مسلمان رہنماؤں نے اس تحریک

---

(1) مرتبہ نو آبادی (DOMINION) ۔ یہ اصطلاح سب سے پہلے 1867 ء میں کینیڈا سے متعلق استعمال ہوئی جب مختلف صوبوں کے وفاق سے یہ ملک وجود میں آیا تھا ۔ بعد میں اس سے مراد ہر ایسا ملک ہو گیا جو اپنے داخلی معاملات میں آزاد ہو ۔

کی مخالفت کی ۔ تحریک کے شروع ہوتے ہی ہندو رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا ۔

حکومت نے کانگرس کو نظرانداز کر کے دوسری جماعتوں کو گول میز کانفرنس میں شرکت کے دعوت نامے جاری کر دیے ۔ مسلم لیگ نے اپنے اجلاس میں گول میز کانفرنسوں کے فیصلے کو خوش آئند قرار دیا اور ساتھ ہی یہ بھی مطالبہ کیا کہ اس میں صرف انھی مسلمانوں کو دعوت دی جائے جو صحیح معنوں میں مسلمانان ہند کے نمائندہ ہیں ۔

پہلی کانفرنس میں ہندوستان سے کل 57 افراد کو دعوت دی گئی ، جن میں سولہ ، ریاستوں کے نمائندے اور اٹھارہ مسلمان شامل تھے ۔ ان تمام نمائندوں کا انتخاب وائسرائے نے کیا ۔ 12- نومبر 1930 ء کو کانفرنس کا افتتاح برطانیہ کے بادشاہ جارج پنجم نے کیا ۔ کانفرنس کے لیے کوئی طے شدہ ایجنڈہ نہ تھا ۔ ابتدائی سیشن میں برطانوی وزیراعظم نے مندرجہ ذیل امور کا تذکرہ کیا :۔

1- ہندوستان میں طرز حکومت کیا ہو ؟

2- مرکز میں ذمہ داریوں کی تفویض کی نوعیت اور حیثیت کیا ہو ؟

3- صوبائی خودمختاری اور اس میں ضروری تحفظات کیا ہوں ؟

مسلمانوں کے نمائندوں میں سر آغا خان ، قائداعظم محمد علی جناح ، مولانا محمد علی ، سر شاہ نواز ، نواب احمد سعید خاں چھتاری ، راجا شیر محمد آف ڈومیلی ، مسٹر اے ۔ کے فضل الحق ، سر اے ۔ کے غزنوی ، سر غلام حسین ہدایت اللہ ، حافظ ہدایت حسین ، صاحبزادہ سر عبدالقیوم ، سر سید سلطان احمد ، سر محمد شفیع ، ڈاکٹر شفاعت احمد خان ، چودھری ظفر اللہ اور بیگم شاہ نواز شامل تھیں ۔

پہلی کانفرنس میں قائد اعظم نے بڑی سرگرمی سے حصہ لیا ۔ مجموعی طور پر کانفرنس میں بحث و مباحثے کے بعد مختلف امور پر اتفاق رائے کی یہ صورتحال رہی ۔

1- وفاقی طرز حکومت پر تمام مندوبین میں اتفاق تھا ۔ اس میں ریاستی راجاؤں نے بھی شمولیت پر رضامندی ظاہر کر دی ۔ تاہم وفاقی طرز حکومت کے معاملے کو حتمی شکل دینے کے لیے جو سب کمیٹی قائم کی گئی تھی ، اس میں اختلافات پیدا ہو گئے ۔ اختلافات اس بات پر تھے کہ صوبوں اور مرکز میں اختیارات کی تقسیم کیا ہو ۔ مرکز کو

مضبوط رکھا جائے یا کمزور ؟ اس کے ساتھ ساتھ ہندوستانی ریاستوں کو وفاق میں شامل کرنے کے طریقے پر بھی اختلافات پیدا ہو گئے ۔ اس معاملے میں یہ وضاحت ضروری تھی کہ ریاستوں کے حکمران کس حد تک اپنے اختیارات چھوڑنا پسند کریں گے ؟ اس قضیے پر کوئی حتمی فارمولا طے نہ ہو سکا ۔

2- اقلیتوں کی مجوزہ وفاق میں حیثیت اور ان کے حقوق کے بارے میں کوئی اصول طے نہ ہو سکا ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان جداگانہ انتخاب کے اصول کو برقرار رکھنے اور پنجاب اور بنگال میں نشستوں کو مخصوص کرنے پر زور دے رہے تھے ۔ ہندو اس کے مخالف تھے ۔ ڈاکٹر امبیدکر ، جو شودروں کے لیڈر تھے ، شودروں اور دوسری پس ماندہ اقلیتوں کے لیے علحدہ نشستوں کا مطالبہ کر رہے تھے ۔ ہندو مندوب اس کے بھی مخالف تھے ۔

دوسری گول میز کانفرنس

پہلی گول میز کانفرنس میں کانگرس غیر حاضر رہی ۔ تاہم دوسری کانفرنس میں کانگرس کی شمولیت کو یقینی بنانے کے لیے کوششیں کی گئیں ۔ برطانوی حلقوں کا خیال تھا کہ کانگرس کی شمولیت کے بغیر کسی فیصلے پر پہنچنا بے سود ہو گا ۔ برطانوی حکومت کی ہدایت پر لارڈ اِرون نے ایم ۔ کے گاندھی کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا ۔ لارڈ اِرون اور گاندھی کے درمیان صلح کے سلسلے میں ملاقاتوں کا ایک سلسلہ ہوا جس کے نتیجے میں 5 مارچ 1931ء کو ایک معاہدے پر دستخط ہوئے ۔ اس کو ' رون گاندھی معاہدہ' کہا جاتا ہے ۔ اس معاہدے میں حکومت نے کافی نرم رویہ اختیار کیا اور کانگرس کو بہت سی مراعات بھی دیں ۔ تاہم ایم کے گاندھی کو گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے راضی کر لیا گیا ۔

دوسری گول میز کانفرنس کا افتتاح 7 ستمبر 1931ء کو ہوا ۔ ایم ۔ کے گاندھی ، کانگرس کے واحد نمائندہ کی حیثیت سے اِس کانفرنس میں شریک ہوئے ۔ اس کانفرنس میں بھی وفاقی نظام کی ترتیب ، اور اقلیتوں کی نمائندگی و حیثیت جیسے معاملات پر بحث و تمحیص شروع ہوئی ۔ مسلمانوں کی نمائندگی کرنے والوں میں تمام رہنما سابقہ کانفرنس

والے ہی تھے تاہم اس اجلاس میں ڈاکٹر سر محمد اقبال بھی شریک ہوئے ۔

اس کانفرنس میں ایم ۔ کے گاندھی کا مطالبہ تھا کہ کانگرس کو ہندوستانی عوام کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کیا جائے ۔ وہ کسی اور سیاسی جماعت کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے ۔ ان کا دعویٰ تھا کہ کانگرس ہندوستان میں تمام بسنے والوں کی ترجمان ہے ، خواہ ان کی ذات ، مذہب اور نسل کچھ بھی ہو ۔ وہ اپنے آپ کو والیانِ ریاست کا بھی نمائندہ گردانتے تھے ۔ انھوں نے کانفرنس میں شریک دوسرے مندوبین کو سرکاری نمائندے قرار دیا کیونکہ ان کے خیال میں وہ سب عوام کی بجائے محض حکومت کی نمائندگی کر رہے تھے ۔

ہندو مسلم تعلقات کے بارے میں ایم ۔ کے گاندھی کا موقف یہ تھا کہ انگریزوں کی آمد سے پہلے یہ دونوں اقوام باہم خوشگوار ماحول میں رہ رہی تھیں ۔ انگریزوں نے یہاں آکر نفرت اور مخاصمت کو ہوا دی اور دونوں اقوام کو ایک دوسرے سے دُور کر دیا ۔ ان کا خیال تھا کہ یہ نفرت عارضی ہے ۔ جب انگریز ہندوستان کو آزاد کر کے یہاں سے چلے جائیں گے تو یہ اقوام خود بخود مل جل کر رہنے لگیں گی ۔ لہٰذا اِن حالات میں مسلمانوں کو خاص مراعات دینے کی ضرورت نہیں ۔

مسلمان رہنما ، ایم ۔ کے گاندھی کے ان خیالات سے قطعی طور پر متفق نہ تھے ۔ وہ جناح کے چودہ نکات کو بنیاد بنا کر اپنا موقف پیش کر رہے تھے ۔ جب کوئی سمجھوتہ ہوتا نظر نہ آیا تو ایم ۔ کے گاندھی نے ایک آخری کوشش کے طور پر ایک منصوبہ پیش کیا ۔ یہ ہوبہو نہرو رپورٹ کا ایک چربہ تھا ، جس کو پہلے ہی سیاسی جماعتیں رد کر چکی تھیں ۔

ایم ۔ کے گاندھی کے منصوبے کے جواب میں مسلمانوں ، اچھوتوں ، ہندوستانی عیسائیوں ، اینگلو انڈین اور یورپین تجارتی حلقوں نے آپس میں مِل کر ایک سمجھوتہ طے کر لیا ۔ اس سمجھوتے میں جداگانہ انتخاب کے اصول کو بنیاد بنا کر یہ اعلان کیا گیا کہ اس معاہدے پر دستخط کرنے والے گروہ ہندوستان کی کل آبادی کے 46 فیصد حصے کی نمائندگی کرتے ہیں ۔ جب یہ سمجھوتہ کانفرنس کی ایک ذیلی کمیٹی کے روبرو پیش

کیا گیا تو وہاں ایم ۔ کے گاندھی نے اسے رد کر دیا ۔

دوسری گول میز کانفرنس کے اختتام پر برطانوی وزیراعظم نے حکومتی پالیسی کا اعلان کیا ۔ اس میں انھوں نے ذمے دار وفاقی حکومت اور داخلی صوبائی خودمختاری کے برطانوی اصول کا اعادہ کیا۔ فرقہ وارانہ مسئلے کو انھوں نے اصل رکاوٹ قرار دیا اور زور دیا کہ اس مسئلے کو ہندوستانی خود باہمی اتفاق رائے سے حل کریں ۔ اگر یہ ممکن نہ ہو سکا تو پھر حکومت اپنی طرف سے کوئی عارضی سکیم نافذ کرے گی ۔

کمیونل ایوارڈ

ہندو اور مسلمان رہنما اپنی اپنی اقوام کے سیاسی تحفظات کے تناظر میں فرقہ وارانہ/اقلیتوں کے مسئلے پر مشترکہ فارمولا طے کرنے میں قاصر رہے ۔ حکومت برطانیہ نے اگست 1932ء کو اقلیتوں کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے ایک فارمولے کا اعلان کیا ۔ اسے کمیونل ایوارڈ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔ اس کے نمایاں پہلو یہ تھے ۔

1- جداگانہ طریقِ انتخاب کو بدستور جاری رکھا جائے گا ۔

2- جن صوبوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں ، وہاں ان کی آبادی سے زیادہ انھیں نمائندگی دی جائے گی ۔ اس ضمن میں بنگال اور آسام میں یورپین اقوام ، پنجاب میں سکھوں اور سندھ اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں ہندوؤں کو بھی ان کی آبادی سے زیادہ نشستیں ملیں گی ۔

3- اچھوتوں (1) کو بھی جداگانہ انتخاب کا حق دے دیا جائے گا ۔

4- مختلف صوبوں میں مسلمانوں کی نمائندگی کا یہ تناسب رکھا گیا ۔

---

(1) ہندوؤں میں قدیم دور سے جو سماجی ڈھانچہ چلا آرہا ہے ، اس میں اچھوتوں کو سب سے ادنیٰ حیثیت حاصل ہے ۔ یہ لوگ دوسری ذاتوں کے لیے ہر قسم کی خدمت کرنے پر مجبور کیے جاتے تھے ۔ ہندوؤں میں ان کی آبادی کا تناسب تقریباً 50 فیصد تھا ۔ ان کی محنت کو دوسری ذاتیں اپنی خوشحالی کے لیے استعمال کرتی تھیں مگر ان کی ہندو نظام حیات میں حیثیت محض ایک مجبور آلۂ کار سے زیادہ نہ تھی ۔ اس لحاظ سے ان کو ہندو نظام میں شامل کرتے ہوئے بھی علٰحدہ رکھا جاتا تھا ۔ ان کی بستیاں عام آبادیوں سے الگ ہوتی تھیں ، ان کا سایہ اگر کسی دوسری

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

صوبہ	کل نشستیں	مسلمانوں کی نشستیں
یوپی	228	66
پنجاب	175	86 (مسلمان یہاں اکثریت میں تھے ۔)
بنگال	250	119 (" " ")
بمبئی	175	30
شمال مغربی سرحدی صوبہ	50	36
مدراس	215	29
سندھ	60	34
بہار ، اڑیسہ	175	46

مسلمانوں نے وسیع تر سیاسی مفاد میں کمیونل ایوارڈ کو قبول کر لیا حالانکہ مسلمانوں کو اس سے خاص فائدہ نہ پہنچ رہا تھا ۔ تاہم انھوں نے یو پی ، بہار ، اڑیسہ اور مدراس کی قانون ساز اسمبلیوں میں مسلمانوں کی نمائندگی کو کم کرنے اور شمالی سرحدی صوبے میں غیر مسلموں کو ان کی آبادی سے تین گنا زیادہ نمائندگی دینے پر سخت تنقید کی ۔

ایم ۔ کے گاندھی نے کمیونل ایوارڈ میں شودروں کو جداگانہ انتخاب کا حق دینے کو 'ان کے جسم کو چیر کر ٹکڑے کر دینے' کے مترادف قرار دیا انھوں نے اس ایوارڈ

ذات کے ہندو پر پڑ جاتی تو وہ اپنے آپ کو ناپاک سمجھنے لگتا ۔ شودر کے لیے مذہبی کتب کا پڑھنا اور سننا بھی منع تھا ۔

ایسی حالت میں جب ہندوستان کی دوسری قومیں اور اقلیتیں اپنے سیاسی حقوق کے لیے کوشاں تھیں ، شودروں کے ایک رہنما ڈاکٹر امبیدکر نے شودروں کی سماجی اور سیاسی سطح پر حیثیت کو بہتر بنانے کی کوشش کی ۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر ہندو سماج میں شودروں کی ذات دوسروں کے لیے ناپاک ہے تو اس کا مطلب ہے کہ ان کو ہندو نظام حیات میں شامل نہیں سمجھا جاتا ۔ ان کی حیثیت محض خدمت گزار سے زیادہ نہیں ۔ اس لیے ان کو اپنے تشخص کے لیے کوشش کرنی چاہیے جو ہندوؤں کے نظام سے الگ ہو ۔ اس سے ہندوؤں کے مقابلے میں دوسری تمام اقوام کو بڑی تقویت ملی ۔ شودروں کو دلت بھی کہا جاتا ہے اور آج بھی بھارت میں ان کی تحریکیں جاری ہیں ۔

کو منسوخ کروانے کے لیے 30- ستمبر 1932ء سے تامرگ بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ ایم۔ کے گاندھی کے اس اقدام پر ہندو رہنماؤں میں شدید تشویش پیدا ہو گئی۔ انھوں نے شودروں کے رہنما ڈاکٹر امبیدکر (1) سے پونا میں مذاکرات شروع کر دیے۔ انھوں نے ڈاکٹر امبیدکر کو ایوارڈ میں دی گئی مراعات کو منسوخ کرنے کے اعلان پر مجبور کیا۔ آخر ایک معاہدے پر دستخط ہوئے جو پُونا پیکٹ، کے نام سے مشہور ہے۔ اس معاہدے میں ہندو رہنماؤں نے شودروں کے رہنماؤں سے یہ طے کیا کہ کمزور ذاتوں (شودروں) کی نمائندگی کے لیے خصوصی نشستیں رکھی جائیں گی۔ صوبائی اسمبلیوں میں مخصوص نشستوں کی تعداد 148 رکھی گئی۔ مرکزی مقننہ میں عام سیٹوں میں سے 10 فیصد نشستیں شودروں کے لیے مخصوص کی گئیں۔ تاہم یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ اس معاہدے کا مقصد فوری طور پر سیاسی مفادات حاصل کرنا تھا۔ حقیقی معنوں میں اس سے شودروں کو کوئی فائدہ نہ پہنچا کیونکہ طریقہ انتخاب اس طرح کا بنایا گیا تھا کہ موجود سماجی حالات میں شودروں پر اثر انداز بھی ہوا جا سکتا تھا اور کانگرس یا علاقے کے بااثر لوگوں کی مرضی کے مطابق ہی لوگوں کا انتخاب ہو سکتا تھا۔

پونا پیکٹ کے ساتھ ہی ایم۔ کے گاندھی نے بھوک ہڑتال ختم کر دی۔ اس معاہدے کو حکومت نے بھی تسلیم کر لیا۔

تیسری گول میز کانفرنس

یہ کانفرنس 17- نومبر تا 24 دسمبر 1932ء لندن میں منعقد ہوئی۔ اس میں کانگرس نے شرکت نہ کی۔ قائداعظم بھی اس کانفرنس میں موجود نہ تھے۔ اس میں بھی مجوزہ وفاق اور اس کے اختیارات پر بحث مباحثہ ہوتا رہا مگر یہ سب نتیجہ خیز نہ ہوا۔

1- ڈاکٹر بھیم راؤ رام جی امبیدکر (1893ء 1956ء) ۔ ہندوستان کی اچھوت قوم کے مشہور لیڈر۔ انگلستان اور امریکہ میں تعلیم حاصل کی۔ ابتدا میں اونچی ذات کے ہندوؤں کے ظلم و ستم سے بہت تنگ آئے۔ بعد میں اچھوتوں کو منظم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ آئین ساز اسمبلی کا رکن چنا گیا۔ آزادی کے بعد ہندوستان کا آئین بنایا۔ آخر میں بدھ مت اختیار کر لیا۔

قانون حکومتِ ہند 1935ء

تینوں گول میز کانفرنسوں کی سفارشات کو برطانوی حکومت نے ایک قرطاسِ ابیض (WHITE PAPER) کی صورت میں شائع کروا دیا۔ اسے اپریل 1933ء کو برطانوی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے سولہ اراکین پر مشتمل ایک کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا۔ کمیٹی نے مختلف رہنماؤں سے مشورے کے بعد قرطاسِ ابیض کی سفارشات میں کوئی خاص تبدیلی نہ کی۔ 5- فروری کو وزیرِ ہند نے حکومت ہند کا مسودہ قانون برطانوی ایوانِ زیریں (HOUSE OF COMMONS) میں پیش کیا۔ یہاں سے منظوری کے بعد ایوانِ بالا (HOUSE OF LORDS) سے منظور کروایا گیا۔ 2- اگست 1935ء کو اس قانون پر شاہی دستخط ہوئے۔

اس ایکٹ کی اہم شقیں یہ تھیں :-

1- ہندوستان میں وفاقی طرزِ حکومت نافذ کیا گیا۔ اس وفاق میں ہندوستان کے صوبے اور شاہی ریاستیں شامل تھیں۔

2- مرکز میں دو ایوانی مقننہ قائم کی گئی۔ ایوان بالا کا نام کونسل آف سٹیٹ اور ایوانِ زیریں کا نام فیڈرل اسمبلی تجویز کیا گیا۔

3 صوبوں میں دو عملی نظام (DYARCHY) کو ختم کر دیا گیا۔ تاہم اسے مرکز میں جاری کر دیا گیا۔

4- وفاق اور وفاقی اکائیوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم کے لیے تین فہرستیں اِس قانون میں شامل کی گئیں۔

(i) مرکزی فہرست : اس میں وہ تمام امور شامل تھے جن پر مرکز کو مکمل اختیارات حاصل تھے۔ مثلاً دفاع، امورِ خارجہ، کرنسی اور فوج وغیرہ۔

(ii) صوبائی فہرست : اس فہرست میں وہ تمام امور شامل تھے جن پر صوبائی حکومتوں کو مکمل ختیارات حاصل تھے۔ ان میں امنِ عامہ، پولیس، جیل خانے، تعلیم، سڑکیں، جنگلات اور آبپاشی وغیرہ شامل تھے۔

(iii) مشترکہ فہرست : اس فہرست میں شامل امور کے متعلق مرکزی اور صوبائی حکومتیں قانون بنانے کا اختیار رکھتی تھیں ۔ لیکن اگر مشترکہ فہرست میں شامل کسی چیز کے متعلق مرکز نے قانون بنا دیا ہو تو صوبائی حکومت کو قانون بنانے کا حق نہیں رہتا تھا ۔ اگر صوبائی اور مرکزی قانون میں اختلاف ہو جائے تو صوبائی قانون کالعدم ہو جاتا اور مرکزی قانون پر عمل کیا جاتا تھا ۔

5- مقننہ کے اختیارات کو محدود کر دیا گیا ۔ اس ایکٹ میں ترمیم کا اختیار صرف برطانوی پارلیمنٹ کو تھا ۔ مرکزی بجٹ کے سلسلے میں بھی مقننہ کے اختیارات محدود تھے ۔ بجٹ کا 80 فیصد حصہ مقننہ کے ووٹ سے مستثنٰی تھا ۔ مقننہ کے منظور کردہ تمام قوانین کی منظوری گورنر جنرل سے لینا ضروری تھی ۔

6- اِس ایکٹ میں ہندوستان میں پہلی مرتبہ صوبائی خودمختاری اور ذمے دار طرز حکومت کے اصول کو نافذ کرنے کی کوشش کی گئی ۔ صوبائی حکومتوں کو ایک حد تک مرکزی حکومت کے اثر سے آزاد رکھنے کی کوشش کی گئی ۔

7- رائے دہی کا حق حاصل کرنے کی شرائط مختلف صوبوں میں مختلف تھیں ۔ پنجاب میں رائے دہی کا حق صرف ان لوگوں کو حاصل تھا جو سالانہ کم از کم 5 روپے مالیہ ادا کرتے ہوں یا ایسی ناقابلِ انتقال جائیداد کے مالک ہوں ، جس کی مالیت 60 روپے سے کم نہ ہو یا جو کم از کم پرائمری تک تعلیم یافتہ ہو ۔ خواتین میں حق رائے صرف ان کو حاصل تھا جو جائیداد کی شرط پوری کرتی ہوں یا وہ ایسے شخص کی بیوی یا بیوہ ہو جو جائیداد کی شرط پوری کرتا ہو ، یا وہ ملٹری کے پنشنر کی بیوی یا والدہ ہو یا پھر تعلیم کی شرط پوری کرتی ہو ۔

8- صوبائی اسمبلیوں میں صرف ان امور سے متعلق قانون سازی کی اجازت تھی جو صوبائی اور مشترکہ فہرست میں شامل تھے ۔ صوبائی مقننہ کا منظور کردہ قانون گورنر یا گورنر جنرل کی منظوری کے بغیر لاگو نہ ہو سکتا تھا ۔

مجموعی طور پر 1935ء کا ایکٹ ، ہندوستان کی آئینی تاریخ میں ایک اہم پیش رفت ثابت ہوا مگر دوسرے سابقہ ایکٹوں کی طرح اس میں دی گئی مراعات کو اسقدر

شرائط میں جکڑ دیا گیا کہ یہ تقریباً غیر مؤثر ہو چکا تھا ۔ ان شرائط کا مقصد مرکزی اداروں کی حیثیت کو بدستور برقرار رکھنا اور کلیدی عہدیداروں کی طاقت کو مکمل طور پر قائم رکھنا تھا ۔ اِس ضمن میں 1935 ء کے ایکٹ کی سب سے اہم خصوصیت اِس میں دی گئی صوبائی خود مختاری تھی ۔ صوبائی خود مختاری پر ساتھ ہی اس قدر پابندیاں نافذ کر دی گئیں تھیں کہ اس کی اصل روح سلب ہو گئی ۔ گورنر کے اختیارات اسقدر وسیع تھے کہ وہ آسانی سے وزیر اعلیٰ کی کارکردگی کو متاثر کر سکتا تھا ۔ وہ کسی بھی معاملے میں وزیر اعلیٰ پر اپنی رائے ٹھونس سکتا تھا ۔ انھی اختیارات کی بنیاد پر وہ بآسانی ذمہ دار طرزِ حکومت کے اصول کو مجروح کر سکتا تھا ۔

اس ایکٹ میں انتظامی اور قانون سازی کے سلسلے میں تمام تر بنیادی اختیارات حکومت کے اعلیٰ حکام کے پاس ہی رہے ۔ صوبوں اور مرکز کے درمیان اختیارات کی تقسیم میں اہم اور بنیادی اہمیت کے ادارے مرکز کے پاس رہے ۔ مشترکہ فہرست کے امور میں مرکزی قانون کو صوبائی قانون پر برتری حاصل تھی ۔ گورنر جنرل ، ان تمام ترجیحی انتظامی و قانونی اختیارات کے باوجود براہ راست صوبائی انتظام خود سنبھالنے کا بھی مجاز تھا ۔

اِس ایکٹ میں ہندوستان کی کوئی بھی اسمبلی ترمیم نہ کر سکتی تھی ۔ بجٹ کے 80 فیصد حصے پر وہ رائے زنی نہ کر سکتے تھے ۔ اِس کی اصل وجہ یہ تھی کہ ہندوستان کے بجٹ کا زیادہ تر حصہ حکومت کی فوجی اور دفاعی ضروریات کی نذر ہو جاتا تھا ۔ ترقیاتی و بہبود کے شعبوں کے لیے نہایت کم روپیہ مخصوص کیا جاتا تھا ۔ اس طرح ہندوستان کے غریب عوام کی کمائی ہوئی دولت کو ذاتی اغراض پر خرچ کر دیا جاتا تھا اور اس پر طرّہ یہ کہ ہندوستانی نمائندے اس بجٹ پر کسی قسم کی تنقید یا ترمیم نہ کر سکتے تھے ۔ یہاں اس بات کی بھی وضاحت ضروری ہے کہ 1917 ء سے پہلے فوج میں کوئی ہندوستانی بطور کمیشنڈ آفیسر شامل نہیں ہو سکتا تھا ۔

مسلم لیگ اور کانگرس دونوں نے اس ایکٹ پر عدم اطمینان کا اظہار کیا ۔ اس پر مولوی فضل الحق نے یہ تبصرہ کیا ۔ "اس ایکٹ کے تحت نہ تو مسلم راج قائم ہوا ، اور نہ ہی ہندو راج قائم ہوا ، بلکہ برطانوی راج قائم ہوگیا ۔"

تجزیہ

ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاست کے سب سے اہم مقاصد یہ تھے کہ ہندوؤں کی اکثریت کے مقابلے میں ان کو بہتر پوزیشن حاصل ہو سکے اور اس کے تحت ان کے اقتصادی اور معاشرتی تحفظات کا خاطر خواہ خیال رکھا جا سکے ۔ اسی کے لیے مسلمانوں نے مندرجہ ذیل ترجیحات کو اپنی سیاست کی بنیاد بنایا ۔

(1) مسلمانوں کی بنگال ، پنجاب اور شمالی سرحدی صوبے میں اکثریت کی بنیاد پر انھیں مرکزی حکومت میں $\frac{1}{3}$ نشستیں دی جائیں ۔ اس مطالبے کی کامیابی کی صورت میں وہ مرکزی حکومت پر خاطر خواہ دباؤ ڈال سکتے تھے ۔ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کرنے کی صورت میں بھی مسلمانوں کو اِس علاقے میں علٰحدہ اکثریتی حیثیت حاصل ہو سکتی تھی ۔

(2) مسلمان رہنماؤں کی حتی المقدور کوشش تھی کہ ہندوؤں کے ساتھ مفاہمت کر کے ایک مشترکہ سیاسی لائحۂ عمل اپنایا جائے اور اس کی بنیاد پر برطانوی حکومت کو ہندوستان میں ذمہ دار یا خود اختیاری حکومت قائم کرنے پر مجبور کیا جائے ۔

1935ء تک مسلمان اس قسم کے تحفظات کو اگرچہ حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے مگر انگریزوں اور ہندوؤں پر یہ بات ضرور عیاں ہوگئی کہ ہندوستان میں کسی بھی آئینی یا سیاسی حل میں مسلمانوں کی رائے اور مفادات کو شامل رکھنا اشد ضروری ہے ۔

بیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں ایم ۔ کے گاندھی کے عروج سے کانگرس میں گوکھلے اور دوسری اعتدال پسند لبرل رہنماؤں کا اثر کم ہوگیا تھا ۔ ایم ۔ کے گاندھی کا اندازِ سیاست مُبہم تھا اور اس سے دونوں اقوام میں مذہب کی بنیاد پر بُعد

بڑھنے لگا ۔ ایم ۔ کے گاندھی نے اپنے سیاسی مقصد اور نصب العین کی اپنی سیاسی کیریئر کے ابتدا میں ہی وضاحت اس طرح کر دی تھی :۔

"یہ پتہ چل جانے کا کہ میرے نزدیک سیاست مذہب کے علاوہ کچھ نہیں ۔۔ مجھ میں موجود سیاستدان کبھی بھی میرے فیصلوں پر اثرانداز نہیں ہوا ، اگر میں سیاست میں حصہ لیتا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ آج کل سیاست نے ہمارے گرد سانپ کی طرح کنڈل ڈالا ہوا ہے جس سے باہر جانا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے خواہ ہم کتنی بھی کوشش کر لیں ۔ اس سانپ کا مقابلہ کرنے کے لیے ، میں سیاست میں مذہب کو شامل کر کے اپنے اور اپنے دوستوں کے ساتھ تجربات کر رہا ہوں ۔"

اسی طرح اپنے اخبار Young India میں انھوں نے اپنے مذہب کی وضاحت یہ کی :۔

"میں اپنے آپ کو سناتنی (بنیاد پرست) ہندو سمجھتا ہوں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ویدوں ، اپنشدوں اور پورانوں میں یقین رکھتا ہوں اور ان کے علاوہ جو بھی ہندو مقدس کتابوں اور ان کے اوتاروں اور آواگون میں بھی یقین رکھتا ہوں ۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں ویدوں کے ورن دھرم (ذات پات کے نظام) میں بھی یقین رکھتا ہوں ۔ تیسری بات یہ ہے کہ میں گاؤ کی حفاظت کو اپنے ایمان کا حصہ سمجھتا ہوں اور چوتھی بات یہ ہے کہ میں بتوں کی پوجا کا منکر نہیں ہوں ۔"

ایم ۔ کے گاندھی نے مسلمانوں سے اپنے تعلقات کی نوعیت کی اس طرح وضاحت کی ۔ یہ بات انھوں نے تحریک خلافت کے آخری دور میں کہی ۔

"اس بات کی سرگوشی کی جا رہی ہے کہ مسلمانوں کے اتنا قریب رہنے کے باعث ، اب میں ہندو دماغ کو سمجھنے سے قاصر ہوں ۔ میں خود ہی ہندو دماغ ہوں ۔ یقیناً مجھے ہندو دماغ کو جاننے کے لیے ہندوؤں میں رہنے کی ضرورت نہیں کیونکہ میرے وجود کا ایک ایک ریشہ ہندو ہے ۔ میرا

ہندومت یقیناً بہت کمزور ہو گا کہ اگر یہ غیر موزوں حالات میں پنپ نہیں سکتا۔"

اِن تمام باتوں سے ہندو سیاست اور اِس کے مرکزی رہنما کے انداز سوچ اور ترجیحات کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

1935ء تک برطانوی حکومت کی سیاسی ترجیحات واضح طور پر یہ نظر آ رہی تھیں کہ وہ ہندوستانی سیاست میں 'تقسیم کرو اور حکومت کرو' کے اصول پر عمل کر رہی ہے۔ بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں ہندوستان میں شدید سیاسی مزاحمت اور میثاقِ لکھنؤ کے بعد ایم۔ کے گاندھی کے عملی سیاست میں آنے سے بلاواسطہ انگریزوں کے عزائم کی بارآوری ممکن ہو گئی۔ گاندھی کے اندازِ سیاست میں عدم تشدد، مبہم اور غیر راست سیاسی تحریکوں کے باعث انگریزوں کو نہ صرف ہندوستان میں لبرل رہنماؤں کے واضح اور راست سیاست سے چھٹکارا مل گیا بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں فاصلے بڑھنے لگے۔

اِن حالات میں انگریز مسلمانوں اور ہندوؤں کو مکمل اور واضح سیاسی اقتدار دینے کی بجائے قسطوں میں تدریجاً حکومتی معاملات میں شامل کر رہے تھے۔ اس کی مثال 1935ء تک کے تمام آئینوں کے مقاصد سے دی جا سکتی ہے۔ اِن تمام آئینوں میں مشترک بات یہ تھی کہ ان میں مقامی لوگوں کو دی جانے والی تمام سہولتیں مشروط ہوتی تھیں۔ (اس ضمن میں پہلے بحث کی جا چکی ہے۔) پھر مجموعی انتظام اس طرح کیا جاتا تھا کہ ان کے نتائج کچھ اور نکلتے تھے اور بظاہر کچھ اور لگتا تھا۔ 1935ء کے آئین میں وفاقی طرز بظاہر تمام ریاستوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے تھی اور اس کا مقصد صوبائی اختیارات اور ذمہ داری کو بڑھانا تھا مگر پنجاب میں اس سے اقتصادی طور پر کیا ہو سکتا تھا، اس کی مثال ایک فنانس کمشنر کی کتاب THE WELFARE OF PUNJAB میں اس طرح دی گئی ہے:۔

"ہندوستان کے وفاق میں شامل ہونے کے بعد پنجاب پر اقتصادی موت طاری ہو جائے گی اور اس کی تمام ذمے داری ان لوگوں پر عائد ہو گی جو

غیر پنجابی ہوں گے ۔ مرکز پر ان کا قبضہ ہو گا ، وہ مرکز کے مفاد کا لحاظ کرتے ہوئے پنجاب کا خون شیرِ مادر کی طرح پی جائیں گے ۔ وفاقی دستور کے تحت پیداوار کے اہم وسائل دوسرے ہاتھ میں ہوں گے ۔

ریلوے ، ڈاک ، تار ، بحری و بری ذرائع حمل و نقل تمام کے تمام صوبہ جات خود مختاری کے حلقۂ اختیار سے باہر ہوں گے ۔ حتیٰ کہ پنجاب کی پیداوار کے لیے منڈیاں تلاش کرنا ، ان کو مناسب قیمتوں پر فروخت کرنا اور اس قسم کے اہم کام ان کے سپرد ہوں گے ، جنھیں پنجاب سے کوئی ہمدردی نہیں ۔ نرخوں کا تعین خارجی اثرات کے ماتحت ہو گا ۔ درآمد برآمد کے سلسلے میں پالیسی مرکزی ہو گی ۔ پنجاب کے لیے سب سے زیادہ خطرناک بمبئی کے تاجروں کا وہ مہلک اثر ہے ، جو مرکزی حکومت سے درآمد پر محصول بڑھواتا ہے ۔ مرکزی حکومت اپنی آمدنی بڑھانے کے لیے اور بمبئی کے تاجروں کے کاروبار کو ترقی دینے کے لیے بیرونی اشیاء کی درآمد پر بھاری محصول عائد کرے گی ۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ ہندوستان کی برآمد پر بھی اسی قسم کی پابندی عائد ہو گی ۔ برآمد کم ہو جائے گی اور چونکہ ہندوستان کی برآمد کا بیشتر حصہ خام مال اشیا پر مشتمل ہے جو زیادہ تر پنجاب ، سندھ وغیرہ کے زرعی صوبے مہیا کرتے ہیں ۔ اس سے براہ راست ان صوبوں کی 80 فیصد آبادی پر معاشی بوجھ بڑھے گا ۔"

یادِ دہانی

* 1919ء کے ایکٹ میں دی گئی ایک شق کے تحت سائمن کمیشن بنایا گیا ۔ اس کی رپورٹ کو بنیاد بنا کر گول میز کانفرنسوں کا انعقاد کیا گیا تاکہ ہندوستان کے مختلف سیاسی مکاتب فکر کی آرا معلوم کی جا سکیں ۔

* گول میز کانفرنس کے تینوں اجلاسوں میں کسی حتمی آئینی حل کی نشاندہی نہ ہو سکی۔ تاہم اِن میں جو سفارشات سامنے آئیں ان کو سائمن کمیشن کی رپورٹ کے ساتھ ملا کر، برطانوی پارلیمنٹ نے 1935ء کا ایکٹ تیار کیا۔
* 1935ء کے ایکٹ میں ہندوستان میں وفاقی طرزِ حکومت قائم کیا گیا مگر یہ اپنی نوعیت اور تنفیذ کے اعتبار سے غیر مؤثر رہا۔
* 1935ء تک مسلمانانِ ہند، اپنے سیاسی مستقبل کے لیے جن ترجیحات پر عمل کرتے رہے، ان کو حاصل کرنے میں کوئی خاص پیش رفت تو نہ ہوئی، البتہ اس سے ہندوؤں اور انگریزوں پر یہ بات واضح ہو گئی کہ ہندوستان میں کسی بھی سیاسی یا آئینی حل کے لیے مسلمانوں کی رائے کو شامل کرنا ضروری ہے۔

غور و فکر کے لیے چند نکات

(الف)

1- گول میز کانفرنسوں میں مختلف سیاسی رہنماؤں کی آرا سے ہندوستانی سیاست کے کن کن رجحانات کی نشاندہی ہوتی ہے؟ تبصرہ کریں۔

2- 1935ء کے ایکٹ میں برطانوی حکومت کا پوشیدہ مقصد ہندوستانیوں کو ایک ہاتھ سے اختیار دے کر دوسرے ہاتھ سے چھیننا تھا، 1935ء کے ایکٹ کی شقوں کی روشنی میں تجزیہ کریں؟

(ب) مختصر جواب دیں۔

I- گول میز کانفرنسوں میں ایم۔ کے گاندھی کے رویے پر تبصرہ کریں؟

II- دوسری گول میز کانفرنس میں ایم۔ کے گاندھی نے کانگرس کو ہندوستان کی تمام اقوام کی واحد نمائندہ جماعت قرار دیا، اس پر اپنے تأثرات قلمبند کریں؟

III- شودروں کو جداگانہ حق انتخاب دینے سے ہندوؤں کی سیاست میں کس قسم کی تبدیلیاں رونما ہو سکتی تھیں؟

IV- 1935ء کے ایکٹ میں وفاق اور وفاقی اکائیوں کو دیے جانے والے اختیارات پر نوٹ لکھیں ؟

V- 1935ء تک مسلمان رہنماؤں نے جو سیاسی ترجیحات معین کر رکھی تھیں ، آپ کے خیال میں کیا یہ درست تھیں ؟ اگر آپ بھی اُس دَور میں ہوتے اور آپ کو مسلمانوں کی رہنمائی کا کام کرنا پڑتا تو آپ اس سلسلے میں کیا کرنا پسند کرتے ؟

(ج) درست بیان کے سامنے ✓ کا نشان لگائیں ۔

(1) مرتبۂ نو آبادی سے مراد وہ ملک ہے جو صرف اپنے داخلی معاملات میں آزاد ہو ۔

(2) پہلی گول میز کانفرنس میں کانگرس کی نمائندگی ایم ۔ کے گاندھی نے کی ۔

(3) شودر قوم ، ہندو نظام معاشرت میں شریک ہونے کے باوجود ، اس سے خارج سمجھی جاتی تھی۔

(4) دوسری گول میز کانفرنس میں ایم ۔ کے گاندھی کی شمولیت کو ضروری نہ سمجھا گیا ۔

(5) کمیونل ایوارڈ کے اعلان کے ساتھ ہی ایم ۔ کے گاندھی نے تامرگ بھوک ہڑتال شروع کر دی ۔

(6) 1935ء کے آئین میں تمام اختیارات صوبوں کو دے دیے گئے ۔

(7) 1935ء کے آئین میں ہندوستان کی کوئی بھی اسمبلی ترمیم کر سکتی تھی ۔

(8) ایم ۔ کے گاندھی کے نظریات کٹڑ ہندو پرستانہ تھے ۔

(9) ایم۔ کے گاندھی کے سیاست میں داخلے سے انگریزوں کی مشکلات میں کمی ہو گئی ۔

(10) 1935ء کے آئین کے بعد پنجاب کی معاشی صورت حال خراب ہو گئی ۔

12
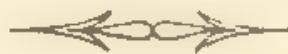
انتخابات 1937ء اور کانگرسی وزارتیں

"ہندوستان کے مسلمانوں کو کانگرس سے علیحدہ کر دینے کی ساری ذمہ داری کانگرس کے موجودہ رہنماؤں پر ہے اور خصوصاً گزشتہ دس برس سے ان کا [illegible] ایسا ہو رہا ہے کہ مسلمان خود بخود اس سے بیزار ہو کر کنارہ کش ہو رہے ہیں۔ اپنے چھ اکثریت والے صوبوں میں جب سے انہوں نے وزارت قائم کی ہے تب سے اپنے پروگرام و اعمال و الفاظ سے مسلمانوں پر یہ واضح کر دیا ہے کہ انہیں حق و انصاف کے خیال کو بالائے طاق رکھ دینا چاہیئے۔ جہاں جہاں ان کی اکثریت ہے وہاں مسلم لیگ کے ساتھ تعاون سے قطعی انکار کر دیا اور یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ لیگ بغیر کسی شرط کے ان کے عہدناموں پر دستخط کر دے ——— موجودہ کانگرس کی پالیسی کا نتیجہ یہ ہو گا کہ باہمی کشمکش، فرقہ وارانہ فسادات [illegible] زیادہ ہوں گے اور اس کے باعث شہنشاہی اقتدار اور بھی زیادہ مستحکم ہو جائے گا۔ میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ برطانوی حکومت کانگرس کی موجودہ ذہنیت کی حمایت کرے گی اور جب تک امپیریل حقوق اور مفادات [illegible] کے معاملات میں مداخلت یا نقصان نہ پہنچے گا، اس وقت تک وہ کانگرس کی [illegible] کرتے ہوئے اپنا الو سیدھا کرتی رہے گی۔ میرا یقین ہے۔ کانگرس نے بذات خود ہندوستانیوں میں بہت اختلافات پیدا کر دیے ہیں اور مشترک عمل ناممکن بنا دیا ہے۔"

یہ قائداعظم کے اس خطبۂ صدارت کا ایک حصہ ہے جو نھوں نے اکتوبر 1937ء کو مسلم لیگ کے اجلاس میں دیا ۔ اس خطبے میں کانگرسی وزارتوں کے طرزِ عمل اور اس کے ہندوستانی سیاست پر اثرات کا تجزیہ موجود ہے ۔ اس میں قائدِ اعظم نے انگریزوں کے طرزِ عمل کا بھی بھانڈہ پھوڑ دیا ہے ۔

کانگرسی، وزارتوں کے رویّے کے بعد مسلمان رہنماؤں نے ہندوؤں سے اشتراکِ عمل کو خارج از امکان قرار دے دیا اور اِس کے بعد انھوں نے ہندوستان میں اپنی الگ راہ اور منزل کے لیے کوشش شروع کر دی ۔ کانگرسی وزارتوں کے دَور میں کیا ہو ، اور کس طرح مسلمانوں کو اِن کے روّیے سے مایوسی ہوئی ، اس کا حال یہاں دیا جاتا ہے ۔

ہندوستان میں 1937ء میں 1935ء کے ایکٹ کی بنیاد پر الیکشن ہوئے ۔ یہ یہاں کی سیاسی جماعتوں کی عوام میں مقبولیت کا ایک بہت بڑا امتحان تھا ۔ 1936ء کے اواخر میں مسلم لیگ اور کانگرس نے اپنے اپنے انتخابی منشور شائع کیے ۔ مسلم لیگ نے مندرجہ ذیل اصولوں پر عمل کرنے کا وعدہ کیا :۔

مسلم لیگ کا منشور

1- موجودہ صوبائی دستور اور مجوزہ مرکزی دستور کی بجائے فوراً جمہوری طرز کی مکمل حکومت خود اختیاری قائم کی جائے ۔

2- مختلف مجالسِ قانون ساز کے مسلم لیگی نمائندے ان مجالس قانون ساز کو اس غرض سے استعمال کریں گے کہ قومی زندگی کے مختلف میدانوں میں عوام کی ترقی کے لیے دستور سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کیا جا سکے ۔

3- مسلمانوں کے مذہبی حقوق کی حفاظت ۔

4- تشدّد آمیز قوانین کی تنسیخ کی کوشش ۔

5- ان تمام قوانین کی مخالفت جو ہندوستان کے مفاد کے منافی ہوں اور جو افراد کے بنیادی حقوق پر اثر انداز ہوتے ہوں ۔

6- نظم و نسق کا خرچہ کم کرنا اور بچت کو تعمیری کاموں میں صرف کرنا۔

7- ہندوستان کا فوجی خرچ گھٹانا اور فوج میں ہندوستانیوں کی شمولیت، صنعتوں کا فروغ، دیہاتی آبادی کی اقتصادی، معاشرتی، اور تعلیمی بہبود کی کوشش کرنا۔

8- ابتدائی تعلیم عام کرنا اور اسے لازمی قرار دینا۔

9- اردو زبان اور رسم الخط کی حفاظت کرنا۔

10- ملک میں صحیح رائے عامہ اور عام سیاسی بیداری پیدا کرنا۔

اِن مقاصد کے علاوہ مسلم لیگ کی جانب سے سب سے اہم اعلان دوسری سیاسی جماعتوں سے تعاون کے لیے ہاتھ بڑھانے سے متعلق تھا۔ قائداعظم نے اپنی انتخابی تقاریر میں اس طرح کے خیالات کا اظہار کیا :-

"ہماری تحریک مخاصمت پر مبنی تحریک نہیں۔ ہماری تحریک اپنی دوسری قومیتوں کے لیے صلح کا پیغام رکھتی ہے۔ ہم کسی بھی گروہ یا گروہوں کے ساتھ تعاون کرنے، ان کو ساتھ ملا کر کام کرنے پر تیار ہیں، بشرطیکہ ان کا نصب العین اور مقاصد کسی حد تک ہمارے قریب تر ہوں۔"

ایک اور جگہ انھوں نے کہا :-

"مسلم لیگ، ہندوستان کے عوام کے لیے مکمل قومی خود اختیار حکومت کے قیام کے لیے کوشاں ہے۔ ہندوؤں، مسلمانوں اور دیگر قومیتوں کے درمیان اتحاد اور باعزت مفاہمت ہی ایسا ستون ہے، جس پر ہندوستان کے 380 ملین (افراد) کی قومی حکومت خود اختیاری کو تعمیر کیا جاسکتا ہے اور اسے برقرار بھی رکھا جا سکتا ہے۔"

مسلم لیگ، ہندوستان میں مرکزی سیاست کی سطح پر مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تھی تاہم مسلم اکثریت کے صوبوں میں دوسری کئی جماعتیں سیاسی طور پر اہم مقام کی حامل تھیں۔ اس کا جائزہ حسبِ ذیل ہے۔

پنجاب

پنجاب میں اہم سیاسی جماعت 'یونینسٹ پارٹی' تھی ۔ اس پارٹی کے رہنما سر فضل حسین (1) تھے ۔ ان کا پنجاب میں سب سے بڑ کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے دیہاتی آبادی کے استحصال کو ختم کرنے کی حقیقی معنوں میں کوششیں کیں ۔ اِس کے علاوہ پنجاب کے دیہاتوں میں کسی مذہب یا قوم کی تمیز کے بغیر سیاسی شعور پیدا کرنے کی سعی کی ۔ اِس سے پنجاب میں سر فضل حسین خاصے مقبول ہوئے ۔ انھوں نے پنجاب کے ہی ایک متمول جاٹ زمیندار سر چھوٹو رام کے ساتھ سیاسی اتحاد کر کے اپنی مجموعی سیاسی پوزیشن بہتر کر لی ۔

1935ء کے آئین میں جب صوبائی خود مختاری کا اعلان ہوا تو سر فضل حسین نے یونینسٹ پارٹی کو انتخابات میں اہم کامیابیاں دلانے کا عزم کیا ۔ 'مارشل لأ سے مارشل لأ تک' میں قائداعظم کی اس ضمن میں خواہش اس طرح رقم کی گئی ہے:

"تمام صوبوں میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر انتخابات لڑے جائیں ۔ ان کا نقطۂ نظر بہت صاف اور واضح تھا ، جسے وہ بار بار دہرا چکے تھے ۔ وہ

1- سر فضل حسین (1877ء -1936ء) نے عملی زندگی کی ابتدا لاہور ہائی کورٹ میں وکالت سے کی ۔ وہ ایک مختصر وقفے کے علاوہ 1921ء سے 1930ء تک پنجاب حکومت میں وزیر رہے ۔ 1925ء میں حکومت نے انھیں 'سر' کا خطاب دیا ۔ 1930-35ء وائسرائے کونسل میں تعلیم کے ممبر رہے ۔ وہ یونینسٹ پارٹی کے بانی تھے ۔ یونینسٹ پارٹی 1923ء میں قائم ہوئی ۔ پارٹی کا نصب العین صوبہ پنجاب کے اقتصادی حالت کو بہتر بنانا تھا ۔ اس کے لیے بہت سے پروگرام شروع کیے گئے جن میں سے اکثر کا تعلق کاشت کاروں سے تھا ۔ کاشت کاروں کی اقتصادی مشکلات کو کم کرنے میں اس پارٹی نے اہم کام کیے ۔ ان میں قرضوں کے لیے اداروں کا قیام ، رہن زمینوں کو ہندو ساہوکاروں سے چھڑانے کے لیے کوششیں کرنا ، سرکاری ملازمتوں میں زیادہ سے زیادہ آسامیاں دیہاتی آبادی کو دلانے کی کوشش کرنا وغیرہ شامل ہیں ۔ 1937ء کے انتخابات میں یونینسٹ پارٹی نے شاندار کامیابی حاصل کی ۔ پنجاب کی 140 نشستوں میں سے اٹھاسی مسلمانوں نے حاصل کیں ۔ 1946ء کے انتخابات میں یہ پارٹی بہتر کارکردگی کا مظاہرہ نہ کر سکی اور اس کے بعد یہ پارٹی عملی طور پر ختم ہو گئی ۔

مسلمانوں کو مسلم لیگ کے زیرِ قیادت ایک آزادی پسندانہ پروگرام پر چلانا چاہتے تھے ، جس کی عملی صورت اِس مرحلے پر ان کے نزدیک یہی تھی کہ صوبائی انتخابات کے ذریعے پورے ملک میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر مسلمانوں کی ایک پارلیمانی پارٹی ابھر آئے جو ملک کی آزادی کے سوال پر کانگرس کے ساتھ تعاون اور اشتراکِ عمل کرے ۔" (ص 172)

قائداعظم نے 5- جنوری 1936ء کو سر فضل حسین کو ایک خط لکھ کر ان کی مسلمانوں کے لیے خدمات کو سراہا اور مسلم لیگ کے آئندہ اجلاس میں صدارت کرنے کی پیش کش کی ۔ سر فضل حسین نے معذرت کر لی ۔ سر فضل حسین کو قائداعظم کے سیاسی تجزیے سے اختلاف تھا اور وہ اپنی توجہ صرف صوبائی خود مختاری کے موجودہ موقع تک محدود رکھنا چاہتے تھے ۔ ان کا نظریہ تھا کہ :

"اگر وہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر انتخابی مہم شروع کر دیں تو اس کے دو نتائج لازمی ہوں گے (1) میں اپنے امیدوار زیادہ سے زیادہ 86 مسلم حلقوں میں نامزد کر سکوں گا ۔ (2) فرقہ وارانہ نعرے پر میری انتخابی مہم کا لازمی ردِ عمل یہ ہو گا کہ ہندوؤں اور سکھوں میں بھی فرقہ وارانہ پارٹیوں کو تقویت حاصل ہو گی اور 'چھوٹو رام گروپ' کے لیے اپنے حلقوں میں سخت مشکلات پیدا ہو جائیں گی ۔ گویا خود اپنے عمل سے میں اس غیر مسلم گروپ کی شکست کے اسباب مہیا کر دوں گا ، جو بارہ برس سے مضبوطی کے ساتھ مسلم کیمپ کا ساتھ دے رہا ہے ۔ اس کے بعد کیا ہو گا؟ چھیاسی نشستیں صوبائی اسمبلی کے کل ایک سو پچھتر کے ایوان میں پہلے ہی اقلیت کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ لیکن عملی بات یہ ہے کہ انتہائی کامیابی کی صورت میں بھی مجھے پانچ ، دس فیصد حلقوں میں شکست کے لیے تیار رہنا چاہیے ۔ لہذا میری پارٹی انتخابات میں لازماً ایک اقلیت کی صورت میں برآمد ہو گی ۔"

(مارشل لاء سے مارشل لاء تک ص 174)

اپریل 1936ء کو قائداعظم اور سر فضل حسین کے درمیان ایک ملاقات ہوئی مگر اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ جب قائداعظم، سر فضل حسین کے گھر سے باہر نکلے تو انھوں نے مسکراتے ہوئے اخبار نویسوں سے کہا

"ہم دونوں دو باتوں پر متفق ہو گئے ہیں، ایک یہ کہ ہم دونوں کی رائے میں ہمارا اپنا اپنا راستہ درست ہے اور دوسرے اس بات پر کہ انتخابات کا نتیجہ نکلنے کے بعد ہم پھر ملاقات اور تبادلۂ خیالات کریں گے۔"

سر فضل حسین کا اس ملاقات کے بعد 9 اگست 1936ء کو انتقال ہو گیا اور ان کی جگہ سر سکندر حیات (1) کو یونینسٹ پارٹی کا لیڈر چن لیا گیا

بنگال

بنگال بھی مسلم اکثریت کا ایک صوبہ تھا اور یہاں ایک مقامی پارٹی "کرشک پرجا سمتی" کو مقبولیت حاصل تھی۔ اس پارٹی کو مولوی فضل الحق (2) نے 1924ء میں قائم کیا تھا۔ اس پارٹی کے اہم مقاصد میں غریب کسانوں، مزارعین اور زرعی مزدوروں کو زمینداروں کے مظالم سے نجات دلانا تھا۔ مولوی فضل الحق پہلے ایک وزیر کے طور پر کام کر چکے تھے۔ اس دوران انھوں نے مزارعین کے حقوق کے لیے بڑی کوششیں

1۔ سر سکندر حیات۔ (1892ء-1942ء) واہ میں پیدا ہوئے۔ پہلے علی گڑھ اور پھر انگلستان سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنی جاگیر پر کام کرنے لگے۔ پہلی عالمی جنگ میں فوج میں بھرتی بھی ہوئے۔ بعد ازاں سیاست میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ 1937ء کے انتخابات کے بعد پنجاب کے وزیر اعلیٰ منتخب ہوئے۔ بعد ازاں وہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔

2۔ بوات محمد فضل الحق (1873ء - 27، اپریل 1962ء) آپ نے پریذیڈنسی کالج کلکتہ سے امتیاز کے ساتھ 1893ء میں کیمسٹری، فزکس اور ریاضی میں ڈگری حاصل کی۔ بعد میں کلکتہ یونیورسٹی سے ایم۔ ایس سی ریاضی کیا۔ یونیورسٹی لا کالج کلکتہ سے لا کی ڈگری لی۔ 1903-4ء تک اسی کالج میں پڑھاتے رہے۔ 1906ء میں ڈپٹی مجسٹریٹ کے طور پر بھرتی ہو گئے۔ 1911ء میں یہ ملازمت ترک کر کے وکالت شروع کر دی۔ 1913ء میں بنگال کی قانون ساز اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ 1924ء تک وہ کسی نہ کسی حیثیت میں مسلم لیگ سے منسلک رہے۔ معاہدہ لکھنؤ کے دستخط کنندگان میں آپ بھی شامل تھے۔ 1924ء میں

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

کیں ۔ اس سلسلے میں انھوں نے کئی ایک اصلاحات کی بھی تجاویز دیں ۔ ان میں قرض خواہوں کی حالت بہتر بنانے کی تجاویز بھی شامل تھیں ۔ 1933ء میں اس پارٹی کی طرف سے بنگال میں زمینداری نظام کے خاتمے کے لیے ایک قرار داد پیش کی ۔ ان تمام کوششوں سے بنگال کے دیہاتی علاقوں میں اس پارٹی کو بڑی پزیرائی ملی جو کسی اور جماعت کو یہاں حاصل نہ تھی ۔

اگست 1936ء کو قائداعظم نے مولوی فضل الحق کو مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے الیکشن لڑنے کا کہا اور اس سلسلے میں مسلم لیگ کونسل کے ساتھ ساتھ انھیں مسلم لیگ کے پارلیمانی بورڈ میں بھی شامل کر دیا ۔ مولوی فضل الحق مسلم لیگ کو اپنے ساتھ ملا کر سیاسی اتحاد بنانے پر آمادہ نہ ہوئے ، بلکہ انھوں نے مسلم لیگ کے ایک رہنما خواجہ ناظم الدین کے خلاف الیکشن لڑا اور انھیں شکست دی ۔

شمال مغربی سرحدی صوبہ

پنجاب پر انگریزوں کے قبضہ 1849ء سے لے کر 1901ء تک شمال مغربی سرحدی صوبہ انتظامی طور پر پنجاب کا ایک حصہ سمجھا جاتا تھا ۔ 1901ء میں لارڈ کرزن نے اسے علٰحدہ صوبے کا درجہ دیا ۔ اس صوبے کے عام لوگوں اور خصوصاً وزیرستان میں انگریزی

انھوں نے کرشک پرجا سمتی کی بنیاد رکھی اور اس کے صدر بن گئے۔ 1937ء میں وہ بنگال کے وزیراعلیٰ بنے۔ بنگال کی حکومت پر ایک مسلمان سربراہ کا متمکن ہونے کا موقع، جنگ پلاسی کے بعد مولوی فضل لحق کے پاس آیا تھا۔ 1940ء میں انھوں نے مسلم لیگ کے لاہور کے جلسے میں قرارداد لاہور پیش کی۔ 1943ء میں انھوں نے بنگال کی وزرت عظمیٰ سے استعفیٰ دے دیا۔ اس حکومت میں خواجہ ناظم الدین حزب اختلاف میں تھے۔ مولوی فضل الحق نے 1946ء کو دوبارہ مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی۔ تقسیم ہندوستان کے بعد وہ پاکستان کے دوسرے حصے مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) کے شہر ڈھاکہ چلے گئے۔ وہ حکومت مشرقی پاکستان کے ایڈوکیٹ جنرل کے طور پر کام کرتے رہے۔ 1953ء میں انھوں نے نوکری چھوڑ کر اپنی کرشک سرامک پارٹی بنا لی۔ 1954ء کے انتخابات کے بعد ان کی پارٹی نے دوسری جماعتوں سے مل کر حکومت بنائی جس کو مئی 1954ء میں برطرف کر دیا گیا۔ 1955ء میں انہیں پاکستان کا وزیر داخلہ بنا دیا گیا۔ انھوں نے 1956ء کے آئین کی تیاری میں اہم کردار ادا کیا۔ 1956ء میں وہ مشرقی پاکستان کے گورنر مقرر کر دیے گئے۔

حکومت کے مخالفانہ رویوں کے باعث اسے مرکز کے ماتحت ہی رکھا گیا ۔ یہاں مسلمان اکثریت میں تھے ۔ 1936ء میں یہاں مقامی پارٹی خدائی خدمتگار (1) کو خاصی مقبولیت حاصل تھی ۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ میں مسلمانوں کی آبادی 93 فیصد تھی ۔ 1936ء میں قائداعظم نے مسلم لیگ کے لیے حمایت حاصل کرنے کے لیے سرحد صوبہ کا دورہ کیا ۔ یہاں کے کئی رہنماؤں نے حمایت کا وعدہ کیا مگر انتخابات کے وقت انھوں نے خاطر خواہ مدد نہ کی ۔

سندھ

سندھ کا صوبہ ایک مدت سے بمبئی کا حصہ تھا ۔ اس الحاق کا مقصد اس صوبے کی مسلم اکثریت کو ان کے حقوق سے محروم رکھنا اور اِس کے پردہ میں برطانوی عزائم کو حاصل کرنا تھا ۔ قائداعظم ایک مدت سے سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے ایک علحدہ صوبہ بنانے کا مطالبہ کر رہے تھے ۔ 1935ء کے آئین میں سندھ کو علحدہ صوبے کا درجہ دے دیا گیا تھا ۔

1937ء کے انتخابات کے موقع پر یہاں مسلم لیگ اور کانگرس ، دونوں جماعتوں کا کوئی اثر موجود نہ تھا ۔ یہاں مقامی سیاست کے ناطے مختلف سیاسی جماعتیں متحرک تھیں ۔ ان میں سندھ یونائیٹڈ پارٹی ، آزاد پارٹی اور مسلم سیاسی پارٹی قابل ذکر ہیں ۔

1- خدائی خدمتگار کی تحریک خان عبدالغفار خان (1890ء –1988ء) نے 1929ء میں شروع کی ۔ یہ پٹھانوں کی تحریک تھی اور شمال مغربی سرحدی صوبہ تک محدود تھی ۔ ابتداء میں اس تحریک کا مقصد پس ماندہ علاقوں میں تعلیم کو پھیلانا تھا مگر آہستہ آہستہ یہ انگریزی استعمار کے خلاف ہو گئی ۔ یہ عدم تشدد کے اصول پر کاربند تحریک تھی ۔ 1930ء میں انگریزوں نے اس تحریک کو دبانا چاہا جس کے نتیجے میں بہت سے فسادات ہوئے اور بہت سے لوگ مارے گئے ۔ اس دوران برطانوی فوج کو پشاور سے نکلنا پڑا ۔ اگست 1931ء کو اس تحریک کا رسمی طور پر کانگرس سے الحاق کر دیا گیا ۔ خدائی خدمتگار اپنے سرخ لباس کی وجہ سے سرخپوش کے نام سے مشہور ہو گئے ۔ کانگرس کو یہ دعوی کرنے کا موقع مل گیا کہ وہ ایک قومی اور سیکولر جماعت ہے ۔ حالانکہ یہ دعوی حقیقت پر مبنی نہ تھا ۔ قیام پاکستان کے بعد 1948ء میں سرخپوش تحریک پر پابندی لگا دی گئی اور اس کے رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا ۔

مقامی سیاست کے مخصوص رجحانات کے باعث یہاں کسی پارٹی نے بھی مسلم لیگ سے الحاق نہ کیا۔

انتخابات

الیکشن سے پہلے، انتخابی سرگرمیوں کے دوران پنڈت جواہر لعل نہرو،(1) صدر کانگرس نے جنوری 1937ء کو صدر مسلم لیگ قائد اعظم کو ایک خط لکھا۔ اس خط کے اہم مندرجات یہ تھے:۔

> "حتمی تجزیے میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہندوستان میں صرف دو طاقتیں — برطانوی سامراج اور ہندوستانی قوم پرستی کی نمائندہ کانگرس ہیں۔ مسلم لیگ، مسلمانوں کے ایک گروہ کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ لوگ خاصے اہم ہیں مگر ان کی سرگرمیاں علی، متوسط طبقے کے علاقوں تک محدود ہیں۔ مسلمانوں کے نچلے اور درمیانے طبقے کے لوگوں سے بہت کم اس میں شامل ہیں۔"
>
> (رام گوپال — ص 294 انڈین مسلمانز)

مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے قائداعظم نے یہ جواب دیا۔

"میں اپنے ہندو دوستوں اور کانگرس کو متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ وہ

1۔ جواہر لعل نہرو (1889ء–1964ء) الہ آباد (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ آپ موتی لعل نہرو کے بیٹے تھے۔ کیمبرج سے ایم۔ اے کیا اور 1912ء میں یہیں سے بیرسٹری کر کے ہندوستان چلے آئے۔ یہاں آکر وکالت شروع کر دی۔ 1912ء میں کانگرس کے سالانہ اجلاس میں شامل ہو کر سیاسی زندگی کا آغاز کیا۔ 1920ء میں کسان مارچ منظم کیا۔ اس کے بعد وہ کسی نہ کسی حیثیت میں کانگرس سے منسلک رہے۔ 1930ء میں سول نافرمانی کی تحریک میں گرفتار ہوئے۔ اس کے بعد حکومت کے خلاف مظاہروں میں کئی مرتبہ گرفتار ہوئے۔ یہ تحریک پاکستان کے سخت مخالف تھے اور ہر حال میں ہندوستان کی تقسیم کو رکوانا چاہتے تھے۔ تقسیم کے بعد بھارت کے پہلے وزیراعظم بنے اور اپنی موت تک اسی عہدے پر متمکن رہے۔ آپ صاحب طرز مصنف تھے۔ آپ نے انگریزی میں تاریخ اور سیاست کے موضوع پر بہت سے کتب لکھیں۔

مسلمانوں کو اکیلا چھوڑ دیں ۔ ہم نے یہ بات واضح کر دی ہے اور ہمارا مطلب بھی یہی ہے کہ ہم دیگر ترقی پسند اور آزاد کردار کے مالک گروہ اور گروہوں سے تعاون کے لیے تیار ہیں بشرطیکہ ان کا اور ہمارا منشور ایک نوعیت کا ہو ۔ ہم کسی سیاسی پارٹی کے حاشیہ بردار نہیں ہیں ۔ پنڈت جواہر لعل نہرو نے کلکتہ میں کہا ہے کہ ملک میں صرف دو پارٹیاں ہیں ، ایک حکومت ، دوسری کانگرس — دیگر لوگوں کو ان کے ساتھ ہونا چاہیے ۔ میں کانگرس میں شامل ہونے سے انکار کرتا ہوں ۔ ملک میں ایک تیسری پارٹی بھی ہے ۔ یہ مسلمان ہیں ۔ ہم پر کوئی حکم نہیں چلا سکتا ۔" (ایضاً)

انتخابات کے نتائج

انتخابات کے نتائج نے یہ بات ثابت کر دی کہ کانگرس کو مسلمانوں کی حمایت حاصل نہیں ہے ۔

مختلف صوبائی اسمبلیوں کی 1585 نشستوں میں سے کانگرس نے 714 نشستیں جیت لیں ۔ 484 مسلمان حلقوں میں سے کانگرس کے صرف 26 امیدوار کامیاب ہوئے ۔ مجموعی طور پر مختلف صوبوں میں انتخابی نتائج کی صورتحال یہ رہی :

بنگال :

کانگرس	54
غیر کانگرسی ہندو	42
آزاد مسلمان	43
مسلم لیگ	40
دیگر مسلمان	38
یورپین و اینگلو انڈین	31
غیر جماعتی (مسلمان)	2
میزان	[illegible]

غیر مسلم لیگی مسلمانوں میں سب سے زیادہ ممبران کرشک پرجا سمتی سے تھے۔ انتخابات کی مجموعی کیفیت کے مطابق کوئی جماعت بھی حکومت بنانے کی اہل نہ تھی۔ ہر جماعت کو کسی نہ کسی جماعت، جماعتوں سے مل کر ہی حکومت بنانا تھی۔ اپریل 1937ء کو یہاں جو حکومت بنی وہ مسلم لیگ، کرشک پرجا سمتی، پست اقوام اور آزاد یا اونچی ذاتوں کے غیر کانگرسی ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ اس مخلوط حکومت کے قائد مولوی فضل الحق تھے۔

حکومت کی وزارت میں پانچ وزیر مسلمان اور پانچ ہندو تھے۔ مولوی فضل الحق نے وزارتوں کی پیشکش کانگرس کو بھی کی مگر کانگرس نے اسے نامنظور کر دیا۔

پنجاب

پنجاب اسمبلی میں مختلف پارٹیوں کی پوزیشن اس طرح تھی۔

کانگرس	18
مسلم لیگ	2
دیگر مسلمان	4
غیر کانگرسی ہندو اور سکھ	36
یونینسٹ پارٹی	88
غیر جماعتی	27
کل نشستیں	175

انتخابات میں یونینسٹ پارٹی ایک اکثریتی پارٹی کے طور پر ابھری۔ 8 آزاد ممبران اور 20 خالصہ نیشنلسٹ ممبران کی حمایت سے یونینسٹ پارٹی کی حیثیت مزید مضبوط ہو گئی۔ سر سکندر حیات کی قیادت میں یہاں ایک مضبوط حکومت استوار ہوئی۔ سر سکندر حیات کی وفات (1942ء) کے بعد ملک خضر حیات نے ان کی جگہ لی۔ یہ وزارت 1945ء میں تمام صوبائی اسمبلیوں کے ٹوٹنے تک برقرار رہی۔

سندھ

اس صوبے میں مختلف جماعتوں کی کارکردگی اس طرح رہی :۔

سندھ یونائیٹڈ پارٹی (مسلم)	18
سندھ ہندو سبھا	11
آزاد مسلمان	9
کانگرس	8
سندھ مسلم پارٹی	4
سندھ آزاد پارٹی (کانگرس کی حامی)	3
آزاد ہندو	2
آزاد مزدور	1
غیر جماعتی	4
میزان	60

انتخابات کے بعد وقفے وقفے سے بہت سی پارٹیوں نے باہم الحاق کر کے کئی وزارتیں قائم کیں مگر سیاسی دھڑے بندی کے باعث یہ چل نہ سکیں ۔ ابتدا میں سندھ یونائیٹڈ پارٹی کے رہنما سر غلام حسین ہدایت اللہ نے ہندو ممبروں کی مدد سے کابینہ بنائی مگر مارچ 1938ء کو بجٹ کے موقع پر حزبِ اختلاف کے دباؤ کے تحت انھیں مستعفی ہونا پڑا ۔ اِس کے بعد وزارتوں کے بننے اور ٹوٹنے کا سلسلہ جاری رہا اور کوئی بھی مستحکم حکومت نہ بن سکی ۔

اُتر پردیش

انتخابی مہم کے آخری دنوں میں کانگرس نے مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت سمجھتے ہوئے ، اس سے انتخابی الحاق کر لیا ۔ اِس مفاہمت کی فضا میں کانگرس نے صرف نو مسلمان حلقوں میں اپنے امیدوار کھڑے کیے اور بقیہ 66 مسلمان حلقوں میں اپنا کوئی امیدوار کھڑا نہ کیا ۔ انتخاب میں مسلم لیگ کو 27 نشستیں حاصل ہوئیں

بقیہ حلقوں میں مسلم لیگ کے امیدوار ، آزاد مسلمان امیدواروں سے ہار گئے ۔ کانگرس 134- سیٹیں جیت کر اکثریتی جماعت کے طور پر سامنے آئی ۔

یو پی میں انتخابات کے بعد جب وزارت سازی کا مسئلہ آیا ، تو انتخاب سے پہلے قائم شدہ کانگرس مسلم لیگ مفاہمت کے تحت ، مسلمانوں کو وزارت سازی میں شامل کرنا قدرتی لگ رہا تھا ۔ اِس سلسلے میں دونوں جماعتوں کے مابین طویل مذاکرات کا سلسلہ شروع ہو گیا ۔ مسلمانوں کو وزارتیں دینے پر خود کانگرس میں دو آرا پیدا ہو گئیں ۔ آخر اس مفروضے پر گفتگو شروع ہو گئی کہ کابینہ میں کل 6 وزیر ہوں گے اور ان میں سے 2 وزیر مسلمانوں سے لیے جائیں گے ۔ کانگرس میں پہلے ہی سے ، کانگرس کے حلیف ایک مسلمان ممبر ، رفیع احمد قدوائی موجود تھے ۔ س طرح انھیں ایک مسلمان وزیر شمار کرنے کے بعد مسلم لیگ کو ایک وزارت کی پیش کش کر دی گئی ۔ اس وقت ، وزارت سازی کے مسئلے پر مسلم لیگ کی نمائندگی چودھری خلیق الزماں (1) کر رہے تھے ۔ انھوں نے مسلم لیگ کے لیے دو وزارتوں کا مطالبہ کیا ۔ کانگرس نے ایک وزارت دینے پر اصرار کیا اور اس کے لیے بھی مندرجہ ذیل شرائط پیش کیں :۔

1- یو پی مجلس قانون ساز میں مسلم لیگ ایک علٰحدہ گروہ کے طور پر اپنی تمام سرگرمیاں بند کر دے گی ۔

2- اسمبلی میں مسلم لیگ کے منتخب اراکین ، کانگرس میں شامل ہو جائیں گے اور ان کو کانگرس کے اصول و ضوابط پر عمل کرنا ہو گا ۔

1- چودھری خلیق الزماں (1889-1973 ء) لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ سے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد لکھنؤ میں وکالت شروع کر دی۔ 1916 ء میں کانگرس میں شامل ہو کر سیاسی زندگی کا آغاز کیا۔ ہوم رُول تحریک میں نمایاں حصہ لیا۔ 18-1917 ء کو لکھنؤ کانگرس کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے۔ تحریک عدم تعاون میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ 1937ء کے انتخابات سے کچھ عرصہ پہلے مسلم لیگ میں شامل ہوئے اور یو پی میں مسلم لیگ کے اہم رہنما بن گئے۔ پاکستان بننے کے بعد 1953 ء میں مشرقی پاکستان کے گورنر مقرر ہوئے۔ پھر انڈونیشیا اور فلپائن میں پاکستان کے سفیر رہے۔ تحریک پاکستان کے بارے میں انہوں نے ایک کتاب PATHWAY TO PAKISTAN تحریر کی۔ وہ ایوب خاں کے سرگرم حامی تھے۔

3- یوپی میں مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ توڑ دیا جائے گا اور آئندہ کسی انتخاب میں مسلم لیگ کو اپنے ٹکٹ پر امیدوار کھڑا کرنے کی اجازت نہ ہو گی ۔

4- اگر کانگرس آئندہ کبھی وزارت یا اسمبلی سے مستعفی ہونے کا فیصلہ کرے تو ان نئے ممبروں کو بھی ایسا ہی کرنا ہو گا ۔

یہ سب شرائط ، یوپی میں مسلم لیگ کے مکمل خاتمے کا پروانہ تھیں ۔ مسلم لیگ نے ان کو مسترد کر دیا ۔ بعد ازاں دونوں جماعتوں میں گفتگو کا سلسلہ جاری رہا ۔ آخر کانگرس نے یہ شرط پیش کی کہ اگر چودھری خلیق الزماں کانگرس میں شامل ہو جائیں اور کانگرس پارٹی کے منشور اور ضابطہ عمل پر دستخط کر دیں تو انھیں وزارت میں شامل کر لیا جائے گا ۔ چودھری خلیق الزماں نے اس پیش کش کو مسترد کر دیا اور زور دیا کہ انھیں مسلم لیگ کا ایک ممبر سمجھتے ہوئے ہی وزارت سازی میں شامل کیا جائے ۔ اس کو کانگرس نے نامنظور کر دیا ۔ اس کے بعد کانگرس نے مسلم لیگ سے قطع نظر ایک کانگرسی مسلمان کو وزارت میں شامل کر کے (ایک مسلمان) کو شامل کرنے کی شرط پوری کر دی ۔ بعد میں 15 اراکین (آزاد اور مسلم لیگی) کانگرس میں شامل ہو گئے اور اس طرح مسلمان وزیروں کی تعداد ایک سے 7 ہو گئی ۔

شمال مغربی سرحدی صوبہ

اس صوبے میں کانگرس کی حلیف جماعت خدائی خدمتگار (سرخپوش) سب سے بڑی جماعت کے طور پر سامنے آئی ۔ اس نے چند آزاد ممبران کو ساتھ ملا کر حکومت تشکیل دی ۔ اس صوبے میں مسلم لیگ کو کوئی نشست نہ مل سکی ۔

مجموعی صورتحال

1937ء کے صوبائی انتخابات میں مختلف جماعتوں کی مجموعی صورتحال یہ رہی ۔ کانگرس نے 836 ہندو حلقوں میں سے 715 نشستیں اور 492 مسلمان حلقوں میں سے صرف 26 نشستیں حاصل کیں ۔ مسلم لیگ کو اگرچہ مسلمان اکثریت کے صوبوں میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ، تاہم کانگرس کے بعد مسلم لیگ ہی سب سے بڑی جماعت کے طور پر

ابھری ۔ اِس کے پاس 108 نشستیں تھیں ۔ بقیہ مسلمان نشستوں پر جیتنے والوں میں آزاد مسلمان ممبروں کی تعداد زیادہ رہی ۔ مجموعی طور پر ان انتخابات سے یہ بات سامنے آگئی کہ مسلمانوں نے مختلف جماعتوں میں بٹے ہونے کے باوجود کانگرس کو اپنا نمائندہ نہ سمجھتے ہوئے ، اس کے امیدواروں کو اپنے ووٹ نہ دیے ۔

ہندو اکثریت کے صوبوں میں کانگرسی وزارتیں

جولائی 1937 ء کو کانگرس نے اترپردیش (یو پی) ، بہار ، اڑیسہ ، سی ۔ پی (مدھیہ پردیش) ، بمبئی اور مدراس میں اپنی وزارتیں قائم کر لیں ۔ یہ وزارتیں نومبر 1939 ء تک قائم رہیں ۔ اِن وزارتوں کے قیام سے ہندوؤں کو کئی صدیوں کے بعد ہندوستان کے کچھ علاقوں میں ہندو راج قائم کرنے کا موقع ملا ۔ ان تمام حکومتوں نے اپنی تمام پالیسیاں ہندوؤں کے مفادات اور ترجیحات کو ذہن میں رکھ کر تیار کیں اور ان کا نفاذ کیا ۔ ان صوبوں میں دوسری قومیتوں خاص طور پر مسلمانوں کے تحفظات کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ۔ اِن صوبوں میں کانگرس کی انتخابی کارکردگی کی صورتحال یہ رہی ۔

صوبہ	کل نشستیں	کانگرس	فیصد نشستیں	مسلمان آبادی فیصد
مدراس	215	159	74 فیصد	ایک فیصد سے کم
بہار	152	95	65 فیصد	25 فیصد سے کم
سی پی	112	70	62.5 فیصد	ایک فیصد سے کم
اتر پردیش	228	133	59 فیصد	25 فیصد سے کم
اڑیسہ	60	36	60 فیصد	ایک فیصد سے کم

ان صوبوں میں کانگرسی حکومتوں کے روّیے سے مسلمانوں کے مفادات کو نہ صرف نقصان پہنچا بلکہ ان کی سخت دلآزاری بھی کی گئی ۔ مسلم لیگ کے 25 ویں سالانہ

اجلاس منعقدہ 15 تا 18- اکتوبر 1937ء کو راجا صاحب (1) محمود آباد نے اس قسم کے تأثرات کا اظہار کیا :۔

"ہمارے ملک میں ایک نازک سیاسی صورتحال پیدا کر دی گئی ہے ۔ اکثریتی قوم نے مسلمان قوم کے وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے اور ہماری قیادت کے ساتھ تعاون کے ساتھ ساتھ قومی ترقی کے لیے کام کرنے سے انکار کر دیا ہے۔"

کانگرس نے حکومت سنبھالتے ہی اپنی قوم پرستی کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے اپنی تاریخی علامات کے احیا اور رسوم کو نافذ کرنے کا بندوبست شروع کر دیا ۔ کانگرس کے جھنڈے کو قومی جھنڈا اور بندے ماترم کو قومی ترانے کے طور پر لازمی قرار دے دیا گیا ۔ تمام اہم اجلاسوں کو اِس ترانے کو گا کر شروع کیا جاتا تھا ۔ یہ ترانہ ایک بنگالی ادیب بنکم چندر چیٹر جی کے ایک ناول آنند مٹھ (Place of Peace) سے لیا گیا تھا ۔ یہ ناول ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت کے پس منظر میں تحریر کیا گیا تھا ۔ اس میں ہندو سنیاسی مسلمانوں کے خلاف بغاوت کرتے ہیں ۔ اس کا ہیرو بھاوتند مسلمانوں کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے فوج جمع کرتا ہے ۔ اسی دوران اس کی ملاقات ایک شخص سے ہوتی ہے ۔ وہ اسے اپنی بغاوت کی اطلاع دیتا ہے ۔ وہ شخص بھاوتند کی بات کو سچ نہیں مانتا ۔ اس پر بھاوتند اسے کالی ماتا کے ایک مندر میں لے جاتا ہے ۔ یہاں وہ اُس شخص کو کالی کی عریاں مورتی دکھاتا ہے اور کہتا ہے کہ دیکھو ، مسلمانوں نے اس کا کیا حال کر رکھا ہے ؟ آخر وہ اس بات پر متفق ہو جاتے ہیں کہ ہندوستان سے مسلمانوں کو باہر نکال کر ہی دھرتی ماں کو دوبارہ جوان کیا جا سکتا ہے ۔ پھر یہ دونوں مل کر ایک فوج تیار کرتے ہیں اور ہر سپاہی سے یہ عہد لیتے ہیں کہ وہ

1۔ راجہ محمد امیر احمد خان (1914ء -1973)

مہاراجہ محمد علی، علی محمد آف محمود آباد کے بڑے صاحبزادے تھے ۔ قائداعظم کے بہت قریب تھے ۔ 1937ء میں لکھنؤ میں مسلم لیگ سیشن کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر تھے ۔ مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کے سب سے کم عمر ممبر تھے ۔ خزانچی مسلم لیگ (47-1939ء) ، آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر (1938ء -1946ء) ، ڈائریکٹر اسلامک کلچر سنٹر لندن ۔

مسلمانوں کو ہندوستان سے نکال کر ہی دم لیں گے ۔ عہد دیتے وقت ہر سپاہی جو گیت گاتا ہے ۔ وہ بندے ماترم ہے ۔"

واردھا تعلیمی سکیم

1937ء میں ہی ایم ۔ کے گاندھی نے کانگرسی وزارتوں کے صوبے میں تعلیمی اصلاحات کے لیے ڈاکٹر ذاکر حسین (1897ء - 1969ء) کی سربراہی میں ایک کمیٹی قائم کی ۔ اس کمیٹی کے دس اراکین میں سے دو مسلمان تھے ۔ اس سکیم کا بنیادی مقصد مسلمانوں کی ایک ایسی نسل تیار کرنا تھا جو اپنے سیاسی نظریات میں ہندو قوم پرستی کی قائل ہو اور ان پر ہندو اندازِ معاشرت کا غلبہ ہو ۔ اس کمیٹی کی تیار کردہ سکیم کو واردھا تعلیمی سکیم کا نام دیا گیا ۔

اِس سکیم میں مخلوط تعلیم اور ہندو رسومات کو فوقیت دی گئی ۔ طلبہ کے لیے نئی کتب تیار کروائی گئیں ، جن میں ہندو معاشرت ، ہندو مشاہیر اور تہذیبی ورثے کو اس انداز میں پیش کیا گیا کہ ان سب کے بارے میں بچوں کے دِل میں عقیدت اور احترام پیدا ہو ۔

ودیا مندر سکیم

اِس سکیم کا مقصد دیہاتی علاقوں میں سکول کھولنا شامل تھا ۔ ان سکولوں میں مادری زبان میں تعلیم دینے پر زور دیا گیا تھا ۔ اِس سکیم کے کارکنان ہندو تھے ۔

مسلم لیگ نے 2 ، 3 جولائی 1937ء کے اجلاس میں واردھا سکیم کو نامنظور کر دیا ۔ اِس سکیم پر یہ اعتراضات اٹھائے گئے :۔

> "اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کا کلچر تباہ کر دیا جائے ، کانگرس کے تصورات اور خصوصاً اہنسا (عدم تشدد) کا عقیدہ بچوں کے ذہن نشین کروایا جائے ۔ اس کا نصب العین یہ ہے کہ ایک پارٹی ، یعنی کانگرس کا عقیدہ ، پالیسی اور پروگرام بچوں کے دِلوں میں بٹھا دیا جائے ۔"

اس سکیم میں مذہبی تربیت کی سہولت کو نظر انداز کیا گیا تھا ۔ 'ہندوستانی' کے

نام سے وہ ہندی رائج کرنا مقصود تھی جو سنسکرت سے قریب تھی ۔ نصاب کے لیے وہ کتب مقرر کی گئی تھیں جو مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے اس لیے نہایت قابلِ اعتراض تھیں کہ ان میں صرف ہندو فلسفے، مذہب اور ان کے مشاہیر کی ستائش درج تھی ۔ اسلام نے دنیا کو جو دیا اس کو انھوں نے گھٹا کر پیش کیا اور مسلم ثقافت، تاریخ اور مسلمان مشاہیر کو نظرانداز کیا گیا، بلکہ ان کے لیے واجبی اور رسمی احترام تک نہ برتا گیا تھا ۔

مسلم لیگ کی طرف سے تحقیقات

مارچ 1938ء کو مسلم لیگ نے ایک آٹھ رکنی کمیٹی تشکیل دی تاکہ کانگرسی وزارتوں کے صوبوں سے موصول ہونے والی شکایات کا جائزہ لیا جا سکے ۔ اِس کمیٹی نے اپنی رپورٹ پیش کی جو 'پیر پور رپورٹ' کے نام سے مشہور ہے ۔ اس کا نام اس کمیٹی کے صدر راجا سید محمد مہدی آف پیر پور کے نام پر رکھا گیا تھا ۔ اس رپورٹ میں صوبہ سرحد کے علاوہ تمام کانگرسی صوبوں کے حالات کا تذکرہ موجود تھا ۔ رپورٹ میں جو بھی باتیں درج تھیں وہ کمیٹی کے اراکین کی ذاتی تحقیق پر مبنی تھیں ۔ پیر پور رپورٹ کے ابتدائیہ میں یہ درج تھا :۔

> "جو شخص بھی ہندوستانی معاملات سے واقف ہے وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کرے گا کہ کانگرس اپنی اس قرارداد کے باوجود جس کا اعادہ وہ اکثر کر چکی ہے اور جس میں مختلف ملتوں کے لیے مذہبی اور ثقافتی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے، اقلیتوں میں اعتماد پیدا کرنے اور انھیں اپنے ساتھ لے کر چلنے میں ناکام ہو چکی ہے، کیونکہ اس کے اعمال اور احوال میں تطابق نہیں ہے ۔ کانگرس برابر ایک ہندو تنظیم رہی ہے اور اقتدار کے نشے میں سرشار ہونے کے بعد اس نے مقننہ کی کسی اور جماعت کے ساتھ مل کر مخلوط وزارتیں بنانے سے انکار کر کے "بند دروازے کی حکمت

عمل" اختیار کر لی ہے ۔ کانگرس کا تصور قوم پرستی یہ ہے کہ ایک ایسی مملکت قائم کی جائے جس پر اکثریت والی ملّت کا اقتدار ہو ۔ مسلمانوں کا خیال یہ ہے کہ کوئی ظلم اتنا بڑا نہیں ہو سکتا جتنا کہ اکثریت کا ظلم ہوتا ہے اور وہ یقین رکھتے ہیں کہ صرف وہی مملکت مستحکم ہو سکتی ہے جو ملتوں کو خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہوں مساوی حقوق اور مساوی مواقع دے ۔"

(اشتیاق حسین قریشی ۔ جدوجہد پاکستان ص 38-137)

پیر پور رپورٹ کو کسی ذاتی تعصب کے بغیر حقیقتِ حال اور دلائل سے مرتب کیا گیا تھا ۔ اس کے پہلے حصّے میں ہندوستانی سیاست میں مختلف قومیتوں کی حیثیت اور ان کے باہمی تعلق ، دوسرے میں ان قومیتوں میں اختلافات کے اسباب اور ہندو جماعتوں کے کردار اور تیسرے حصّے میں کانگرسی راج کے صوبوں سے موصول ہونے والی شکایات کا تذکرہ تھا ۔

بہار کی مسلم لیگ نے ، یہاں کانگرس کی زیادتیوں کا جائزہ لینے کے لیے ایک کمیٹی قائم کی ۔ اس کمیٹی کے سربراہ ایس ۔ ایم شریف تھے اور انھی کے نام پر 'شریف رپورٹ' مشہور ہوئی ۔ اس رپورٹ میں ، بہار صوبے میں کانگرس اور ہندوؤں کے ایمأ پر مسلمانوں پر کی گئی ناانصافیوں کا صراحت سے تذکرہ کیا گیا تھا ۔

ان دونوں رپورٹوں کے علاوہ مولوی فضل الحق نے "کانگرسی راج میں مسلمانوں کے مصائب" کے نام سے ایک کتابچہ جاری کیا ۔ یہ کتابچہ کانگرسی وزارتوں کے استعفٰی' کے بعد شائع ہوا تھا ۔

اِس میں کانگرس کے روّیے سے متعلق کافی معلومات درج تھیں ۔ عاشق حسین بٹالوی نے اپنی کتاب "ہماری قومی جدوجہد" میں اس طرح لکھا ہے ۔

"اس میں کہا گیا تھا کہ کانگرس نے اس مقصد کے لیے میدان ہموار کر دیا تھا کہ جنگ جُو ہندو کا پُرشور تحکّم ضبط و احتیاط کی ان حدود کو توڑ کر باہر نکل جائے جو غیر جانبدار حکومتوں نے اب تک عائد کر رکھی تھیں ۔

کانگرس نے مسلم اقلیتوں پر اپنی مرضی عائد کرنا شروع کر دی ۔ یہ مرضی کیا تھی ؟ — گئو ماتا کی حفاظت ضرور ہونی چاہیے مسلمانوں کو گائے کا گوشت کھانے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے مسلمانوں کے مذہب کی تذلیل ہونی چاہیے ۔ کیونکہ — کیا یہ ملک ہندوؤں کا نہیں ہے ، اس بنا پر اذان کا امتناع ، مساجد میں نمازیوں پر حملے ، نماز کے اوقات میں مساجد کے سامنے پُرشور جلوسوں کو فتح مندانہ گزارنے پر اصرار ، تو پھر کیا یہ کوئی تعجب کی بات تھی کہ ایک المیے کے بعد دوسرا المیہ ہوتا چلا گیا ؟ اس تمہید کے بعد ایک بیان ہے ، جس میں 72 واقعت ہیں ، بہار کے 33 واقعات ہیں ، صوبہ متحدہ (یو پی) کے اور صوبہ متوسط (سی پی) کے واقعات نسبتاً زیادہ اختصار سے لکھے گئے ہیں ۔ مسلم شکایت کو اجمالاً شمار کرایا گیا ہے ۔ گائے کا گوشت مسلمانوں کے لیے ان علاقوں میں بھی ممنوع کر دیا گیا ، جہاں اسے رواج و روایت کی منظوری حاصل تھی ۔ اگر کسی مسلمان نے قربانی کے لیے بھی گائے کو ذبح کر دیا تو مسلمانوں کا خون بہایا گیا ، ان کے گھر جلا دیے گئے اور ان کی عورتوں اور بچوں پر حملے کیے گئے ، مسلمان قصابوں پر حملے کیے گئے ، مساجد میں سؤر پھینکے گئے ، اذان کی مذمت کی گئی اور اس میں مزاحمت کی گئی ۔ مسلمانوں کی دکانوں اور دیگر کاروباری اداروں کا مقاطعہ کیا گیا ۔ مسلمانوں کو دیہات کے کنویں استعمال کرنے سے روکا گیا ۔ سرکاری مداخلت ہمیشہ ہندوؤں کے حق میں متعصبانہ ہوتی تھی ۔ بہت سے موقعوں پر ایک نام نہاد 'سمجھوتے' کے ذریعے امن بحال کیا جاتا تھا جو حقیقت میں ایک ہندو نواز تصفیہ ہوتا تھا ، جسے ایک بے بس ، اقلیت پر اقتدارِ حکومت کے دباؤ سے نافذ کر دیا جاتا تھا ۔"

(عاشق حسین بٹالوی — ہماری قومی جدوجہد ص 146)

یومِ نجات

کانگرس وزارتوں نے سیاسی وجوہات کی بنیاد پر 14 اکتوبر 1939ء کو استعفیٰ دے دیا۔ قائداعظم نے اعلان کیا کہ ہندوستان کے طول و عرض میں صوبائی، ضلعی اور ابتدائی لیگیں پبلک جلسے منعقد کریں اور نماز شکرانہ ادا کی جائے۔ 22 دسمبر 1939ء کو یومِ نجات منایا گیا۔ اس موقع پر قائداعظم کے کہنے پر مندرجہ ذیل قرار داد، جلسوں میں منظور کی گئیں۔

"یہ جلسہ اس رائے کا اظہار کرتا ہے کہ کانگرسی وزارتوں نے اپنی مسلم دشمن پالیسیوں سے اپنا یہ دعویٰ باطل ثابت کر دیا کہ وہ انصاف اور معقولیت کے ساتھ تمام مفادات کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس جلسہ کی یہ پختہ رائے ہے کہ کانگرسی وزارتیں مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کے حقوق و مفادات کے تحفظ میں مکمل طور پر ناکام رہی۔ انھوں نے مجالسِ قانون ساز میں اور اس سے باہر مسلمانوں کی ثقافت کو تباہ و برباد کیا، ان کی مذہبی اور معاشرتی زندگی میں مداخلت کی اور ان کے اقتصادی و سیاسی حقوق کو پامال کیا۔"

کانگرسی وزارتوں نے ایک ایسی فضا قائم کر دی جس سے ہندو پبلک میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ ہندو راج قائم ہو گیا ہے۔ لہٰذا یہ جلسہ مختلف صوبوں میں کانگرسی حکومتوں کے خاتمے پر اپنے اطمینان کا اظہار کرتا ہے اور مسرت کے ساتھ آج کے دِن پچھلے ڈھائی سالہ ظلم و تشدد اور ناانصافی سے چھٹکارے پر 'یوم نجات' مناتا ہے۔"

تجزیہ

نہرو رپورٹ اور اس کے بعد قائداعظم کے چودہ نکات کے زمانے میں آئینی سطح پر دونوں اقوام (ہندو، مسلمان) میں جو بُعد اور تفریق پیدا ہو رہی تھی، 1937ء کے انتخابات اور بعد ازاں کانگرسی وزارتوں سے قیام سے یہ بُعد اور تفریق مستقل صورت اختیار کر گئی۔ نہرو رپورٹ کے زمانے میں تو دونوں اقوام کے نقطۂ نظر میں فرق، ان کے رہنماؤں کی آرا تک ہی محدود تھا۔ 1937ء کے انتخابات اور اس کے بعد کانگرسی

وزارتوں کے دور میں یہ بات عوامی سطح پر ایک حقیقت بن کر سامنے آئی۔

1- انتخابات سے پہلے کانگرس کے ایک اہم رہنما جواہر لعل نہرو نے دعویٰ کیا تھا کہ ہندوستان میں صرف دو قوتیں موجود ہیں، ایک کانگرس اور دوسری برطانوی حکومت۔ اس بیان میں انھوں نے یہ فرض کر لیا تھا کہ کانگرس ہندوستانی قوم پرستی کی نمائندہ تھی اور اس قوم پرستی کے زمرے میں مسلمانانِ ہند بھی شامل تھے۔ قائداعظم نے اس بیان کو رد کیا اور بعد ازاں انتخابات میں بھی یہ بات واضح ہو گئی کہ مسلمانانِ ہند، مسلمان جماعتوں کو ہی اپنا نمائندہ سمجھتے تھے۔ مجموعی نتائج کے اعداد ظاہر کرتے تھے کہ 492 مسلم نشستوں میں سے صرف 26 نشستیں کانگرس کو ملیں۔ اس سے کانگرس کی 'قوم پرستی' اور اس میں مسلمانوں کو شامل کرنے کا معاملہ مسلمان قوم کی رائے میں مختلف نکلا اور انھوں نے کانگرس اور اس کے نظریات کو رد کر دیا۔

کانگرس نے انتخابات سے پہلے مسلمان ووٹروں پر اثر انداز ہونے کے لیے ایک رابطہ مہم بھی شروع کی مگر جن چھ صوبوں میں ان کی وزارتیں بنیں، وہاں ان کا رویّہ اور پالیسیاں مکمل طور پر ہندوؤں کو ذہن میں رکھ کر تیار کی گئیں، اگرچہ یہاں مسلمان اقلیت میں تھے مگر اپنے سیکولر نعروں کے باوجود انھوں نے مسلمانوں کے سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی تحفظات کا کچھ خیال نہ کیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان صوبوں میں ایسی رسوم اور سرکاری طریقوں کو فروغ دیا گیا جن سے مسلمانوں کو ذہنی اور نفسیاتی تکلیف پہنچانے کا عنصر غالب تھا۔

مسلم لیگ نے ان صوبوں میں کانگرس کی کارروائیوں کی مسلمانوں میں سیاسی آگہی کے لیے بھرپور تشہیر کی۔ اسی سلسلے میں یوم نجات بھی منایا گیا۔ اس کا مقصد بھی کانگرس کے بارے میں، مسلمانوں میں صحیح تاثر قائم کرنا تھا کہ کانگرس حقیقی معنوں میں مسلمانوں کی ہمدرد نہیں ہے۔

2- 1937ء کے انتخابات تک مسلمان سیاسی جماعتوں کی حیثیت محدود رہی۔ پنجاب، بنگال، سندھ اور شمال مغربی سرحدی صوبوں میں مختلف طرز کی صوبائی جماعتیں

سرگرم تھیں ۔ ان کا آپس میں سیاسی رابطہ نہ ہونے کے برابر تھا ۔ مرکزی سطح پر مسلم لیگ سب سے مؤثر جماعت تھی مگر صوبوں کی سیاست میں اس کا کردار حد درجہ محدود تھا ۔

ایسی صورتحال میں ہندوستان کی سیاست میں علاقائی جماعتوں کا کردار کم ہو جاتا تھا کیونکہ یہ ایک متحدہ طاقت نہ تھیں ۔ اِس بات کو مخالف پارٹیاں استعمال کرنے کی کوشش کر رہی تھیں ۔ 1937ء کے انتخابات میں صوبائی سطح پر مختلف مسلم جماعتوں کی کارکردگی خاصی بہتر رہی مگر یہاں مسلم لیگ کو نسبتاً کم نشستیں مل سکیں ۔

یاد دہانی

* 1937ء میں ہندوستان میں صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے ۔ ان میں مسلم حلقوں میں کانگرس کو چند نشستیں ملیں ۔ اس سے کانگرس کا یہ دعویٰ کہ وہ ہندوستان کی تمام قومیتوں کی نمائندہ جماعت ہے ، ختم ہوگیا ۔
* مسلم اکثریت کے صوبوں میں مقامی جماعتوں نے سیاسی کامیابیاں حاصل کیں ۔ ان صوبوں میں مجموعی طور پر مسلم لیگ کی کارکردگی بہتر نہ تھی ۔
* انتخابات کے بعد کانگرس کو چھ صوبوں میں اکثریت حاصل ہوئی اور یہاں پر اُس نے اپنی حکومتیں بنائیں ۔
* کانگرسی وزارتوں کے صوبوں میں ، کانگرس نے ایسی حکمتِ عملی اختیار کی جس سے مسلمانوں کے مفادات اور حیثیت کو سخت نقصان پہنچا ۔
* مسلم لیگ نے کانگرس کی زیادتیوں پر رپورٹیں شائع کیں ۔ ان رپورٹوں میں کانگرسی وزارتوں کے مسلم دشمن اقدامات کا جائزہ لیا گیا تھا ۔
* کانگرسی وزارتوں کے خاتمے پر مسلم لیگ نے 'یومِ نجات' منایا ۔

غور و فکر کے لیے چند نکات

الف

1- 1937ء کے انتخابات میں مسلمان رائے دہندگان نے کانگرس کو رد کر دیا تھا۔ تجزیہ کریں؟

2- جن صوبوں میں کانگرسی وزارتیں قائم ہوئیں، وہاں مسلمانوں سے متعلق حکومت کی پالیسیوں سے کانگرس کے سیکولر نظریات کی نفی ہوتی ہے۔ تبصرہ کریں؟

3- قائداعظم محمد علی جناح، پنجاب اور بنگال میں مقامی مسلمان جماعتوں کے مسلم لیگ سے انتخابی الحاق پر کیوں زور دے رہے تھے۔ ان کوششوں کا کیا نتیجہ نکلا؟

ب) مختصر جواب دیں۔

(i) 1937ء سے قبل مسلم لیگ کے پیش کردہ منشور کا تجزیہ کریں۔

(ii) قائداعظم محمد علی جناح نے انتخاب سے پہلے دوسری مسلم سیاسی جماعتوں کو کس قسم کے اشتراک کی دعوت دی؟

(iii) 1937ء کے انتخابات کے بارے میں فضل حسین کا قائداعظم سے کیا اختلاف تھا؟

(iv) مولوی فضل الحق کی سیاسی جماعت کا 1937ء کے انتخابات میں کیا کردار رہا؟

(v) خدائی خدمتگار کون تھے نیز اس تحریک کے بانی کے بارے میں مختصر نوٹ لکھیں؟

(vi) 1937ء کے انتخابات میں مختلف جماعتوں کی کارکردگی پر مختصر نوٹ لکھیں؟

(vii) اتر پردیش میں وزارت سازی کے موقع پر کانگرس کی پالیسی کا تجزیہ کریں؟

(viii) کانگرسی وزارتوں کے صوبوں میں۔ حکومت نے کون سی پالیسیاں اختیار کیں۔ مسلمانوں کا ان پر کیا اعتراض تھا؟

(ix) مسلم لیگ نے یوم نجات کیوں منایا؟

ج۔ ہاں یا نہیں میں جواب دیں۔

(1) 1937ء کے انتخابات سے پہلے کانگرس نے مسلم لیگ کے ساتھ انتخابی الحاق کر لیا تھا۔

(2) 1937ء میں پنجاب کی سب سے مقبول سیاسی جماعت مسلم لیگ تھی۔

(3) سر فضل حسین، اپنی جماعت کی سیاسی سرگرمیوں کو پنجاب تک محدود رکھنا چاہتے تھے۔

(4) 1937ء کے انتخابات میں بنگالی مسلمان کانگرس کو ہی اپنا نمائندہ سمجھتے تھے۔

(5) انتخابات 1937ء سے پہلے جواہر لعل نہرو کا خیال تھا کہ ہندوستان میں صرف دو ہی طاقتیں ہیں: ایک کانگرس اور دوسری برطانوی سامراج۔

(6) 1937ء کے انتخابات میں پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کو اکثریت حاصل ہوئی۔

(7) واردھا سکیم کا مقصد ایسی نسل تیار کرنا تھا جو ہندو قوم پرستی کی قائل ہو۔

(8) ودیا مندر سکیم میں مسلمانوں کی ثقافت کے تحفظ کا بھی خیال رکھا گیا تھا۔

(9) 'پیر پور رپورٹ' کانگرسی وزارتوں کی کارکردگی سے متعلق تھیں۔

(10) انتخاب 1937ء کے نتائج سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ کانگرس مسلمانوں کی نمائندہ جماعت نہیں ہے۔

(د) نیچے ایک بیان کے ساتھ اس کی چند وجوہات دی گئی ہیں۔ یہ وجوہات اپنی جگہ پر درست ہیں تاہم ان میں کوئی ایک سب سے اہم اور بنیادی نوعیت کی ہے۔ ان تمام وجوہات پر کلاس میں بحث کریں اور سب سے بہتر پر ✓ کا نشان لگائیں۔

1937ء کے انتخابات کے نتائج اور کانگرسی وزارتوں سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ:

(i) کانگرس مسلمانوں کی نمائندہ جماعت نہیں۔

(ii) کانگرس مسلمانوں کو محض سیاسی حربے کے طور پر اپنے ساتھ ملانا چاہتی تھی۔

(iii) کانگرس کو مسلمانوں کے سیاسی تحفظات اور عمومی مفادات سے کوئی غرض نہ تھی۔

(iv) اپنے علیحدہ تشخص اور مفادات کے تحفظ کے لیے مسلمانوں کو آپس میں اتحاد قائم کرنا چاہیے۔

13

مسلم لیگ کی تنظیمِ نو

"میں قائل ہو گیا ہوں ۔ میرا خیال ہے کہ آپ بھی قائل ہو گئے ہیں اور جو اب تک قائل نہیں ہوئے وہ جلد قائل ہو جائیں گے اور جو دیانت کے ساتھ غلطی میں مبتلا ہیں ، وہ بھی قائل ہو جائیں گے کہ کانگرس قومی جماعت نہیں ہے ۔ البتہ وہ قائل نہیں ہو سکتے جو اپنے مقاصد میں بددیانت ہیں ۔ یہ ہمارے ملک کی بد نصیبی ہے ۔ فی الحقیقت یہ ایک المیہ ہے کہ کانگرس کی قیادتِ عالیہ اِس کا تہیہ کیے ہوئے ہے اور بالکل تہیہ ، کہ اس ملک کے تمام دوسرے فرقوں اور کلچروں کو مسل ڈالے اور ہندو راج قائم کر دے ۔ گفتگو سوراج کی کرتے ہیں اور چاہتے ہیں ہندو راج ۔ وہ گفتگو کرتے ہیں قومی حکومت کی مگر چاہتے ہیں ، ہندو حکومت ۔ لیکن یہ بلبلہ جلد ہی توڑ دیا گیا ۔ اِس طاقت کے نشے میں جو نئے آئین کے تحت ملی ہے اور سات صوبوں کی اکثریت کے ساتھ ہی کانگرس کا فریب ذرا جلد ظاہر ہو گیا ۔

میں اِس پر زیادہ گفتگو نہیں کرنا چاہتا ، جہاں تک کانگرس کا تعلق ہے میں ختم کر چکا ہوں ۔ مسلمانوں کے متعلق میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مسلم لیگ کے لیے یہ بات قابلِ تہنیت ہے کہ وہ مسلمانوں میں نمایاں قومی احساس پیدا کرنے میں کامیاب ہوئی ۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا مسلمانوں کی حالت ایک ایسے آدمی کی سی تھی جس نے اخلاقی ، ثقافتی اور سیاسی

احساس کھو دیا ہو ۔ آپ ابھی تک اس اخلاقی ، ثقافتی اور سیاسی احساس کی سرحد تک نہیں پہنچے ہیں ۔ آپ صرف اس مقام پر آئے ہیں جہاں بیداری شروع ہوتی ہے ۔ آپ کے سیاسی احساس میں ابھی صرف حرکت پیدا ہوئی ہے ۔

آپ کو ابھی اپنے قومی وجود کو ترقی دینا ہے اور قومی تشخص کو ابھارنا ہے۔ یہ بہت بڑا کام ہے۔ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ ہم ابھی سرحد پر ہیں ، لیکن مجھے اپنی قوم کی ترقی کی بڑی امیدیں ہیں ۔ جو ترقیاں اب تک ہو چکی ہیں وہ بجائے خود کرامتیں ہیں ۔ میں نے خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا کہ ہم ایسا حیرت انگیز مظاہرہ کر سکیں گے جو آج ہم دیکھ رہے ہیں، مگر پھر بھی ہم مسئلے کے آغاز ہی میں ہیں۔"

(سید حسن ریاض — پاکستان ناگزیر تھا ص 1-200)

یہ تاثرات قائداعظم محمد علی جناح نے دسمبر 1938ء کو مسلم لیگ کے منعقد ہونے والے سالانہ اجلاس میں بیان کیے ۔ اِس خطاب میں بدلتے سیاسی حالات میں مسلمانانِ ہندوستان کے لیے ایک واضح نصب العین اور اس میں مسلم لیگ کے کردار کی نشاندہی ہوتی ہے ۔ واضح رہے کہ اس سے پہلے مسلم لیگ کی سرگرمیاں مخصوص سیاسی حلقوں اور مرکزی سیاست تک محدود تھیں ۔ اس مقام سے مسلم لیگ کی تنظیمِ نو شروع ہوئی اور وہ آہستہ آہستہ مسلمانوں کی مقبول جماعت بن گئی ۔

قائداعظم ہندوستان میں کانگرس کے سیاسی رویوں اور عمومی رجحانات سے مایوس ہو کر انگلستان چلے گئے اور انھوں نے وہیں پر مستقل قیام کا فیصلہ کر لیا ۔ وہ 1928ء میں انگلستان گئے مگر کچھ عرصے کے بعد بعض مسلمان رہنماؤں کے اصرار پر وہ واپس تشریف لے آئے ۔ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے معاہدہ لکھنؤ ہونے کے بعد مسلم لیگ کو عملی طور پر خاصی اہمیت حاصل ہوگئی تھی ۔ مگر خلافت کی تحریک کے بعد ہندوستانی سیاست میں غالب رجحانات میں مسلم لیگ کوئی خاص سرگرمی نہ دکھا سکی ۔ اس زمانے میں اس کے ممبران کی تعداد بہت کم تھی ۔ 1923ء میں کورم پورا نہ ہونے

کے باعث اس کا سالانہ اجلاس بھی منعقد نہ ہو سکا تھا ۔ بعد ازاں اگرچہ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقد ہوتے رہے مگر یہ سب محض رسمی ہوتے تھے ۔ 1931ء تک مسلم لیگ کے کل ممبران کی تعداد 120 تھی ۔ اِس کے علاوہ جداگانہ انتخابات اور سائمن کمیشن کے مسئلہ پر مسلم لیگ دو حصّوں میں بٹ گئی ۔ قائداعظم نے مسلم لیگ کو عوام میں مقبول بنانے کے لیے سب سے پہلے یہ قدم اٹھایا کہ سالانہ چندہ چھ روپے سے کم کر کے ایک روپیہ کر دیا ۔ اکتوبر 1937ء کو لکھنؤ میں مسلم لیگ کے اجلاس میں صحیح معنوں میں مسلم لیگ نے اپنا نصب العین اور مجموعی پالیسی کو تبدیل کیا ۔ اس اجلاس میں پنجاب ، بنگال اور آسام کی مقامی سیاسی جماعتوں نے بھی مسلم لیگ کی حمایت کا اعلان کیا ۔ اِس اجلاس میں مسلم لیگ کے مقاصد اور اس کے سیاسی نظریات کے بارے میں قائداعظم نے فرمایا:

"۔۔۔۔ مسلم لیگ کا نصب العین بے شک مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کے حقوق اور مفادات کا مؤثر طریقے سے تحفظ ہے ۔ یہ اس کا بنیادی اور اہم اصول ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم لیگ اور اس کے حمائیتیوں سے کانگرس ناراض ہے ۔۔۔۔ مسلم لیگ اس بات کی اجازت نہیں دے گی کہ برطانوی حکومت یا کوئی سیاسی جماعت یا مقننہ میں یا مقننہ سے باہر کوئی گروہ مسلمانوں کی حق تلفی کرے ۔ کانگرس خواہ کتنے دعوے کرے ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نے مسلمانوں کے لیے کچھ بھی نہیں کیا ہے اور یہ مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں میں تحفظ اور اعتماد کا احساس پیدا نہیں کر سکے گی ۔"

(جمیل الدین احمد ۔ Speeches & Writings of Mr. Jinnah)

اِس اجلاس میں مسلم لیگ نے پندرہ قرار دادیں منظور کیں ۔ ان میں سب سے اہم اس کے نصب العین میں تبدیلی کا اعلان تھا:

"قرار پایا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا مطمح نظر یہ ہے کہ وہ ایسی آزاد جمہوری ریاستوں کے وفاق کی صورت میں کامل آزادی حاصل کرے گی جن میں

آئین کے اندر مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے حقوق اور مفاد مناسب اور مؤثر طور پر محفوظ ہوں ۔"

(ایضاً)

اس کے بعد مسلم لیگ کی عوامی سطح پر تنظیم کا کام شروع ہوا تو اختتام سال تک ہزاروں مسلمان مسلم لیگ کے ممبر بن گئے۔

قرار دادِ لاہور 1940ء

پس منظر

کسی بھی قوم کے اجتماعی نظریات کا ارتقا اس کی معاشی ، معاشرتی اور تہذیبی ضرورتوں اور حالات سے منسلک ہوتا ہے ۔ جیسے جیسے اس قوم کی ضروریات بدلتی رہتی ہیں ، اس کے سیاسی نظریات میں ترمیم اور اضافات ہوتے رہتے ہیں ۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد ایک حاکم اور فاتح قوم کی تھی ، اس ناطے ان کے مجموعی نظریات حکومتی تقاضوں کے حوالے سے ہی استوار ہوئے ۔ انگریزوں کی آمد سے مسلمان قوم (۱) دوسری اقوام کی طرح محکوم ہو گئی ۔ سیاسی حیثیت کی اس تبدیلی سے ، انھیں دوسری محکوم قوموں کے مقابل اپنی حیثیت اور تشخص کو برقرار رکھنے کا مسئلہ درپیش ہوا ۔

---

1 ۔ قوم (NATION) NATION کا ماخذ ایک لاطینی لفظ ہے ، جس کے معنی "پیدا ہونے" کے ہیں ۔ اس کو ایسے گروہ کے لیے استعمال کیا جاتا تھا ، جو ایک جگہ پر پیدا ہوا ہو ۔ ازمنہ وسطیٰ میں یورپی یونیورسٹیوں میں ایک علاقے سے آئے ہوئے طالب علموں کے گروہ کے لیے NATION کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا۔

مغربی سیاسی افکار میں ، جہاں سے یہ لفظ ایشیا ، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے سیاسی نظریات میں شامل ہوا ، کا مطلب ایسے افراد کا گروہ ہے ، جو اپنے اندر ، معاشرتی احساس اور فکر میں یکسانیت اور یگانگت کے حامل ہوں۔ یہ گروہ ، کسی ایک یا کئی ریاستوں میں ہو سکتا ہے۔ وحدت احساس کے باعث اس گروہ میں اکٹھے کام کرنے اور باہم وفاداری کے جذبات کا موجود

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

برطانوی اقتدار کے ابتدائی زمانے میں مسلمانوں کو زندگی کے اہم شعبوں میں نظرانداز کیا گیا اور ان کی علٰحدہ حیثیت کے اعتراف سے گریز کیا گیا ۔ یہ سلسلہ اٹھارھویں صدی عیسوی سے لے کر بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں تک جاری رہا ۔

مسلمانوں کی علٰحدہ سیاسی اور معاشرتی حیثیت کو تسلیم کروانے کے سلسلے میں سب سے اہم اور قابل قدر خدمات سرسید احمد خان نے انجام دیں ۔ ان کی کوششوں سے ایک طرف مسلمانوں میں اپنی علٰحدہ معاشرتی اور سیاسی حیثیت کے بارے میں شعور اجاگر ہوا تو دوسری اقوام میں بھی مسلمانوں کے علٰحدہ وجود کے اعتراف کا احساس ابھرنے لگا ۔ انگریزوں نے 1909ء میں مسلمانوں کو ان کی جداگانہ سیاسی حیثیت آئینی سطح پر دے دی ۔ مگر عملی طور پر انگریزوں کا رویّہ اور ہندوؤں کی سیاسی حکمت عملی بدستور حسبِ سابق رہی ۔

تقسیم بنگال سے مسلمانانِ مشرقی بنگال کو اقتصادی اور سیاسی تحفظات مل سکتے تھے ، مگر بنگال کے اجارہ دار ساہوکاروں اور ان کے حلیف گروہوں کو اپنی اقتصادی سلطنت کی یہ تقسیم پسند نہ آئی ۔ اس پر انھوں نے شدید ردِّ عمل ظاہر کیا اور آخر انگریزوں کو اس پر بنگال کی تقسیم کی تنسیخ کرنا پڑی ۔

تقسیم بنگال کے تلخ تجربے کے باوجود مسلمان رہنماؤں میں لبرل نظریات کے حامیوں نے انگریزوں کے نوآبادیاتی استعمار کے خلاف ہندوؤں کے ساتھ مل کر ایک اتحاد بنانے کی کوشش کی ۔ یہ اتحاد 1916ء کے معاہدۂ لکھنؤ کی صورت میں سامنے آیا ۔ یہ معاہدہ اپنے نظریات اور عمل کے اعتبار سے غیر مبہم اور راست تھا ۔ مگر اس کے بعد بیسویں صدی کے دوسرے عشرے تک ہندوستانی سیاست میں ابہام اور غیر واضح نظریات پر مبنی ماحول رہا ۔ اس سے لکھنؤ معاہدے سے پیدا شدہ ماحول ختم ہوگیا اور

ہونا ایک اہم خصوصیت سمجھی جاتی ہے ۔ ایک گروہ یا قوم کے اندر ایسے نظریات اور احساس کے پیدا ہونے میں اس گروہ یا قوم کا تاریخی ورثہ اور روایات خاص طور پر اہم ہوتی ہیں ۔ نجی جذبات ، احساسات اور نظریات کی بنیاد پر نوآبادیاتی دور میں ، تیسری دنیا کے کئی ممالک میں قوم پرستی کی تحریکات پیدا ہوئیں اور انھوں نے آزادی حاصل کی ۔

ایسی صورتحال نے جنم لیا جس سے انگریزی استعمار کو فائدہ پہنچا۔ تاہم اس عرصے میں ہندوستان میں جو تحریک رہی، اس میں مقامی لوگوں کی انگریزوں کے نظام سے شدید نفرت کا ضرور اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ اسی نفرت کا اظہار متشدد کارروائیوں کی صورت میں ظاہر ہوا۔

تحریک خلافت کے بعد انگریزوں نے ہندوستانی سیاست کو عام لوگوں سے نکال کر اسے صرف سیاسی رہنماؤں تک مقید کرنے کی کوشش کی۔ اِس کوشش کا مقصد عوام کو عملی سیاست سے دُور رکھ کر ان کی مزاحمتی قوت کو دبانا تھا۔ اِس کا مقصد ہندوستان میں درجہ وار سیاسی اصلاحات نافذ کرنا تھا۔ اس میں بنیادی شرط یہ بھی تھی کہ جیسے جیسے ہندوستانی لوگ سیاسی طور پر باشعور ہوتے جائیں گے، انھیں سیاست و حکومت میں مناسب حصہ دیا جاتا رہے گا۔ اس میں اصل مقصد برطانوی حکومت کو ہندوستان میں زیادہ سے زیادہ عرصے کے لیے برقرار رکھنا تھا۔ دوسری جانب انگریزوں کو مقامی قومیتوں کے سیاسی عزائم کا بھی بخوبی اندازہ تھا کہ اب ان میں اتفاق رائے کی صورتحال ممکن نہیں رہی۔

ہندوستان میں آئینی اصلاحات کی ابتدا سے دونوں اقوام میں اپنے لیے بہتر تحفظات اور سیاسی مستقبل کے لیے جدوجہد شروع ہوگئی۔ دونوں کے نظریات میں بنیادی اختلافات موجود تھے بلکہ ہندو تو مسلمانوں کو ایک علٰحدہ قوم کے طور پر تسلیم کرنے سے گریزاں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان میں صرف ایک ہی قوم بستی تھی اور ان کی واحد نمائندہ جماعت کانگرس تھی۔ بعض ہندو اور دوسرے گروہ ہندوستان میں قوم پرستی کے عناصر ترکیبی میں صرف معاشی اور سیاسی بنیادوں کو ترجیح دے کر، ہندوستان میں بسنے والے تمام لوگوں کو ایک قوم قرار دے رہے تھے۔

اس قسم کے نظریاتی مباحث پر 1937ء کے انتخابات میں ایک عوامی محاکمہ سامنے آیا۔ اور وہ یہ تھا کہ مسلمانوں نے کانگرس کو بہت کم ووٹ دیے۔ کانگرس اپنے دعووں کے برعکس صرف چند مسلمان حلقوں میں کامیاب ہوئی۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ کانگرس مسلمانوں کی نمائندہ جماعت نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ ہی ہندو اکثریت

کے صوبوں میں کانگرسی وزارتوں کی پالیسیوں سے یہ بات بھی سامنے آئی کہ کانگرس صرف اور صرف ہندوؤں کی معاشی اور معاشرتی ضروریات کو ترجیح دیتی ہے ۔ اس کے نزدیک دوسری اقلیتوں کا تحفظ کچھ معنی نہیں رکھتا ۔

1937ء کے اواخر میں مسلمانوں میں ایک نئی لہر اُٹھی اور وہ یہ تھی کہ مسلمان ایک علٰحدہ قوم ہیں ، وہ کسی بھی دوسری قوم سے اس وقت تک بات چیت نہیں کر سکتے جب تک ان کی اس حیثیت کو تسلیم نہ کر لیا جائے ۔ اس کی بنیاد پر مسلمانوں میں اپنے الگ تشخص کا احساس نہایت فعال صورت میں ظہور پذیر ہوا اور 1940ء میں انھوں نے قرار دادِ لاہور میں مسلمانوں کو سیاسی و جغرافیائی آزادی دلانے کا اعلان کر دیا ۔ اِس قرار داد سے پہلے کئی ایک منصوبے پیش کیے گئے اور ان کا مقصد ہندوستان کے مخصوص سیاسی بحران کا حل تلاش کرنا تھا ۔

سیاسی بحران کے حل کیلیے تجاویز

برطانوی راج سے پیدا شدہ مخصوص سیاسی صورت حال کے سیاسی حل کے لیے کئی مشاہیر نے علٰحدہ علٰحدہ ریاستوں کے قیام کی تجاویز پیش کی تھیں ۔ ان میں سے چند ایک کا تذکرہ یہاں کیا جاتا ہے۔

1- 1928ء کی نہرو رپورٹ میں ہندو رہنماؤں نے مسلمانوں کی علٰحدہ حیثیت کے بارے میں یہ لکھا تھا :۔

> "ہندوستان میں مسلمان اپنی اقلیتی حیثیت کے باعث بحیثیتِ مجموعی یہ خوف رکھتے ہیں کہ اکثریتی گروہ ان کو پریشان کر سکتا ہے ، اور اس مشکل کو حل کرنے کے لیے ان کے پاس ایک جدّت آمیز تجویز یہ ہے کہ وہ کم از کم ہندوستان کے کسی ایک حصے میں غالب حیثیت حاصل کر لیں ۔"

2- اِس میں مسلمانوں کی علٰحدہ ریاست کے قیام کے بارے میں ایک خفیف سا اشارہ

ملتا ہے ۔ اسی تصور کو علامہ سر محمد اقبال نے ایک واضح شکل میں 1930 ء کے الہٰ آباد کے خطبے میں پیش کیا :۔

"میری خواہش ہے کہ پنجاب ، صوبہ سرحد ، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک ریاست بنا دیا جائے ، سلطنتِ برطانیہ میں رکھ کر یا اس سے باہر رکھ کر خودمختار طرزِ حکومت رائج کیا جائے ۔ شمال مغربی مسلم ریاست کا مقام مسلمانوں یا کم از کم شمال مغربی علاقوں کے مسلمانوں کا نوشتۂ تقدیر ہے ۔"

، اس خطبے میں ، علامہ اقبال نے تاریخی ، سیاسی اور معاشرتی حوالوں سے یہ ثابت کیا کہ مسلمان علٰحدہ مزاج اور طرزِ معاشرت کے حامل ہیں ۔ ان کی بقا اور بہتر مستقبل اسی میں ہے کہ وہ اپنی ایک الگ ریاست میں اپنی ضروریات کے مطابق ایک نظامِ حکومت بنائیں۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ مسلمانوں کی علٰحدہ حیثیت کی بنیاد کسی دوسری قوم سے نفرت پر نہیں ہے۔

3- 1933 ء میں چودھری رحمت علی نے ایک تجویز پیش کی ۔ اس میں انھوں نے مسلمانوں کی علٰحدہ ریاست کا نام (پاکستان) تجویز کیا ۔ اس میں پنجاب ، سرحد ، کشمیر ، سندھ اور بلوچستان کے علاوہ بنگال ، آسام کے کچھ علاقوں ، اور ریاست حیدرآباد ملا کر ایک علٰحدہ ریاست کو قائم کرنا تھا ۔

4- 1935 ء کے آئین کے وفاقی قوانین اور بندوبست پر کانگرس اور مسلم لیگ دونوں کو بجاطور پر یہ اعتراض تھا کہ اس پر عمل نہ ہونے سے سیاست کا مجموعی رجحان علاقائی ضروریات اور سیاسی تحفظات کی طرف چلاگیا ۔ ایسی صورتحال میں مسلم اکثریت اور ہندو اکثریت کے علاقوں کی سیاست کا سلسلہ شروع ہوگیا جو ایک صورت میں دو علٰحدہ قوموں اور منطقوں کی نشاندہی کرتا تھا ۔

5- 1938 ء کو سندھ مسلم لیگ کانفرنس نے ایک واضح قرار داد پیش کی :

"یہ کانفرنس ہندوستانی قطعۂ اراضی میں پائدار امن کے مفاد میں ، بغیر کسی رکاوٹ کے ثقافتی ارتقا کے مفاد میں ، اقتصادی اور سماجی بہتری

اور دونوں اقوام جو ہندو اور مسلمان کہلاتی ہیں کی سیاسی خود اختیاری کے ضمن میں آل انڈیا مسلم لیگ کو یہ سفارش کرتی ہے کہ وہ ہندوستان کے لیے مناسب آئین کے بارے میں تمام سوالات پر نظر ثانی کرے اور ترمیم کرے تاکہ ان کو (دونوں قومیتوں) کو باعزت اور قانونی مرتبہ ان کے حق کے مطابق مل سکے ، اور اس ضمن میں یہ کانفرنس سفارش کرتی ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ ایسی آئینی سکیم وضع کرے جس کے تحت مسلمانوں کو مکمل آزادی مل سکے ۔"

(جی ۔ الانا ۔ Pakistan Movement: P-196 Historic Documents.)

6- 1939 ء کو حیدر آباد دکن کے ڈاکٹر سید عبداللطیف نے ثقافتی بنیادوں پر مسلمانوں کے چار اور ہندوؤں کے 11 ثقافتی خطوں کا اعلان کیا ۔ مسلمانوں کے ثقافتی خطے یہ تھے ۔

(i) شمال مغربی خطہ ، جس میں سندھ ، بلوچستان ، پنجاب ، شمال مغربی سرحدی صوبہ ، اور ریاستہائے فیروز پور و بہاولپور شامل تھے ۔ اس میں 25 ملین مسلمان بستے تھے ۔

(ii) شمال مشرقی خطہ جس میں مشرقی بنگال ، آسام کے علاقے شامل تھے اور یہاں 30 ملین مسلمان بستے تھے ۔

(iii) دہلی ، لکھنؤ بلاک جو پٹیالے کی مشرقی سرحدات سے لکھنؤ تک پھیلا ہوا تھا ۔ یہ خطہ ملحقہ علاقوں بہار اور یو پی سے مسلمانوں کو یہاں اکٹھا کرنے کے لیے تجویز کیا گیا تھا ۔

(iv) دکن بلاک میں ریاست حیدر آباد کو ایک پٹی کے ذریعے سمندر سے ملانے کی تجویز دی گئی تھی ۔ یہاں 12 ملین مسلمان بستے تھے ۔

اس سکیم میں ایک کمزور مرکز کی تشکیل کی تجویز دی گئی تھی ، جس کے پاس دفاع ، امورِ خارجہ ، تجارت ور رسل و رسائل وغیرہ کے امور ہوں ۔ اس سکیم میں ہندوستان کی وحدت کی حمایت کی گئی تھی ۔ اِس تجویز کو ہندو اور مسلمان دونوں نے نامنظور کر دیا تھا ۔ اِس قسم کی کمزور مرکز کی تجویز سر سکندر حیات نے بھی دی مگر اسے بھی نامنظور کر دیا گیا ۔

قرار دادِ لاہور

سید حسن ریاض ، نے اپنی کتاب 'پاکستان ناگزیر تھا' میں اپنی ، قائداعظم سے ملاقات کا تذکرہ اس طرح کیا ہے ۔

میں نے قائداعظم سے کہا "مسلم لیگ اب کس مقصد کے لیے جدوجہد کر رہی ہے ، کیا مسلمانوں کے لیے کچھ اور تحفظات لینے ہیں ۔" انھوں نے تعجب سے میری طرف دیکھا اور بولے

"آپ کا کیا مطلب ہے ، میں نہیں سمجھا ؟"

میں نے کہا " گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 ء میں ہم نے تحفظات حاصل کیے اور تحفظات ہم کو اس سے پہلے بھی ملے مگر مسلمانوں کے حقوق و مفاد کی حفاظت ان تحفظات کے ذریعے سے نہ پہلے ہوئی تھی اور نہ اب ہو رہی ہے ۔ لہذا میرا خیال ہے کہ اگر ہم صرف آئینی تحفظات کے لیے کوششیں کرتے ہیں تو یہ بے فائدہ ہو گا ۔"

قائداعظم نے کہا ،

"پھر آپ کیا چاہتے ہیں ؟"

میں نے کہا "اپنے حقوق و مفاد کی حفاظت کی طاقت !"

"تحفظات طاقت ہیں" ! قائداعظم نے زور دے کر کہا ۔

اِس پر میں بولا "مگر اِس طاقت کے استعمال اور نفاذ کا اختیار گورنروں کو اور وائسرائے کو ہے ، اور انھوں نے یہ اختیار استعمال نہیں کیا ۔"

قائداعظم نے بڑی دلچسپی سے پوچھا ۔ "پھر آپ کے نزدیک چارۂ کار کیا ہے ؟"

"اِس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مسلم اکثریت کے علاقے کلی طور پر آزاد اور خود مختار ہوں" میں نے برجستہ جواب دیا ۔

قائداعظم نے فکر آگیں لہجے میں فرمایا "اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کی حفاظت کیوں کر ہو گی ؟"

میں نے کہا "ہندو اکثریت اور مسلم اکثریت کے علاقوں کی خود مختار دولتوں کے درمیان دوستانہ معاہدات سے یا توازن قوت سے ۔۔۔۔ "

"آپ نے سندھ مسلم لیگ کا رزولیوشن پڑھا ؟"

"جی ہاں ، پڑھا" ۔ اور میں نے یہ مزید کہا "مگر سندھ مسلم کانفرنس مسلمانوں کے لیے مطمح نظر معین نہیں کر سکتی اور اس کا اعلان بھی نہیں کر سکتی ۔ یہ آل انڈیا مسلم لیگ کا کام ہے ۔ اس کو چاہیے کہ نئے حالات کے لحاظ سے کوئی مطمح نظر معین کرے اور آپ مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے قوم کی رہنمائی کے لیے کوئی ایسی بات کہہ سکتے ہیں ۔"

"میں سندھ مسلم کانفرنس میں شریک تھا" قائداعظم مسکرا کر بولے ۔

"(جی) ، آپ تھے"۔ کسی مقدمے کے سلسلے میں آپ کا جانا ہوا ۔ اتفاق سے اسی زمانے میں کانفرنس تھی ۔ آپ بھی اس میں شریک ہو گئے ۔ پھر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ رزولیوشن محض اس لیے پاس کیا گیا ہو کہ دیکھیں ہندوؤں پر اس کا کیا اثر ہوتا ہے ۔"

میری زبان سے یہ نکلا اور قائداعظم ترچھے ہو گئے اور تیور بدل کر بولے "ہم دکھاوے کے لیے رزولیوشن پاس نہیں کرتے" اب میں نے عرض کیا "تو پھر آپ فرمائیں کہ وہ رزولیوشن آپ کے ایماء سے پیش اور منظور ہوا ۔"

قائداعظم نے ٹالنے کے لیے کہا "اچھا آپ نے میرٹھ میں نواب زادہ لیاقت علی خان کا خطبۂ صدارت سنا تھا ؟"

جی ہاں سُنا تھا ، میں نے اقرار کیا اور پھر کہا "مگر سندھ کی کانفرنس ایک صوبے کی کانفرنس تھی ور میرٹھ کی کانفرنس ایک ڈویژن کی ۔ پورے ہندوستان کے مسئلے میں ان کی رزولیوشن اور تقریر سند نہیں ہو سکتی ۔ آپ مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے مجھے بتائیے کہ آپ کی کیا رائے ہے ۔ وہ میرے آگے بڑھنے کے لیے کافی ہو گی ۔ قائداعظم بیٹھ گئے

اور دیر تک جوش سے بولتے رہے۔ "دس برس ہونے میں طے کر چکا
ہوں کہ یہی کرنا ہے۔"

اسی پس منظر میں مارچ 1940ء کو مسلم لیگ کا ستائیسواں سالانہ اجلاس لاہور میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں قائداعظم نے ہندوستان میں بسنے والی قومیتوں کے آپس کے سیاسی مسائل کا حل ہندوستان کی تقسیم کو قرار دیا۔ انھوں نے فرمایا:۔

"یہ مسئلہ جو ہندوستان میں ہے، فرقوں اور فرقوں کے درمیان نہیں، بلکہ بین الاقوامی ہے اور اس کو بین الاقوامی ہی مان کر، حل کرنا چاہیے۔ جب تک یہ بنیادی حقیقت سمجھ میں نہ آجائے، اس وقت تک جو کوئی دستور وضع کیا جائے وہ تباہی پر منتج ہو گا اور صرف مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ ہندوؤں اور برطانویوں کے لیے بھی مضر اور تباہ کن ثابت ہو گا۔ اگر حکومتِ برطانیہ اس برصغیر کے باشندوں کے لیے یہ چاہتی ہے کہ ان کو امن اور خوشی حاصل ہو اور اس کی یہ خواہش واقعی مخلصانہ ہے تو اس کی صرف یہ صورت ہے کہ ہندوستان کو تقسیم کر کے بڑی اقوام کے لیے جداگانہ قومی وطن منظور کیے جائیں، جن میں وہ خود اختیاری کے ساتھ قومی ریاستیں قائم کریں۔"

اسی تقریر میں قائداعظم نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے نظریات میں فرق کی وضاحت کی اور ان دونوں کو علٰحدہ علٰحدہ قوم کے طور پر پیش کیا۔ یہی افکار بعد میں تحریک پاکستان کے دو قومی نظریہ کی بنیاد بنے۔ آپ نے فرمایا:۔

"یہ سمجھنا بہت ہی مشکل ہے کہ اسلام اور ہندومت کی حقیقی فطرت ہمارے ہندو دوستوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔ وہ (اسلام اور ہندو مت) مذہب کے عام مفہوم میں مذہب نہیں ہیں بلکہ دو جداگانہ اور مختلف اجتماعی نظام بھی ہیں، اور یہ محض خواب ہے کہ ہندو اور مسلمان کبھی یک مشترکہ قوم بن سکیں گے۔ اور یہ ایک ہندوستانی (مشترکہ) قوم کا مغالطہ حدود سے بہت آگے گزر چکا ہے۔ یہ ہماری بہت سی

مصیبتوں کا باعث ہے .... اگر ہم نے جلد اپنے عقائد و خیالات پر نظر ثانی نہ کی تو ہندوستان تباہ ہو جائے گا ہندوؤں اور مسلمانوں کا تعلق دو مختلف فلسفوں ، معاشرتی رواجوں اور ادبیت سے ہے ۔ نہ ان کے درمیان باہم شادیاں ہوتی ہیں ، نہ یہ ایک ساتھ بیٹھ کر کھاتے ہیں ؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں دو ایسی تہذیبوں کے پیرو ہیں ، جن کی بنیاد متصادم خیالات اور تصورات پر ہے ۔"

قائداعظم نے ہندوستان میں برطانوی حکومت کی آئینی اصلاحات پر بھی تنقید کی اور جمہوری نظامِ سیاست کو ہندوستان میں ناقابل عمل قرار دیا ۔ انھوں نے اس نظام کے مسلمانوں پر اثرات کا اس طرح جائزہ لیا :۔

"مسلم ہندوستان کو ایسا آئین قبول نہیں جو لازماً ہندو اکثریت پر منتج ہو ۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو اگر کسی ایسے جمہوری نظام کے تحت یک جا کیا جائے گا جو اقلیتوں پر مسلط کیا گیا ہو ، تو اس کے معنی صرف ہندو راج ہوں گے ۔ جس قسم کی جمہوریت کانگرس کی اعلیٰ قیادت چاہتی ہے ، اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اسلام میں جو سب سے زیادہ قیمتی ہے ، وہ تباہ ہو جائے گا ۔"

مسلم لیگ کے کھلے اجلاس میں 23- مارچ 1940 ء کو مولوی فضل الحق نے ایک قرار داد پیش کی ۔ اس قرارداد کے متن کے کچھ حصے اس طرح تھے :۔

"آل انڈیا مسلم لیگ کے اس اجلاس کی یہ سوچی سمجھی رائے ہے کہ اس ملک میں وہی آئین قابلِ عمل اور مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول ہو سکتا ہے جو ذیل کے بنیادی اصولوں کے مطابق تیار کیا جائے یعنی یہ کہ جغرافیائی لحاظ سے باہم متصل یونٹوں کی خطوں کی صورت میں حد بندی کی جائے اور یہ خطے ضرورت کے مطابق علاقائی ردوبدل کر کے اس طرح قائم کیے جائیں کہ ان علاقوں کو جہاں مسلمانوں کی عددی اکثریت ہے ، جیسا کہ ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی حصوں میں ہے ، آزاد مملکتوں کی

صورت میں اکٹھا کر دیا جائے۔ جن کے اندر شامل ہونے والے یونٹ
خودمختار اور مکمل حاکمیت کے حامل ہوں ۔"

"یہ کہ ان یونٹوں اور علاقوں کے آئین میں اقلیتوں کے مذہبی، ثقافتی،
اقتصادی، سیاسی، نظم و نسق کے متعلق اور دوسرے حقوق کی خاطر ان
سے مشورے کر کے کافی اور مؤثر آئینی تحفظات رکھے جائیں۔ اس طرح
سے تحفظات کے ذریعے ہندوستان کے ان حصوں میں جہاں مسلمان
قلیت میں ہیں، ان کی حفاظت کا بندوبست کیا جائے ۔"

"مزید برآں یہ اجلاس، مجلس عاملہ کو ہدایت دیتا ہے کہ وہ ان بنیادی
اصولوں کے مطابق یک آئینی سکیم مرتب کرے، جس میں اس بات کا
انتظام کیا جائے کہ دونوں خطے بالآخر اختیارات مثلاً دفاع، امورخارجہ،
مواصلات، کسٹم اور دوسرے ایسے معاملات جو ضروری ہوں، سنبھال
لیں ۔"

اس قرارداد میں ہندوستان میں مسلم اکثریت کے علاقوں کے لیے علٰحدہ (ریاستوں) STATES کا لفظ استعمال کیا گیا ہے ۔ 1941ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے جلاس منعقدہ مدراس میں ریاستوں کی بجائے (STATE) کا لفظ استعمال کیا :۔

"آل انڈیا مسلم لیگ کا نظریہ یہ ہے کہ مسلمانانِ ہندوستان ایک واحد
قومیت ہیں ۔ اس نظریے کو بدلنے کی ہر کوشش ناکام بنا دی جائے
گی ۔ ہر شخص کو یہ بات غور سے سن لینی چاہیے کہ ہم ایک آزاد اور خود
مختار ریاست کے قیام کی کوشش کر رہے ہیں، اور برصغیر میں یہ
ریاست قائم ہو کر رہے گی ۔"

بعد میں اپریل 1946ء کو بھی مسلم لیگ کے ممبران قانون ساز اسمبلی کے کنونشن میں قراردادِ لاہور میں لفظ "ریاستوں" کی بجائے ایک ریاست کے قیام کا ذکر کیا گیا تھا ۔

قراردادِ لاہور میں، پاکستان کا لفظ موجود نہ تھا ۔ تاہم اگلے دن ہندو اخبارات نے قراردادِ لاہور کو 'قراردادِ پاکستان' کی شہ سرخیوں کے ساتھ شائع کیا ۔ اس قرارداد پر

مختلف کانگرسی رہنماؤں نے شدید ردِ عمل ظاہر کیا ۔ چند روز بعد ایم ۔ کے گاندھی سے پوچھا گیا کہ مسلم لیگ نے تقسیم ہند کا مطالبہ کیا ہے ، اس کے بارے میں آپ سول نافرمانی کی تحریک چلائیں گے ؟ انھوں نے جواب دیا "میں تسلیم کرتا ہوں کہ لاہور میں لیگ نے جو قدم اٹھایا ہے ، اس سے چکرا دینے والی صورتحال پیدا ہو گئی ہے ، تاہم میں اسے اتنی چکرا دینے والی نہیں سمجھتا کہ سول نافرمانی کو ناممکن بنا دے ۔ مسلمانوں کو ویسا ہی حق خود ارادیت ملنا چاہیے جیسا کہ باقی ہندوستان کو حاصل ہے ۔ ہم اس وقت مشترکہ خاندان کی طرح ہیں ، خاندان کا کوئی بھی فرد تقسیم کا مطالبہ کر سکتا ہے۔" جواہر لعل نہرو نے قرارداد لاہور کو عجیب و غریب قرار دیا۔ پنجاب کے گورنر نے اس قرارداد کے بارے میں وائسرائے کو بھیجی ہوئی رپورٹ میں کہا "یہ کانگرس کے دعوی کا انتہائی ترکی بہ ترکی جواب ہے ، جس نے کانگرس کے اس دعویٰ کو تارپیڈو کر دیا ہے کہ وہ تنہا پورے ملک کی طرف سے بولنے کی مستحق ہے۔"

تجزیہ

کسی بھی تحریک کی کامیابی کے لیے مندرجہ ذیل چیزیں سب سے اہم ہوتی ہیں ۔

1- تحریک کے نظریات ، اس کے لوگوں کے معاشرتی اور اقتصادی مفادات سے متعلق ہوں بلکہ ان کی جڑیں لوگوں کے شعور میں پیوست ہوں ۔

2- تحریک کا کوئی نصب العین ہو ۔

3- تحریک کے رہنما ایسے ہوں جو مکمل طور پر اپنے لوگوں کے شعور اور ضروریات کو سمجھتے ہوں اور لوگوں کا بھی ان پر مکمل اعتماد ہو ۔

1940ء کی قرار داد لاہور تک مسلمانانِ ہند کے تشخص اور علیٰحدہ قوم پرستی کی تحریک کو یہ تینوں عناصر میسر ہو چکے تھے ۔ مسلمانانِ ہند جس حال میں ، ہندوستان میں رہ رہے تھے ، اس میں ہندو اکثریت ان کو ہر لحاظ سے دبانے کی کوشش کر رہی تھی اور ان کو زندگی کے ہر میدان میں آنے سے روک رہی تھی۔ اِس صورتحال میں مسلمانوں کی اقتصادی اور سیاسی ضروریات نظرانداز ہو رہی تھیں اور ان کی معاشرتی حیثیت

کو بھی غیر محفوظ بنایا جا رہا تھا ۔ اس تمام صورتحال کے مسلسل رہنے سے ، آہستہ آہستہ دو قومی نظریے کی نمو ہوئی اور مسلمانوں نے اپنے آپ کو بحیثیت قوم اپنی سلامتی ، اپنی مرضی اور رضا سے زندگی گزارنے کے لیے ایک علٰحدہ ریاست کے قیام کا مطالبہ کر دیا ۔ اِس لحاظ سے دو قومی نظریہ مکمل طور پر مسلمانانِ ہند کی زندگیوں اور ان کے مجموعی احساسِ زندگی میں پیوست تھا ۔

1937 ء کے انتخابات سے پہلے ، علاقائی سطح پر مختلف جماعتیں مسلمانوں کے مفادات کے لیے کوشاں تھیں اور مسلمانوں کے سیاسی شعور کے ارتقأ میں یہ ایک اہم درجے اور مقام کی حیثیت رکھتی تھیں ۔ مرکزی سطح پر اگرچہ مسلم لیگ کسی طور مسلمانوں کے مفادات کے لیے لڑ رہی تھی مگر مسلمانوں میں عوامی اعانت اس کو حاصل نہ تھی ۔ جب تمام علاقائی اور مرکزی رہنماؤں نے مسلمانوں کے لیے علٰحدہ ریاست کے قیام کو اہم نصب العین سمجھ لیا تو پھر انھوں نے اس کو حاصل کرنے کی غرض سے تمام مسلمانوں کو ایک وحدت میں پرونے کے لیے باہم اتفاق اور اتحاد کو ضروری سمجھا ۔ ایسی صورت میں انھوں نے مسلم لیگ کے ساتھ مکمل اتفاق کیا اور قائداعظم کی قیادت اور ان کی صلاحیتوں کو کسی بھی شک سے بلند سمجھا ۔ یہی وہ دَور ہے جب قائداعظم عام مسلمانوں کے رہنما کے طور پر ابھرنا شروع ہوئے ۔ عام لوگ ان کی انگریزی کی تقاریر بھی انہماک سے سنتے ۔ ایک دفعہ کسی صحافی نے ایک سامع سے پوچھا کہ آپ قائداعظم کی انگریزی میں تقریر سمجھ رہے ہیں تو اس نے نفی میں جواب دیا ۔ صحافی نے پوچھا تو پھر آپ اتنے انہماک سے کیوں سُن رہے ہیں ؟ سامع نے جواب دیا کہ مجھے تقریر کا ایک لفظ سمجھ نہیں آرہا مگر میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ شخص جو کچھ کہہ رہا ہے ، وہ خلوص سے کہہ رہا ہے اور اس میں ہماری بھلائی ہے ...'' یہ واقعہ قائداعظم کی مسلمانوں میں محبت اور اعتماد کی بہترین مثال ہے ۔ یہی تعلق ، عام لوگوں اور رہنما کے درمیان ایک ایسا جذبہ قائم کر دیتا ہے ، جس کے ہوتے ہوئے لوگ کوئی بھی مشکل برداشت کر لیتے ہیں اور اپنے مقصد سے ہرگز نہیں ہٹتے ۔

یاد دہانی

* 1937ء کے انتخابات کے بعد مسلم لیگ کی قائداعظم کی قیادت میں تنظیمِ نو کی گئی اور اس نے اپنے عزائم اور ترجیحات کو بدل دیا۔
* 1940ء تک مختلف مسلمان رہنما، اس بات پر قائل ہو چکے تھے کہ مسلمانوں کو اپنی ترجیحات میں علٰحدہ مسلم ریاست کے قیام کو شامل کر لینا چاہیے۔
* قرار دادِ لاہور سے پہلے مختلف لوگوں نے اپنی سوچ سمجھ کے مطابق ہندوستان میں سیاسی استحکام لانے کے لیے ہندوستان کی تقسیم کے منصوبے پیش کیے۔
* 1940ء کے مسلم لیگ کے اجلاس میں قائداعظم نے ہندوستان کی قومیتوں کے مسائل اور مسلمانوں کے علٰحدہ تشخص کے مسئلہ پر روشنی ڈالی۔
* مولوی فضل الحق نے قرار داد لاہور پیش کی، جس میں مسلم اکثریت کے علاقوں کو مختلف ریاستوں میں تقسیم کرنے کی تجویز دی گئی تھی۔ بعد ازاں ریاستوں کی بجائے ایک ریاست کے قیام پر زور دیا گیا۔
* قرار داد لاہور سے مسلمانوں کا نصب العین واضح ہو گیا۔

غور و فکر کے لیے چند نکات

(الف)

1- مسلمانانِ ہند میں اپنے قومی تشخص اور اس کی بقا کے سلسلے میں نظریات کا ارتقا کیا رہا اور اس میں مختلف سیاسی مسئلوں نے کیا کردار ادا کیا؟

2- قرار دادِ لاہور میں دی گئی تجویز سے کیونکر مسلمانانِ ہند کے مسائل ختم ہو سکتے تھے؟ وضاحت کریں۔

(ب) مختصر جواب دیں۔

(i) اس باب میں قائداعظم کی 1937ء کے بعد کی تقاریر کو ذہن میں رکھتے ہوئے، ان

کے کانگرس کے بارے میں نظریات پر نوٹ لکھیں ؟

(ii) قرار دادِ لاہور سے پہلے ہندوستان میں سیاسی مسائل کے حل کے لیے تقسیم کے جو منصوبے تجویز کیے گئے ، ان کا تجزیہ کریں؟

(iii) مارچ 1940 ء کو مسلم لیگ کے لاہور میں منعقدہ اجلاس میں قائداعظم نے مسلمانوں کی علحدہ معاشرتی اور سیاسی حیثیت کے سلسلے میں جو دلائل دیے ، ان پر ایک نوٹ لکھیں ؟

(iv) قرارداد لاہور میں علحدہ ریاستوں کی تجویز آپ کے خیال میں کس حد تک ہندوستان کے سیاسی مسائل کا حل تھی ؟

(ج) ہاں یا نہیں میں جواب دیں ۔

(i) قائداعظم نے فرمایا کہ ہندو سوراج کی بات کرتے ہیں اور چاہتے ہندو راج ہیں ۔

(ii) 1931 ء میں مسلم لیگ کے ممبران کی تعداد لاکھوں میں تھی ۔

(iii) اکتوبر 1937 ء کے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں مسلم لیگ نے وفاق کی صورت میں کامل آزادی کا مطالبہ کر دیا ۔

(iv) تحریک خلافت کے بعد انگریزوں نے ہندوستانی سیاست کو مخصوص آئینی ارتقا کی شکل دے کر اسے عام لوگوں سے دُور کرنے کی کوشش کی ۔

(v) قرار داد لاہور میں ہندوستان کی مکمل آزادی کا مطالبہ کیا گیا تھا ۔

(د) نیچے ایک بیان کے ساتھ اس کی چند وجوہات دی گئی ہیں۔ یہ وجوہات اپنی جگہ پر درست ہیں تاہم ان میں کوئی ایک سب سے اہم اور بنیادی نوعیت کی ہے۔ ان تمام وجوہات پر کلاس میں بحث کریں اور سب سے بہتر پر ✓ کا نشان لگائیں۔

1940 کی قراردادِ لاہور سے:۔

(i) مسلمانوں کو اپنے نصب لعین کی نشاندہی ہو گئی ۔

(ii) تمام علاقائی مسلم جماعتوں میں اتحاد کی خواہش پیدا ہو گئی ۔

(iii) عام مسلمانوں میں مسلم لیگ کے سیاسی مقاصد سے متعلق آگہی اور شعور پیدا ہونا شروع ہو گیا ۔

14

حصول پاکستان

دوسری جنگ عظیم (1) کے چھڑنے سے جہاں پوری دنیا بالخصوص یورپ، ایشیا اور شمالی افریقہ کے ممالک پر اثرات مرتب ہو رہے تھے، وہیں ہندوستان بھی اس سے حد درجہ متاثر ہوا۔ 1940ء کی گرمیوں میں جنگ کا رُخ برطانیہ کے خلاف ہوگیا۔ ہٹلر کی فوجیں یورپ کے چھوٹے چھوٹے ممالک کو فتح کرتی ہوئیں فرانس میں داخل ہو گئیں۔ اُس وقت برطانیہ کو شدید خطرہ لاحق تھا۔ خطرہ بڑھ رہا تھا کہ جرمنی کی فوجیں انگلستان پر بھی حملہ کرنے کی کوشش کریں گی۔ چونکہ ہندوستان برطانیہ کی ایک نو آبادی

۱۔ جنگ عظیم دوم (1939ء - 1945ء) پہلی جنگ عظیم میں معاہدہ ورسیلز کے تحت جرمنی پر کافی اہانت آمیز شرائط لاگو کر دی گئی تھیں۔ اس کے ردعمل میں وہاں مزاحمت کا سلسلہ شروع ہوا اور جرمنی نے 3- ستمبر 1937ء کو پولینڈ پر حملہ کر دیا۔ اس زمانے میں جرمنی پر ہٹلر کی حکومت تھی۔ ابتدا میں ہٹلر کی بڑھتی ہوئی طاقت کو انگلستان نے مزید تقویت بہم پہنچائی۔ اس میں اس کا مقصد یہ تھا کہ ہٹلر خوب طاقت مجتمع کر کے روس پر حملہ کر دے گا اور برطانیہ کے کمیونزم کے پھیلاؤ کو روکنے کا مقصد حل ہو جائے گا۔ جرمنی کے پولینڈ پر حملے سے انگلستان کے عزائم پورے نہ ہونے تو اس نے پولینڈ کے ساتھ اتحاد قائم کر لیا۔ بعد ازں فرانس بھی جرمنی کے خلاف ہوگیا۔ جرمنی کے ساتھ اس کا بڑا حلیف اٹلی تھا۔ بقیہ یورپ ان دونوں کے خلاف تھا۔ جرمنی نے یورپ کے بہت سے ممالک کو فتح کر لیا۔ بعد میں اتحادیوں کی کارروائی سے ہٹلر اور اٹلی کے مسولینی کو ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اپریل 1945ء کو مسولینی کو پھانسی دے دی گئی۔ مئی 1945ء کو جرمنی نے بھی ہتھیار ڈال دیے۔ ہٹلر نے خودکشی کر لی۔

تھا ، اس لیے حکومت برطانیہ کی خواہش تھی کہ یہاں سے اسے زیادہ سے زیادہ امداد پہنچے ۔

ان حالات میں جب حکومتِ برطانیہ سخت مشکل حالات میں پھنسی ہوئی تھی ، مقامی رہنماؤں نے اس پر سیاسی دباؤ بڑھانا شروع کر دیا ۔ اِن جماعتوں میں کانگرس سرفہرست تھی ۔ یہ حکومت کی مخالفت کر رہی تھی اور لوگوں کو جنگ کے سلسلے میں حکومت سے تعاون کرنے سے منع کر رہی تھی ۔ کانگرس ہندوستان کو مکمل آزادی دیے جانے پر زور دے رہی تھی اور اس سلسلے میں آئین کی تیاری کے کام کو ایک آئین ساز اسمبلی کے سپرد کرنے کا مطالبہ کر رہی تھی ۔ اس مطالبے کا واضح مقصد ہندوستان میں کانگرس کی حکومت قائم کرنے کے سوا کچھ نہ تھا ۔

اِس صورتحال میں قائداعظم کو سخت تشویش ہوئی انھوں نے وائسرائے کو ایک خط لکھا ۔ اس میں اہم بات یہ تھی :۔

"ملک معظم کی گورنمنٹ یا پارلیمنٹ ہندوستان کی دو بڑی قوموں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کی رضامندی اور منظوری کے بغیر اصولاً یا کسی اور طرح نہ کوئی اعلان کرے اور نہ کوئی دستور بصورتِ قانون منظور کرے ۔"

اس کے جواب میں وائسرائے نے یہ خط لکھا :۔

"آپ کی دوسری بات کے متعلق میں یہ یقین دلا سکتا ہوں کہ ملکِ معظم کی حکومت کو اس معاملہ میں کوئی غلط فہمی نہیں ہے کہ ہندوستان کے آئینی استحکام اور ترقی کے لیے آپ کی قوم کا مطمئن ہونا کس قدر اہم ہے ۔ لہذا آپ کو اس بات سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ ہندوستان میں اپنی حیثیت کی وجہ سے آپ کی قوم کی رائے کا جو وزن ہے ، اس کو گھٹا دیا جائے گا ۔"

اِس خط کے مندرجات کی تصدیق 8- اگست 1940 کو وائسرائے کے اعلان سے بھی ہوتی ہے۔ یہ بیان اگست کی پیش کش کے نام سے مشہور ہے۔ پیش کش میں مندرجہ ذیل امور اہم تھے۔

(i) حکومت وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں توسیع کرے گی اور اس میں ہندوستانیوں کو شامل کیا جائے گا ۔

(ii) ہندوستان میں جنگی کوششوں کو تیز تر کرنے کے لیے ایک قومی دفاعی کونسل قائم کی جائے گی ۔

(iii) ہندوستان میں کوئی ایسا آئین نافذ نہیں کیا جائے گا جسے ملک کا کوئی بڑا طبقہ منظور نہ کرتا ہو ۔

(iv) جنگ کے زمانے میں آئین کے مسئلے پر کچھ کرنا ممکن نہیں ، لہذا جنگ کے اختتام کے بعد آئین سازی کا مسئلہ ہندوستان کے نمائندوں کا ادارہ ہی طے کرے گا ۔

اس بیان کے آخر میں وائسرائے نے تمام ہندوستانی جماعتوں کو جنگی کارروائیوں میں حکومت سے تعاون کی اپیل کی ۔

کانگرس ، اگست کی پیش کش سے سخت مایوس ہوئی کیونکہ اس میں ان کے مطالبات کو پورا کرنے کا کوئی اشارہ تک موجود نہ تھا ۔ 27- ستمبر 1940ء کو ایم ۔ کے گاندھی نے وائسرائے سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی اور جنگی کارروائیوں کی کھلم کھلا مخالفت کی اجازت طلب کی ۔ وائسرائے کے انکار پر ایم ۔ کے گاندھی نے تحریکِ سول نافرمانی شروع کرنے کا اعلان کر دیا ۔ اس تحریک کا مقصد حکومت پر دباؤ ڈالنا تھا کہ وہ ہندوستان کو مکمل آزادی ، دستور ساز اسمبلیوں کے قیام اور عبوری قومی حکومت کے قیام کا اعلان کرے ۔ اِس تحریک سے تشدد اور قتل و غارتگری بھڑک اُٹھی ۔ 1941ء تک یہ تحریک جاری رہی ۔ اِس تحریک کے دوران تقریباً تیس ہزار افراد گرفتار ہوئے۔

مسلم لیگ نے اِس تحریک میں حصہ نہ لیا اور وائسرائے کی اگست کی پیشکش کو ہندوستان کی اقلیتوں اور مسلمانوں کے لیے خوش آئند قرار دیا ۔ تاہم قومی دفاعی کونسل کے مسئلہ پر مسلم لیگ کا نقطۂ نظر حکومت سے مختلف تھا ۔ وائسرائے نے چند مسلمان رہنماؤں کو جو مسلم لیگ کے ممبر بھی تھے ، کو قائداعظم (بحیثیت صدر مسلم لیگ) کی اجازت کے بغیر کونسل میں شریک ہونے کی دعوت دی جو ان اصحاب نے قبول کر لی ۔ مسلم لیگ کے کہنے پر بعد میں ان اصحاب نے دفاعی کونسل سے استعفٰی دے دیا مگر

قائداعظم کو اس کا سخت رنج رہا ۔

کرپس تجاویز

ہندوستان کی داخلی سیاست میں خفشار بڑھ رہی تھی ۔ جنگِ عظیم دوم کی صورتحال دن بدن بگڑ رہی تھی اور جرمنی افواج کی پیشقدمی بڑھتی جا رہی تھی ۔ اِن حالات میں حکومت برطانیہ نے سر سٹیفرڈ کرپس CRIPPS, SIR RICHARD STAFFORD (1889ء – 1952ء) کی قیادت میں ایک وفد کو ہندوستان بھجوایا ۔ یہ وفد 23 مارچ 1942ء کو ہندوستان پہنچا ۔ اس مشن کا مقصد ہندوستان کی سیاسی جماعتوں سے تعاون حاصل کرنا تھا ۔ مشن نے دونوں سیاسی جماعتوں سے ملاقات کی اور یہ تجاویز مرتب کیں :-

1- جنگ کے اختتام پر ہندوستان کو مکمل آزادی دے دی جائے گی ۔

2- برطانوی حکومت کا مقصد یہ ہے کہ ایک نئی ہندوستانی یونین تشکیل دی جائے جو برطانیہ اور دوسری نوآبادیات کے ساتھ تاجِ برطانیہ میں شریک ہو لیکن وہ اپنے داخلی اور خارجی امور میں کسی کے زیر اثر نہ ہوں ۔

3- جنگ کے خاتمے پر ہندوستان کے دستور کی تیاری کے لیے آئین ساز اسمبلی قائم کی جائے گی ۔

4- دستور میں اس بات کی گنجائش رکھی جائے گی کہ وفاق میں شامل ہر صوبہ دس سال کے بعد یونین سے علٰحدگی اختیار کر لے ۔

5- موجود حالات میں برطانوی حکومت دفاع کی ذمہ داری مکمل طور پر اپنے ہاتھوں میں رکھے گی ۔

کرپس مشن کی تجاویز کو مسلم لیگ اور کانگرس دونوں نے رد کر دیا ۔ کانگرس حکومتِ برطانیہ کی جنگ عظیم میں شمولیت اور اس کی کمزور صورتحال سے فائدہ اٹھا کر اسے مجبور کر رہی تھی کہ وہ ہندوستان کو مکمل آزادی دے تاکہ ہندوستان پر کانگرس کی حکومت قائم ہو جائے ۔ آل انڈیا مسلم لیگ نے مندرجہ ذیل وجوہات کی بنیاد پر کرپس تجاویز کو مسترد کیا ۔

1) مسلم لیگ، ہندوستان میں ایک یونین کے قیام کو اپنے نصب العین جس کا اظہار اس نے قرار دادِ لاہور میں کیا تھا کے منافی خیال کرتی تھی۔

2) جس مجلس قانون ساز کے قیام کی تجویز دی گئی تھی، اس میں اہم معاملات کا فیصلہ کثرت رائے سے ہونا تھا۔ اس صورت حال میں جب کہ مسلمانوں کا تناسب صرف 25 فیصد تھا، وہ اکثریت کی خواہشات کے سامنے جھکنے پر مجبور ہو جاتے۔

قائداعظم نے ان تجاویز پر یہ تبصرہ کیا:۔

''مسلمانانِ ہند کو اس امر سے سخت صدمہ پہنچا اور مایوسی ہوئی کہ مسلمان قوم کی جداگانہ ہستی اور جداگانہ وجود کو تسلیم نہیں کیا گیا، مسلمان اس وقت تک خاموش نہیں ہوں گے جب تک ان کا حق خود ارادیت تسلیم نہیں کر لیا جائے گا۔ ہندوستان ایک ملک ہے، نہ کہ ایک قوم، یہ مختلف قوموں اور تمدّنوں کا گہوارہ ہے۔"

ایم۔ کے گاندھی نے کرپس تجاویز کو ایک دیوالیہ بنک کے ایسے چیک سے تشبیہہ دی جس پر بعد کی تاریخ ڈالی گئی ہو۔

مجموعی طور پر، اگرچہ یہ تجاویز کامیاب نہ ہوئیں مگر ان میں مجوزہ یونین کے قیام سے قرار داد لاہور میں علحدہ ریاستوں کے قیام کے نظریے کو ضرور تقویت ملی۔ یہ پہلا موقع تھا جب حکومت برطانیہ نے ہندوستان کے سیاسی مسائل کو اس انداز سے دیکھنا شروع کیا تھا۔

کابینہ مشن

پس منظر

کرپس مشن کی ناکامی کے بعد کانگرس نے 1942ء میں ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی تحریک شروع کر دی۔ یہ تحریک اپنی شدّت کے اعتبار سے نہایت تیز تھی اور بیسویں صدی میں ہندوستان میں انگریزوں کو شاید ہی ایسی تحریک کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ اس تحریک کا سب سے بڑا مطالبہ یہ تھا کہ برطانوی حکومت کسی بھی نتیجے کی پرواہ کیے بغیر

فوری طور پر ہندوستان کو مکمل آزادی دے دے ۔ حکومت نے اس تحریک کے خلاف شدید ردِ عمل ظاہر کیا اور کانگرس کو کالعدم قرار دے کر اس کے تمام اہم رہنماؤں کو قید کر دیا ۔ پورے ملک میں شدید بحرانی صورتحال پیدا ہو گئی ۔ پولیس فائرنگ ، گرفتاریاں اور تشدد آمیز واقعات معمول بن گئے ۔ اس تحریک میں طلبہ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ۔ سینکڑوں افراد مارے گئے اور ہزاروں کو گرفتار کر لیا گیا ۔ 1943ء میں حالات مکمل طور پر قابو میں آ گئے مگر کانگرس اور حکومت کے مابین خوف اور عدم اعتماد کی فضا برقرار رہی ۔ یہ فضا 1944ء میں ایم ۔ کے گاندھی کی رہائی تک جاری رہی ۔ اس تحریک میں مسلمانوں کے علاوہ اچھوتوں نے بھی شرکت نہ کی ۔

اِس زمانے میں مسلم لیگ اور کانگرس کے مابین اندازِ فکر میں تبدیلی کے باعث کافی بُعد پیدا ہو چکا تھا ۔ مسلم لیگ کا پہلا اور آخری مطالبہ ہندوستان کی تقسیم تھا اور کانگرس ہندوستان کو متحد رکھنے پر مُصر تھی ۔ کانگرس کے مطالبات کی روشنی میں یہ ظاہر تھا کہ وہ ہندوستان میں ہندو اکثریت کی حکومت قائم کر کے مسلمانوں کو ان کے سیاسی حقوق سے محروم کرنا چاہتی تھی ۔ یہ صورتحال مسلم لیگ کے لیے کسی طور قابلِ قبول نہ تھی ۔ ایسی صورت میں ان دونوں جماعتوں کے درمیان سیاسی سمجھوتے کی گنجائش تقریباً ختم ہو چکی تھی ۔

راج گوپال اچاریہ منصوبہ

اِن حالات میں راج گوپال اچاریہ نے مسلم لیگ اور کانگرس کے مابین اتحاد و تعاون کے لیے کوششیں کیں ۔ یہ کانگرس ورکنگ کمیٹی سے علٰحدہ ہو چکے تھے ۔ 1942ء میں آپ نے کانگرسی رہنماؤں کی گرفتاری کے بعد قائداعظم سے ملاقاتیں کیں ۔ بعد میں جیل میں ایم ۔ کے گاندھی سے بھی رابطہ کیا اور چند تجاویز مرتب کیں ۔ ایم ۔ کے گاندھی اس بات کو ماننے پر تیار ہو گئے کہ جب ہندوستان کو مکمل آزادی مل جائے تو مسلم اکثریت کے شمال مغربی اور مشرقی علاقوں کو 'دو آزاد اور خود مختار ریاستوں' میں بدل دیا جائے ۔ مگر اس میں شرط یہ لگائی گئی کہ ایسا کرنے سے پہلے اِن علاقوں میں بسنے والے تمام لوگوں سے اس کے بارے میں رائے شماری کروا لی جائے ۔ قائداعظم

نے اس شرط کو قرار دادِ لاہور کی روح کے منافی قرار دیتے ہوئے اسے رد کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ رائے شماری میں صرف مسلمان لوگ ہی حصہ لیں مگر فیصلہ دوسرے تمام لوگوں پر بھی عائد ہو گا۔ اِس کے علاوہ ایم۔ کے گاندھی کا ہندوستان میں مسلمان قوم کے بارے میں یہ نظریہ تھا۔ "مجھے تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ اپنا مذہب بدل لینے والے اور ان کی اولاد اپنے آباؤ اجداد سے مختلف قوم ہونے کا دعویٰ کریں۔ اگر اسلام کے ظہور سے پہلے ہندوستان میں ایک قوم آباد تھی تو اس کے باوجود کہ اس کے بہت سے بچوں نے اپنا مذہب بدل لیا، وہ ایک قوم رہے گی۔" قائداعظم نے اس نظریے کو غلط قرار دیا اور اس پر زور دیا کہ مسلمان علٰحدہ قوم ہیں اور انھیں حق خود اختیاری ملنا چاہیے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک قوم قرار دینا غیر حقیقی رویہ اور نظریہ ہے۔

راج گوپال اچاریہ فارمولا اور بعد ازاں اس پر قائداعظم اور گاندھی کے مذاکرات سے کچھ حاصل نہ ہوا تاہم یہ بات سب پر عیاں ہو گئی کہ ہندوستان میں صرف یہی دو رہنما سب سے بڑے رہنما ہیں جو حقیقی معنوں میں اپنی اپنی قوموں کی نمائندگی کر رہے ہیں۔

1943ء میں ہندوستان میں ایک نیا وائسرائے لارڈ ویول WAVEL, LORD (1883ء – 1950ء) آیا۔ یہ پہلے بھی ہندوستان کی فوج کے کمانڈر انچیف کی حیثیت سے یہاں رہ چکا تھا۔ ہندوستان میں اس کو وائسرائے لگانے کا مقصد بنیادی طور پر یہی تھا کہ وہ اپنے سابقہ تجربے کی بنیاد پر ہندوستان کی سیاسی فضا میں تناؤ کو کم کرے۔ لارڈ ویول نے اپنی آمد کے بعد مرکزی مجلس قانون میں اپنے مقاصد اور ترجیحات میں ہندوستان کو متحدہ ملک رکھنے کا ذکر کیا تھا۔ اس نے ہندوستان کو ایک جغرافیائی وحدت قرار دیا اور آئین کی تیاری کے سلسلے میں ضروری اقدام کرنے کا یقین دلایا۔ لارڈ ویول کا خیال تھا کہ اگر سیاسی جماعتیں عبوری حکومت کے قیام پر رضامند ہو جائیں تو بعد ازاں انھیں طویل المیعاد فارمولے پر بھی رضامند کروانا ممکن ہو جائے گا۔ اس سے ہندوستان کو جغرافیائی طور پر متحد رکھنا بھی ممکن ہو جائے گا۔

لارڈ ویول نے مختلف سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں سے گفتگو کی مگر کوئی واضح نتیجہ نہ برآمد ہو سکا ۔ مارچ 1945ء کو لارڈ ویول انگلستان گیا اور اس نے وہاں برطانوی حکومت سے ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں گفتگو کی ۔

مئی 1945ء میں دوسری جنگ عظیم ختم ہو گئی ۔ اب ہندوستان میں سیاسی بد منی پھیلنے کا خطرہ بھی زیادہ ہو گیا تھا ۔ جنگ کے دوران حکومت ہنگامی حالات کا بہانہ بنا کر سیاسی سرگرمیوں اور آئینی پیش رفت کو دباتی رہی مگر اب ایسا کرنا ناممکن تھا ۔ پھر جنگ کی ابتدا میں حکومت کو اپنے کیے وعدوں کا پورا کرنا بھی ضروری تھا ۔

شملہ کانفرنس

14- جون 1945ء کو سیکرٹری آف سٹیٹ (وزیر ہند) نے برطانوی دارالعلوم میں چند تجاویز کا اعلان کیا ۔ ان تجاویز پر بحث و مباحثے کے لیے وائسرائے نے شملہ میں ہندوستان کے اہم رہنماؤں کی کانفرنس بلوائی ۔ کانفرنس میں اس امکان پر زیادہ تر بحث ہوئی کہ وائسرائے کی انتظامی کونسل کو دوبارہ تشکیل دے کر اسے عبوری حکومت کا درجہ دے دیا جائے ۔ اس میں اہم فرقوں کو نمائندگی دینے کی تجویز دی گئی ۔ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو مساوی نمائندگی دینے کی تجویز تھی ۔ کونسل کی تشکیل کے لیے کانگرس اور مسلم لیگ دونوں کو اپنے نمائندے تجویز کرنے کا کہا گیا ۔ کانگرس کی طرف سے دی گئی فہرست میں تین مسلمان غیر لیگی نمائندوں کے نام بھی شامل تھے ۔ قائداعظم نے اس پر اعتراض کیا کہ مسلمان نمائندوں کی نامزدگی کا اختیار صرف مسلم لیگ کو حاصل ہے کیونکہ وہی مسلمانان ہند کی نمائندہ جماعت ہے ۔ اس اعتراض پر مزید گفتگو کا سلسلہ رک گیا ۔ شملہ میں کانفرنس ناکام ہو گئی ۔ شملہ کانفرنس کے آخری اجلاس کے بعد قائداعظم نے کہا :۔

> "ہمارا موقف یہ تھا اور یہ ہم نے 1940ء کے بعد متواتر حکومتِ برطانیہ پر واضح کر دیا تھا کہ ہم کسی عبوری عارضی گورنمنٹ پر نہ اس وقت غور کر سکتے ہیں اور نہ اس میں شریک ہو سکتے ہیں جب تک کہ حکومت برطانیہ کی طرف سے ایسا اعلان نہ ہو جس میں مسلمانوں کے حق خودارادیت کی

ضمانت دی جائے اور یہ وعدہ کیا جائے کہ جنگ کے بعد یا اس قدر جلد ، جتنا کہ ممکن ہو ، حکومت برطانیہ مسلم لیگ کے ان بنیادی اصولوں کو ملحوظ رکھ کر ، جو مارچ 1940 ء کے رزولیوشن میں ہیں ، پاکستان قائم کرے ۔ یہ پہلی شرط تھی ، دوسری شرط یہ تھی کہ ہم اقلیت قوم نہیں ہیں اور ہم عارضی انتظام میں اس وقت کی ضروریات کا خیال کر کے ، جو جنگ کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہے اور اس ارادے سے کہ اہتمام جنگ میں پورا تعاون کریں گے ، صرف اس بنیاد پر شریک ہوں گے کہ مجوزہ انتظامی کونسل میں مسلمانوں کی تعداد دوسروں کے برابر ہو ۔ ویول پلان نے ان دونوں تجویزوں کو ختم کر دیا اور ہم سے یہ مطالبہ کیا ہم شدید ترین قربانی کریں ۔"

(جمیل الدین احمد ۔ Speeches & Writings of Mr. Jinnah Vol.II)

مسلم لیگ کے ویول پلان کو ترک کرنے پر ایک ہندو مصنف نے یہ تبصرہ کیا ہے :۔

"دوسری طرف (ویول) پلان کو ترک کر کے بلاشبہ جناح اور مسلم لیگ کی پوزیشن مستحکم ہو گئی اور یہ اس وقت ہوا جب ان کے حالات زیادہ اچھے نہ تھے ۔ اس سے ان مسلمانوں کی پوزیشن کمزور ہو گئی جو مسلم لیگ کی مخالفت کر رہے تھے، خصوصاً پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کی ۔ اور چونکہ یہ بات واضح ہو گئی کہ محض مسٹر جناح ہی ایک ایسے شخص ہیں جو کچھ کر سکتے ہیں ، اس لیے مذبذب مسلمان اہل سیاست مسلم لیگ کی طرف جھک پڑے ۔"

(وی ۔ پی مینن Transfer of Power
بحوالہ پاکستان ناگزیر تھا ۔ ص ۔ 362)

انتخابات

ویول پلان کی ناکامی اور اس میں زیر غور تجاویز پر کانگرس اور مسلم لیگ کے

رویوں سے یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ دونوں جماعتیں دو متضاد زاویۂ نگاہ کی حامل ہیں اور ان دونوں کے نصب العین ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں۔ ۔

21- اگست 1945ء کو لارڈ ویول نے موسم سرما میں ہندوستان میں مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات منعقد کرانے کا اعلان کیا ۔ ان انتخابات میں مسلم لیگ نے صرف دو باتوں کو بنیاد بنایا ۔ ایک یہ کہ مسلمانوں کے لیے علحٰدہ وطن کو قائم کیا جائے گا ۔ قائداعظم نے اپنی انتخابی تقاریر میں مسلمانانِ ہندوستان پر واضح کرنے کی کوشش کی کہ یہ انتخابات ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کے مستقبل کے لیے فیصلہ کُن ہیں ۔

مرکزی اسمبلی کے انتخابات دسمبر 1945ء کو منعقد ہوئے ۔ یہاں مسلم لیگ نے مسلمانوں کے لیے مخصوص 30 نشستیں جیت لیں ۔ صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات فروری 1946ء کو ہوئے ۔ اس کے نتائج یہ تھے ۔

صوبہ	مسلم نشستیں	مسلم لیگی ممبر
پنجاب	86	75
بنگال	119	113
آسام	34	31
سندھ	35	28
یو پی	66	54
شمال مغربی سرحدی صوبہ	38	17
بمبئی	30	30
مدراس	29	29
سی پی	14	13
بہار	40	34

مجموعی طور پر مسلمان نشستوں کی 90 فیصد نشستیں مسلم لیگ نے جیتیں ۔ صوبائی اسمبلیوں کی کل 492 مسلم نشستوں میں سے 428 نشستوں پر مسلم لیگ کے امیدوار

کامیاب ہوئے ۔

انتخابات کے بعد بہار ، یو پی ، بمبئی ، مدراس ، سی پی اور اڑیسہ میں کانگرس نے وزارتیں بنائیں ۔ شمال مغربی سرحدی صوبے میں بھی کانگرس کی حمایتی حکومت قائم ہوئی ۔ مسلم لیگ نے اگرچہ مجموعی طور پر مسلم اکثریت کے صوبوں میں سب سے زیادہ نشستیں حاصل کیں مگر وہ حتمی طور پر اکثریتی جماعت نہ بن سکی ۔ مسلم لیگ نے بنگال اور سندھ میں اپنی وزارتیں قائم کیں ۔ پنجاب میں یونینسٹ پارٹی نے دوسری چھوٹی جماعتوں سے مل کر حکومت قائم کی ۔

کابینہ مشن

حکومت برطانیہ نے ہندوستانی سیاست میں مفاہمت کو فروغ دینے کے لیے ایک وزارتی (کابینہ) مشن روانہ کیا ۔ یہ وفد 24- اپریل 1946ء کو وزیر ہند لارڈ پیتھک لارنس PETHICK LAWRENCE, LORD (1871ء - 1961ء) کی قیادت میں ہندوستان آیا ۔ اس وفد کے ذمے ہندوستان کا دستور بنانے کے طریقے ، دستور ساز اسمبلیوں کے قیام اور وائسرائے کی ایگزیکٹیو کونسل کی تشکیل نو کے لیے منتخب نمائندوں ، سیاسی جماعتوں اور ریاستوں کے نمائندوں سے گفتگو کے بعد اپنی تجاویز مرتب کرنا تھا ۔ اِس میں سب سے اہم معاملہ یہ تھا کہ ہندوستان کی وحدت کو برقرار رکھنے کے سلسلے میں کوئی مفاہمانہ فارمولا تیار کر لیا جائے ۔

وزارتی مشن نے مختلف سیاسی رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں ۔ کانگرس کی طرف سے مولانا ابوالکلام آزاد نے مشن سے ملاقات کی ۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان کو کامل آزادی دی جائے ، مستقبل کا دستور مجلس قانون ساز وضع کرے ، عبوری دور کے لیے مرکز میں عبوری حکومت ہو اور مرکزی حکومت کی تشکیل و ترکیب کے لیے صوبائی حکومتوں سے رائے لی جائے ۔ مسلم لیگ کے قیام پاکستان کے مطالبے پر انھوں نے ہندوستان کی تقسیم کو خارج از امکان قرار دیا ۔ گاندھی نے اس کے بارے میں یہ کہا :-

"........ پاکستان کا وہ مطالبہ میری سمجھ میں نہیں آیا جو مسٹر جناح کر رہے ہیں ۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں پاکستان کا حاصل اور خلاصہ کلچر کی

خود مختاری اور جائز تمناؤں کا بر آنا ہے۔ راجگوپال اچاریہ کے فارمولے نے اس مطالبے کی کامل تجویز کو معین صورت دے دی ہے۔ اگر اس کو یہ شکل دی گئی ہوتی تو وہ گفتگو کے لیے یک بنیاد کا کام دیتا اور جب تک میں اس کو دلائل سے قبول نہ کر لوں میں اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا کیونکہ پاکستان اس سے آگے حق کے خلاف ہے۔"

کابینہ مشن نے مندرجہ ذیل تجاویز تیار کیں۔

1- برطانوی ہند اور ریاستوں پر مشتمل ایک یونین آف انڈیا ہوگی، جس کی تحویل میں امور خارجہ، دفاع اور مواصلات کے محکمے ہوں گے۔

2- صوبوں کے تین گروپ ہوں گے۔ اے گروپ ہندو اکثریت کے چھ صوبوں پر مشتمل ہو گا۔ گروپ بی، شمال مغربی سرحدی صوبہ، پنجاب، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل ہو گا۔ گروپ سی میں بنگال اور آسام ہوں گے۔

3- صوبے اور ریاستیں بنیادی اکائیاں ہوں گی۔ مرکزی امور کے سوا باقی تمام امور اور باقی ماندہ اختیارات صوبوں کی تحویل میں دیے جائیں گے۔

4- اہم فرقہ وارانہ مسائل کو طے کرنے کے لیے دو بڑے قوموں کے نمائندوں کی اکثریت درکار ہوگی اور رائے شماری میں حصہ لینے والے حاضر ارکان کی اکثریت بھی ضروری ہوگی۔

5- آئین ساز اسمبلی کے تینوں حصوں میں سے ہر ایک اپنے گروپ میں شامل صوبوں کے لیے آئین بنانے کا اور ساتھ ہی وہ فیصلہ بھی کرے گا کہ آیا بحیثیت مجموعی گروپ کے لیے آئین بننا چاہیے لیکن نئے آئین کے تحت پہلے عام انتخابات کے بعد کسی بھی صوبے کی نئی مجلس قانون ساز کو گروپ سے باہر نکلنے کا اختیار حاصل ہو گا۔

6- ایک عبوری حکومت قائم کی جائے گی۔ جس میں تمام محکمے دفاع سمیت عوام کے قابل اعتماد لیڈروں کو سونپے جائیں گے۔

قائداعظم نے کابینہ مشن کی تجاویز پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ مشن نے مکمل اور خود مختار پاکستان کے قیام کے بارے میں مسلمانوں کے مطالبہ کی نفی کر دی ہے۔

تاہم 5- جون 1946ء کو مسلم لیگ کے دہلی کے اجلاس میں ان تجاویز کو اس خیال سے قبول کر لیا کہ 'دستور وضع کرنے کے لیے مشن نے جو نظام تجویز کیا ہے مسلم لیگ اس میں تعاون کرے، مگر اس توقع کے ساتھ کہ اس سے کامل اور خود مختار پاکستان وجود میں آئے گا۔' کانگرس نے تجاویز میں طویل المیعاد منصوبے کو منظور کر لیا جب کہ مختصر المیعاد منصوبے کو مسترد کر دیا۔ تاہم کانگرس نے قانون ساز اسمبلی میں شرکت کرنا تو قبول کر لیا مگر مسلم لیگ کے ساتھ مل کر ہر عبوری حکومت بنانا رد کر دیا۔ مسلم لیگ نے کانگرس کے بغیر ہی عبوری حکومت بنانے کی صلاح دی مگر حکومت نے اس کو رد کر دیا۔ حکومت اور کانگرس کے رویے سے تنگ آکر مسلم لیگ نے کابینہ مشن کی تجاویز کی منظوری کو واپس لے لیا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے بمبئی میں جولائی 1946ء کو منعقدہ اجلاس میں قائداعظم نے اپنی افتتاحی تقریر میں یہ کہا :-

"میں محسوس کرتا ہوں کہ مسلم لیگ کے لیے وقت آگیا ہے۔ اور یہ میں برابر کہتا رہا ہوں — تنظیم، اتحاد اور اپنی قوم کی طاقت پر اعتماد ہمارا دستور العمل ہونا چاہیے۔ اگر کافی طاقت نہیں ہے، تو وہ طاقت پیدا کرو۔ اگر ہم یہ کر لیں گے تو مشن اور حکومت برطانیہ کانگرس کی ان دھمکیوں سے کہ وہ عدم تعاون کرے گی، بچ جائیں گے۔ رہا ہو جائیں گے اور آزاد ہو جائیں گے۔ ہم کو یہی کہنا ہے کہ ہم یہی کریں گے۔

"خوش معاملگی اور انصاف کے لیے مسلم لیگ نے جتنی کوششیں کیں وہ، اور پھر جو خوشامدیں کیں وہ، سب رائیگاں گئیں، کانگرس پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وزارتی مشن کانگرس کے ہاتھوں میں کھیلتا رہا اور پھر اس نے اپنا کھیل بھی کھیلا۔

"ہم نے اعلیٰ اصولوں پر گفت و شنید کی، ہم نے رعایتوں پر رعایتیں دیں، اس لیے نہیں کہ ہم مرعوب ہو گئے تھے، ہم نے یہ خالصتاً اپنی اس پراسرار خواہش میں کیا کہ صرف مسلمانوں اور ہندوؤں کو نہیں، بلکہ ان تمام فرقوں کو آزادی مل جائے جو ہندوستان میں بستے ہیں۔ لیکن وہاں کانگرس خچر کی طرح جم کر کھڑی ہو گئی۔ اس کو اس کے سوا کسی بات کا خیال نہیں کہ مسلم لیگ کو کس طرح دبایا جائے۔"

یوم راست اقدام

اسی اجلاس میں مسلم لیگ نے فیصلہ کیا کہ "اب مسلمانوں کے لیے پاکستان حاصل کرنے اور ہندو غلبے کے امکانات سے نجات حاصل کرنے کے لیے براہ راست اقدامات کرنے کا وقت آگیا ہے ۔" مسلم لیگ نے ہندوستان کے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ 16- اگست 1946 ء کو راست اقدام کا دن (DIRECT ACTION DAY) منائیں تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ وہ پاکستان کے لیے ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہیں ۔ مسلمانوں سے یہ بھی اپیل کی گئی کہ وہ اپنے خطابات برطانوی حکومت کو واپس کر دیں ۔ یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ ملک کے طول و عرض میں جلسے اور جلوس منعقد کیے جائیں اور مسلم لیگ تحریک کے مقاصد سے مسلمانوں کو روشناس کرایا جائے ۔

مسلم لیگ کے اعلان کے مطابق 16- اگست 1946 ء کو یوم راست اقدامات منایا گیا ۔ کانگرس اور وائسرائے کے خلاف احتجاج کیے گئے ۔ مسلمانوں نے ہڑتالیں ، جلسے اور جلوس منعقد کیے ۔ کچھ مقامات پر اس دن ہندو مسلم فسادات بھی ہوئے جن میں سینکڑوں لوگ مارے گئے ۔

مسلم لیگ کے ان اقدامات کے ساتھ ہی وائسرائے نے کانگرس سے رجوع کیا اور یہ کہا کہ اگر مسلم لیگ تعاون نہ کرے تو کانگرس کو تن تنہا حکومت بنانے کی دعوت دی جائے گی ۔ بعد میں وائسرائے نے پنڈت نہرو کو حکومت بنانے کی دعوت دے دی ۔ حکومت بنانے کے سلسلے میں پنڈت نہرو اور قائداعظم کے درمیان مذاکرات ہوئے مگر نظریات میں اختلافات کے باعث ان میں کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا ۔

عبوری حکومت کا قیام

وائسرائے لارڈ ویول ہر قیمت پر عبوری حکومت کے منصوبے کو نافذ کرنا چاہتے تھے ۔ اس کے لیے کچھ اراکین کے نام بھی تجویز کیے گئے جن میں کچھ مسلمان بھی تھے ۔ عبوری حکومت کے قیام کے باوجود وائسرائے کی خواہش تھی کہ مسلم لیگ اس میں ضرور شریک ہو ۔ انھی دنوں فرقہ وارانہ کشیدگی کے باعث مسلم لیگ کی عبوری حکومت

میں شمولیت کو اور بھی لازمی سمجھا گیا وگرنہ ملک میں خانہ جنگی کا خطرہ ہو سکتا تھا ۔ ان حالات میں وائسرائے نے قائداعظم ، پنڈت نہرو اور گاندھی سے ملاقات کی ۔ اکتوبر 1946 ء میں مسلم لیگ نے اپنے نمائندے نامزد کرنے کا فیصلہ کیا ۔ عبوری حکومت میں مسلم لیگ کی شمولیت کا بنیادی مقصد مسلمانوں کے تحفظات کا خیال کرنا تھا ۔

عبوری حکومت میں مسلم لیگ کی شمولیت کے اعلان کے بعد دونوں جماعتوں میں محکموں کی تقسیم کا تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا ۔ کانگرس نے ہندوستان کی پیچیدہ معاشی صورتحال کے پیش نظر مالیات کا محکمہ مسلمانوں کے سپرد کرنے پر زور دیا ۔ ان کا خیال تھا وہ مالیت کا نظام بہتر طور پر نہ چلا سکیں گے ۔ لہذا مالیات کا محکمہ لیاقت علی خان (1) کے سپرد کر دیا گیا ۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کو تجارت ، مواصلات ، صحت اور قانون سازی کے محکمے سپرد کیے گئے ۔ لیاقت علی خان نے جو بجٹ پیش کیا اس میں دو تجاویز پیش کی گئی تھیں ۔ ایک تو نمک پر محصول ختم کر دیا گیا اور دوسرے انکم ٹیکس سے استثنأ کے لیے رقم دو ہزار سے بڑھا کر اڑھائی ہزار کر دی۔ اس سے حکومت کی آمدنی میں 8 کروڑ 50 لاکھ کی کمی واقع ہوئی ۔ مجموعی طور پر بجٹ میں 57 کروڑ روپے کا خسارہ سامنے آیا ۔ خسارے کو پورا کرنے کے لیے ایک لاکھ سے زائد کاروباری منافعوں پر 25

1- لیاقت علی خان (یکم اکتوبر 1895 ء ۔ 16 اکتوبر 1951 ء) پاکستان کے پہلے وزیراعظم ، کرنال (بھارت) میں پیدا ہوئے ۔ 1918 ء میں ایم ۔ اے او کالج علی گڑھ سے بی ۔ اے کیا اور پھر انگلستان چلے گئے ۔ جہاں سے انھوں نے قانون کی ڈگری حاصل کی ۔ انگلستان میں قیام کے دوران سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا ۔ 1926 ء میں یو پی سے اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور 14 سال تک اس کے رکن رہے ۔ مسلم لیگ میں شرکت کے بعد 1937 ء میں مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل منتخب ہوئے ۔ 1940 ء میں مرکزی قانون ساز اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے ۔ 1945 ء میں شملہ کانفرنس میں مسلم لیگ کے نمائندے کی حیثیت سے شامل ہوئے ۔ 1946 ء میں ہندوستان کی عارضی حکومت میں وزارت خزانہ کا قلمدان سنبھالا اور پہلے ہندوستانی کی حیثیت سے ہندوستان کا بجٹ پیش کرنے کا اعزاز حاصل کیا ۔ قیام پاکستان کے بعد قائداعظم نے انھیں ملک کا پہلا وزیراعظم نامزد کیا ۔ اکتوبر 1950 ء میں مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے ۔ 16 اکتوبر 1951 ء کو لیاقت باغ راولپنڈی میں ایک جلسہ عام میں انھیں شہید کر دیا گیا ۔

فیصد سپیشل انکم ٹیکس تجویز کیا گیا ۔ اس سے بڑے صنعت کاروں اور امیر لوگوں کی آمدنی پر زک لگی ۔ کانگرس کو ایسے لوگوں کی سرپرستی حاصل تھی ، اس لیے ان کے دباؤ میں آکر کانگرسی رہنماؤں نے اس بجٹ پر کڑی تنقید شروع کر دی ۔ دوسری طرف اب کوئی بھی معمولی سے معمولی اسامی بھی وزیرِ خزانہ کی منظوری کے بغیر پُر کرنا مشکل ہو گئی ۔ ایسی صورتحال میں کانگرس نے اپنے آپ کو بے بس محسوس کرنا شروع کر دیا ۔

1947 ء کے اوائل میں ہندوستان میں سیاسی تناؤ بڑھ جانے کی وجہ سے ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے ۔ ان فسادات میں مسلمانوں کو مالی اور شدید جانی نقصان پہنچ رہا تھا ۔ 1946ء کے اواخر تک بمبئی ، کلکتہ ، نواکھلی ، بہار اور دوسرے علاقوں میں شدید ہندو مسلم فسادات ہوئے ۔ اِن حالات میں مسلم لیگ کو ایسی جماعتوں کا بھی سامنا کرنا پڑ رہا تھا ، جو مسلمانوں کو قیام پاکستان کے مخالف نظریات میں الجھا رہی تھیں ۔ اس سلسلے میں مسلم لیگ کو پنجاب ، شمال مغربی سرحدی صوبہ اور آسام میں بھرپور تحریک چلانا پڑی ۔

تین جون کا منصوبہ

فروری 1947 ء کو برطانوی وزیراعظم ایٹلی (ATTLEE) نے دارالعوام میں اعلان کیا کہ برطانوی حکومت نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ ہندوستان میں ایک خود مختار نظام حکومت رائج ہو مگر ہندوستانی پارٹیوں کے باہمی اختلافات کے باعث کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا ۔ اب حکومت کا خیال ہے کہ جون 1947 ء تک تمام اختیارات ذمہ دار ہاتھوں کے سپرد کر دیے جائیں ۔ اگر مقررہ تاریخ تک ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی دستور وضع نہ کر سکی تو ملکِ معظم کی حکومت کو سوچنا پڑے گا کہ مقررہ تاریخ پر ہندوستان میں اختیارات کسے سونپے جائیں ۔ اس اعلان میں لارڈ ویول کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن (LOUIS, LORD MOUNT BATTON, 1900 ء – 1979 ء) کو ہندوستان کا وائسرائے مقرر کر دیا گیا ۔

ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان پر برطانوی راج کو قائم رکھنے اور اسے متحد رکھنے کے لیے سیاسی رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں ۔ ان ملاقاتوں میں ان پر یہ بات واضح ہو گئی کہ اب ہندوستان پر برطانوی راج برقرار نہیں رکھا جا سکتا اور یہ کہ ہندوستان کی تقسیم بھی

لازماً کرنا ہوگی ۔ اس ضمن میں انھوں نے ہندوستان کی تقسیم کے بارے میں ایک مسودہ تیار کیا ۔ جسے 3- جون 1947ء کو شائع کیا گیا ۔ اس کی اہم شقیں یہ تھیں ۔

1- پنجاب اور بنگال کی قانون ساز اسمبلیوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے گا ۔ دونوں حصوں کے اجلاس علٰحدہ علٰحدہ منعقد ہوں گے جن میں سادہ اکثریت سے یہ اسمبلیاں یہ فیصلہ کریں گی کہ صوبے کی تقسیم کی جائے یا نہیں ۔

2- سندھ کی دستور ساز اسمبلی یہ فیصلہ کرے گی کہ آیا اس کا آئین موجودہ اسمبلی بنائے گی یا نئی تشکیل شدہ اسمبلی ۔

3- صوبہ سرحد میں استصوابِ رائے کروایا جائے گا کہ آیا یہ اسمبلی میں شامل ہوگی یا نہیں ۔

4- بنگال کی تقسیم کی صورت میں سلہٹ میں ریفرنڈم کروایا جائے گا کہ آیا یہ ضلع مشرقی بنگال میں شامل ہونا چاہیے یا آسام کے ساتھ رہے گا ۔ اگر سلہٹ نے مشرقی بنگال میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا تو وہاں بھی ایک باؤنڈری کمیشن بنایا جائے گا ۔ اگر بنگال اور پنجاب کی تقسیم کی نوبت آئی تو ان میں سے ہر ایک کی آئین ساز اسمبلی کے دوبارہ انتخاب کے لیے 10 لاکھ کی آبادی کے حلقے کا ایک نمائندہ ہوگا ۔ اس منصوبے کو مسلم لیگ اور کانگرس نے قبول کر لیا ۔

ریڈ کلف ایوارڈ

3- جون کے منصوبے کے مطابق بنگال اور پنجاب کی تقسیم کے سلسلے میں وائسرائے نے ایک باؤنڈری کمیشن مقرر کیا ۔ اس کا سربراہ سر سیرل ریڈ کلف RADCLIFFE, CYRIL, SIR تھا۔ کمیشن کے دوسرے اراکین میں جسٹس منیر ، جسٹس دین محمد ، جسٹس مہاجن ، جسٹس تیجا سنگھ ، جسٹس اکرم ، جسٹس ایس اے رحمٰن ، جسٹس بسواس اور جسٹس مکرجی شامل تھے ۔ کانگرس اور برطانوی حکومت کے مابین ایک خفیہ معاہدے کے باعث ریڈ کلف نے بہت سے مسلم علاقوں کو بھارت میں ظاہر کر دیا ۔ پنجاب کے سلسلے میں گورداسپور ، فیروز پور ، جالندھر ، بٹالہ اور پٹھانکوٹ کے علاقے بھارت میں شامل کر دیے گئے ۔ حالانکہ تحصیل گورداسپور میں

52.1 فیصد مسلمان تھے ۔ قائداعظم نے اس ایوارڈ کے متعلق یہ کہا :۔

"حد بندی کمیشن کا ایوارڈ ناانصافی پر ہی مبنی نہیں ۔ اس ایوارڈ کو آئینی بھی نہیں کہا جا سکتا ۔ بلکہ یہ ایوارڈ بدنیتی کا آئینہ دار ہے ۔ آئینی نہیں بلکہ سیاسی فیصلے ہوئے ہیں لیکن ہم سے تسلیم کر چکے ہیں ایک باعزت قوم کی طرح ہم اس ایوارڈ کے پابند ہیں ۔"

قیام پاکستان

جولائی 1947ء کو برطانوی پارلیمنٹ نے ہندوستان کی آزادی کے قانون کو منظور کر دیا ۔ اس کی رُو سے 14- اگست کو ہندوستان اور پاکستان کی آزاد اور خودمختار مملکتیں قائم کر دی جائیں گی اور ہندوستان میں برطانوی راج ختم ہو جائے گا ۔

تحریک قیام پاکستان میں مسلم اکثریتی صوبوں کا کردار

گزشتہ صفحات میں تحریک قیام پاکستان کی مجموعی صورتحال اور ارتقا پر مباحث کیے گئے ہیں ۔ تحریک قیام پاکستان کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلم اکثریتی صوبوں ، پنجاب ، بلوچستان ، سندھ اور شمال مغربی سرحدی صوبے کا کردار بھی جانا جائے ۔

پنجاب :

پنجاب قدیم دور سے ہی اپنے وسائل پیداوار کی وجہ سے ہندوستان کا ایک اہم علاقہ رہا ہے ۔ مسلمانوں کی حکومت کے خاتمے کے بعد یہاں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت قائم ہوئی ۔ 1849ء میں انگریزوں نے یہاں اپنا اقتدار قائم کر لیا ۔ انگریزی حکومت کے دوران نہروں کا ایک جال بچھایا گیا ۔ اس سے یہاں نقد آور اجناس کی پیداوار میں اضافہ ہوا ۔ اِسی دور میں پنجاب میں بڑی بڑی زمینداریاں قائم ہوئیں ۔

اِن زمینداروں کے انگریزی حکومت کی طرف مفاہمانہ طرزِ عمل سے ایک عرصہ تک سکون پسند حالات رہے۔

علامہ سر محمد اقبال اسی صوبے میں پیدا ہوئے اور انھوں نے 1930ء میں مسلمانانِ ہند کے لیے ایک علحدہ ریاست کی تجویز پیش کی۔ علامہ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے یہاں مخصوص ملی جذبات پیدا کیے جن کا زیادہ تر اثر پنجاب کے نوجوانوں پر ہوا۔ انھی حالات میں چودھری رحمت علی نے 1933ء میں مسلمانوں کی علحدہ ریاست کا نام پاکستان تجویز کیا۔ قراردادِ پاکستان کی منظوری سے پہلے 1937ء میں پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے مسلمانوں کے لیے جدوجہد شروع کر دی تھی۔

23- مارچ 1940ء کو مسلم لیگ کا 27 واں سالانہ اجلاس لاہور میں شاہی مسجد کے ساتھ ملحقہ ایک پارک میں ہوا۔ اِس میں قرارداد پاکستان پیش کی گئی۔ اس قرارداد کی روح کو ملک کے کونے کونے میں پہنچانے کے لیے پنجاب کے نوجوانوں نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ 1946ء کے انتخابات، جو مطالبہ پاکستان کی بنیاد پر لڑے جا رہے تھے، مرکزی اسمبلی کے لیے پنجاب کی تمام نشستوں پر مسلم لیگ کو کامیابی ملی۔ اسی طرح صوبائی اسمبلی کی 86 مسلم نشستوں میں سے 75 مسلم لیگ کو ملیں۔ اس کامیابی پر قائد اعظم نے پنجاب صوبائی اسمبلی کے صدر کو یہ پیغام بھجوایا:-

"دِلی مبارک باد قبول کیجیے۔ مسلمانانِ پنجاب نے واضح کر دیا ہے کہ پنجاب میں ہی پاکستان کا پہلا پتھر لگایا گیا ہے۔ تمام مشکلات کے باوجود نوے فیصد کامیابی حاصل کرنا، ایک شاندار کارنامہ ہے۔ اس پر میں، آپ اور تمام مسلمانانِ ہندوستان فخر کر سکتے ہیں۔"

بعد ازاں پنجاب اسمبلی کے مزید چار اراکین کے مسلم لیگ میں شامل ہونے سے مسلم لیگ اسمبلی کی سب سے بڑی سیاسی جماعت بن گئی۔ تاہم کانگرس کی حمایت سے یونینسٹ پارٹی نے خضر حیات ٹوانہ کی قیادت میں وزارت بنائی۔ یہ وزارت عوام میں مقبول نہ ہو سکی اور ایک تحریک کے بعد مارچ 1947ء کو خضر وزارت نے استعفیٰ دے دیا۔

3- جون 1947 ء کے اعلان کے مطابق پنجاب کی اسمبلی کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا ۔ مسلمان اکثریت کے اضلاع کے ممبران ایک حصّے میں اور غیر مسلم اکثریت کے اضلاع کے ممبران دوسرے حصّے میں شامل ہو گئے ۔ پنجاب اسمبلی نے تقسیم ہندوستان کے سوال پر 77 ووٹوں کے مقابلے میں 91 ووٹوں سے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں شرکت کا فیصلہ کیا ۔

ہندوستان کی آزادی کے وقت مسلم لیگ پورے پنجاب کو پاکستان میں شامل کرنا چاہتی تھی ۔ اس پر سکھوں نے نیم فوجی تنظیموں کو منظم کرنا شروع کر دیا ۔ مارچ 1947 ء سے پنجاب میں فسادات شروع ہو گئے ۔ 3- جون کو جب سکھوں کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ مغربی پنجاب پاکستان میں شامل ہو جائے گا تو غارت گری اور قتل و خون کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا ۔ مشرقی پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے پاکستان کو ہجرت کرنے والے لوگوں کے قافلوں پر منظم حملے شروع کر دیے گئے ۔ بے شمار عورتوں کو اغوا کر لیا گیا اور ہزاروں لوگوں کو قتل یا زخمی کر دیا گیا ۔ مشرقی پنجاب میں 28- جولائی 1947 ء سے وسط نومبر تک ہندوؤں اور سکھوں نے جو حملے کیے ان کی تعداد حسب ذیل ہے ۔

مسلمان پناہ گزینوں کی ٹرینوں پر حملے — 54

سیالکوٹ اور جموں کی سرحدوں پر حملے — 63

واہگہ اور قصور کی سرحدوں پر حملے — 28

سکھوں اور ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمان بالکل نہتے تھے ۔ وہ اِن ہنگاموں اور فسادات کے لیے بالکل تیار نہ تھے ۔ 1949 ء تک 52 لاکھ افراد مشرقی پنجاب اور مشرقی پنجاب کی ریاستوں سے پاکستان میں آئے ۔

بلوچستان

ہمارے صوبہ بلوچستان میں قدیم دَور سے قبائلی نظام چلا آ رہا ہے ۔ انگریزوں کو یہاں اپنا اثرورسوخ قائم کرنے میں خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑا ۔ بلوچستان میں اپنا تسلّط قائم کرنے کے بعد انگریزوں نے یہاں ضروری سیاسی اور اقتصادی اصلاحات کرنے

سے گریز کیا حالانکہ یہاں بسنے والوں کے حالات حد درجہ دگرگوں تھے ۔ مسلم لیگ نے مختلف مواقع پر یہاں اصلاحات کرنے پر زور دیا ۔ قائداعظم کے چودہ نکات میں بھی یہ مطالبہ پیش کیا گیا تھا ۔

بلوچستان میں ، انگریزوں کے خلاف شعور بیدار کرنے میں نواب یوسف علی عزیز مگسی نے ایک اہم کردار ادا کیا تھا ۔ آپ نے 1932 ء میں جیکب آباد میں کل ہند بلوچ کانفرنس منعقد کی ۔ آپ نے بہت سے اخبارات بھی جاری کیے جن میں بلوچستانی عوام کے حقوق اور مسائل کا تذکرہ ہوتا تھا ۔ ان مضامین میں انگریزوں کی پالیسیوں پر تنقید کے باعث ، ان رسائل کو ضبط کر لیا گیا ۔

جون 1939 ء کو بلوچستان میں مسلم لیگ قائم کی گئی ۔ قاضی محمد عیسیٰ اس کے روح رواں تھے ۔ 23- مارچ 1940 ء کو مسلم لیگ کے لاہور میں منعقدہ تاریخی اجلاس میں آپ نے بلوچستان کے عوام کی نمائندگی کی ۔ آپ نے "قرار دادِ لاہور" کی تائید کی ۔ آپ نے اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کی قرار دادِ لاہور کی تائید کو سراہا اور انھیں ہر معاملے میں مدد کا یقین دلایا ۔ انھوں نے یہ بھی یقین دلایا کہ مسلم اکثریتی صوبوں میں ہندوؤں کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جائے گا ، جو وہ اپنے اکثریتی صوبوں میں مسلمانوں سے کریں گے ۔ آپ نے اپنی تقریر میں یہ بھی اعلان کیا کہ وہ قرار دادِ لاہور کی کامیابی سے مسلم اکثریتی صوبوں کے 6 کروڑ مسلمانوں کو آزادی مل جائے گی ۔ آپ کی تقریر سے پہلے صوبہ سرحد کے سردار اورنگ زیب خاں نے کہا تھا کہ وہ درۂ خیبر کی دربانی کریں گے ۔ اس پر قاضی عیسیٰ نے اعلان کیا کہ وہ درۂ خیبر سے ایک چھوٹے دروازے یعنی درۂ بولان کی دربانی کریں گے ۔

23- مارچ 1941 ء کو بلوچستان مسلم لیگ نے یوم پاکستان منایا ۔ اس سلسلے میں کوئٹہ میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا ۔ اس جلسے میں قائداعظم کی قیادت پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا گیا ۔ 1945 ء میں جب قائداعظم نے لوگوں سے فنڈ جمع کرنے کی اپیل کی تو آپ نے کہا تھا "تم مجھے چاندی کی گولیاں دو ، میں آزادی کی جنگ لڑ کر تمھیں پاکستان دوں گا ۔" اس اپیل کے جواب میں بلوچستان کے لوگوں نے فنڈ جمع کرنا شروع کر

دیے ۔ بلوچستان کے ایک شخص نے اپنا نام ظاہر کیے بغیر مسلم لیگ کے چندے میں چاندی کی دو سلاخیں دیں ، ان کا وزن ساڑھے پانچ ہزار تولہ تھا ۔

3- جون 1947ء کے اعلان میں بلوچستان کے بارے میں کہا گیا تھا کہ بلوچستان کی بھارت یا پاکستان میں شمولیت کا فیصلہ شاہی جرگہ اور کوئٹہ میونسپل کمیٹی کے اراکین کریں گے ۔ 29- جون کو رائے شماری ہونا تھی ۔ کانگرس اور کئی دوسرے حلقے شاہی جرگے کے اراکین کو بھارت میں شامل ہونے کی ترغیب دے رہے تھے ۔ پاکستان میں شمولیت کے سلسلے میں میر جعفر خان جمالی اور نواب محمد خاں جوگیزئی نے اہم کردار ادا کیا ۔ آپ دونوں نے ایک اعلان کیا کہ بلوچستان کے سرداروں نے پورے غور کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ بلوچستان کے حقوق کا بہترین تحفظ پاکستان میں رہنے سے ہی ممکن ہو گا ۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے قائداعظم پر مکمل بھروسے کا بھی اعلان کیا کہ وہ ان کی صحیح رہنمائی کریں گے ۔ اس بیان کا خاطر خواہ اثر ہوا اور رائے شماری سے کچھ روز پہلے کوئٹہ میں پاکستان میں شمولیت کے لیے ایک جلوس نکالا گیا ۔

آخری وقت اعلان کیا گیا کہ 29- جون کو رائے شماری نہیں ہوگی بلکہ اس دن صرف گورنر جنرل کا پیغام پڑھ کر سنایا جائے گا ۔ یہ اعلان ابھی ختم بھی نہ ہوا تھا کہ نواب محمد خان جوگیزئی نے اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کیا :

> "ہم یہ بیان پہلے پڑھ چکے ہیں ۔ ہمیں فیصلہ کرنے کے لیے مزید وقت نہیں چاہیے کیونکہ شاہی جرگے کے سردار پاکستان کی حمایت میں فیصلہ کر چکے ہیں ۔ ہم اعلان کرتے ہیں کہ ہمارا نمائندہ پاکستان دستور ساز اسمبلی میں بیٹھے گا ۔"

اس کے ساتھ ہی ہال تالیوں سے گونج اٹھا اور لوگوں نے پاکستان زندہ باد کے نعرے بلند کر دیے ۔ اس طرح بلوچستان پاکستان کا ایک حصہ بن گیا ۔

سندھ

مسلمان ہندوستان میں سب سے پہلے سندھ میں آئے ۔ اسی مناسبت سے اسے "باب الاسلام" کہا جاتا ہے ۔ انگریزوں نے اس علاقے پر 1843ء میں اپنا تسلط قائم کیا

اور اسے صوبہ بمبئی کا حصہ بنا دیا گیا ۔ اس سے صوبہ سندھ میں اقتصادی طور پر بہتر حالات پیدا نہ ہو سکے ۔ دوسری طرف ہندوؤں کے اقتصادی غلبے کے باعث اس صوبے کے مسلمانوں کی تعلیمی ، معاشرتی اور اقتصادی حالت بدستور پس ماندہ رہی ۔ قائداعظم نے اپنی تمام سیاسی تجاویز میں سندھ کو بمبئی سے علٰحدہ کرنے کا مطالبہ کیا ۔ 1935 ء کے آئین کے تحت صوبہ سندھ کو ایک علٰحدہ صوبے کا درجہ دے دیا گیا ۔

مسلم لیگ کے قیام کے بعد اس کا سب سے پہلا اجلاس دسمبر 1907 ء کو کراچی (صوبہ سندھ) میں ہی منعقد ہوا ۔ مکمل صوبہ بننے کے بعد اکتوبر 1938 ء میں سندھ لیگ کانفرنس کا اجلاس ہوا ۔ اس کی صدارت قائداعظم نے کی ۔ اس اجلاس میں ایک قرار داد منظور کی گئی جس میں مسلم اکثریتی صوبوں میں مسلم حکومت قائم کی تجویز دی گئی تھی :۔

"سندھ صوبائی مسلم لیگ کی یہ کانفرنس ہندوستان میں قیام امن اور دونوں قوموں کی بلا روک ٹوک ثقافتی تعمیر و ترقی ، معاشی اور سماجی بہبود اور سیاسی خود داری کے مفادات کے پیش نظر یہ بات قطعی اور ضروری سمجھتی ہے کہ ہندوستان کو دو وفاقوں میں تقسیم کر دیا جائے ۔ ــــ یعنی مسلم اور غیر مسلم ریاستوں کا وفاق ۔"

"چنانچہ یہ کانفرنس آل انڈیا مسلم لیگ سے سفارش کرتی ہے کہ وہ دستور کی ایک ایسی سکیم وضع کرے جس کے تحت مسلم دیسی ریاستیں اور وہ علاقے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے ، ایک وفاق کی شکل میں مکمل آزادی حاصل کر سکیں ۔"

23- مارچ 1940 ء کو سندھ مسلم لیگ کی نمائندگی سر عبداللہ ہارون نے کی ۔ آپ نے اپنی تقریر میں قرارداد کی حمایت کی اور مسلم اکثریتی صوبوں پر مشتمل آزاد ریاست کے قیام کو ہندوستان کے سیاسی مسائل کا واحد حل قرار دیا ۔

دسمبر 1940 ء میں قائداعظم نے سندھ میں تحریک پاکستان کے لیے مسلمانان سندھ کو اکٹھا کرنے اور انھیں مسلم لیگ کے پرچم تلے لانے کے لیے ایک کمیٹی قائم

کی ۔ اس کمیٹی نے اس سلسلے میں اہم کام انجام دیا ۔ 1943ء میں سندھ میں مسلم لیگی وزارت قائم ہوئی ۔ اس اسمبلی میں 3- مارچ 1943ء کو مطالبۂ پاکستان کی قرار داد منظور کی گئی ۔

1946ء کے انتخابات میں سندھ میں مسلم لیگ نے واضح اکثریت حاصل کی اور اس کے لیڈر سر غلام حسین ہدایت اللہ نے اپنی وزارت بنائی ۔ یہ وزارت مستحکم بنیادوں پر نہ چل سکی اور دسمبر 1946ء میں یہاں نئے انتخابات منعقد ہوئے ۔ ان انتخابات میں مسلم لیگ نے مسلمانوں کے لیے مخصوص تمام نشستیں جیت لیں ۔

3- جون 1947ء کو سندھ اسمبلی کے خصوصی اجلاس میں اکثریتی ممبروں (20 کے مقابلے میں 39) نے پاکستان میں شامل ہونے کا اعلان کیا ۔

شمال مغربی سرحدی صوبہ

شمال مغربی سرحدی صوبے میں انگریزوں نے سیاسی اصلاحات کرنے سے گریز کیا تھا ۔ 1927ء میں قائداعظم نے صوبہ سرحد میں سیاسی اصلاحات کرنے پر زور دیا ۔ اِس صوبے میں مسلمانوں کی آبادی 95 فیصد تھی ۔ بیسویں صدی کے چوتھے عشرے میں یہاں اصلاحات کا نفاذ ہوا ۔ جس سے یہاں کے رہنے والوں کو انتظامی معاملات میں شرکت کا حق اور موقع ملا ۔

23- مارچ 1940ء کو لاہور میں مسلم لیگ کے اجلاس میں سردار اورنگ زیب خاں نے صوبہ سرحد کی نمائندگی کی ۔ آپ نے قرار دادِ لاہور کی حمایت کی ۔ آپ نے برطانوی جمہوریت کی مخالفت کی اور اسے مسلمانانِ ہند کے لیے نقصان دہ قرار دیا ۔ آپ نے اس بات پر زور دیا کہ مسلمان ایک علٰحدہ قوم ہیں ۔ اِسی بنیاد پر انھوں نے مسلمانوں کے لیے علٰحدہ وطن کے لیے پیش کردہ قرار داد لاہور کو ہی درست قرار دیا ۔

صوبہ سرحد میں مسلم لیگ 1943ء میں متحرک ہوئی ۔ قائداعظم نومبر 1945ء کو پشاور گئے اور بعد میں دسمبر 1945ء کو آپ نے مسلم لیگ کانفرنس کے افتتاح کے موقع پر ایک بہت بڑے جلسۂ عام سے خطاب کیا ۔ آپ نے فرمایا کہ 1936ء میں جب وہ پشاور آئے تھے تو اس وقت سرحد کے مسلمان ہندو کانگرس کے دھوکے اور فریب

میں جکڑے ہوئے تھے مگر اب یہاں پر بچہ ، بوڑھا ، جوان ، مرد اور عورت بلکہ ہندو بھی یہ جان چکا ہے کہ مسلم لیگ ہی ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے ۔ اِس کے علاوہ آپ نے فرمایا کہ مسلمانوں کا مطالبہ پاکستان ہے ۔ جہاں وہ اپنے مخصوص اسلامی تہذیب و تمدن اور اسلامی روایات کے تحت حکومت کر سکیں گے ۔ ہمارے مقابلے میں ہندو کانگرس ہے جو اکھنڈ بھارت کا مطالبہ کر رہی ہے ، جہاں وہ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کو اقلیت بنا کر ہندوستان کی مرکزی حکومت کے ماتحت ہر لحاظ سے غلام بنا سکے ۔ اس کے بعد آپ نے زور دے کر کہا کہ اب ہندوؤں کے سامنے دو راستے ہیں یا تو وہ مسلمانوں کو ختم کر دیں یا پھر مسلمانوں کے مطالبۂ پاکستان کو مان لیں ۔ مگر یاد رکھو کہ دس کروڑ مسلمانوں کو کبھی بھی ختم نہیں کیا جا سکتا ۔

اس زمانے میں صوبۂ سرحد میں کانگرس کی حلیف حکومت تھی ۔ اس حکومت نے مسلم لیگ کے رضاکاروں اور رہنماؤں پر زیادتیاں شروع کر دیں ۔ اس کے خلاف یہاں مسلم لیگ نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی اور مطالبہ کیا کہ یہ حکومت اپنا اعتماد کھو چکی ہے اس لیے اسے مستعفی ہو جانا چاہیے ۔ صوبائی حکومت کے خلاف ایک اخبار 'صدائے پاکستان' شروع کیا گیا ۔ اس کے علاوہ ایک خفیہ ریڈیو اسٹیشن بھی قائم کیا گیا ۔ اس کے ذریعے صوبے کے مختلف علاقوں میں مسلم لیگ کے کارکنوں کو ہدایت پہنچائی جاتی تھیں ۔ صوبائی حکومت کے خلاف تحریک میں تقریباً آٹھ ہزار مسلم لیگی رہنماؤں اور کارکنوں کو گرفتار کر کے جیلوں میں ڈال دیا گیا ۔

حکومتِ برطانیہ نے جب ہندوستان کو تقسیم کرنے کا اعلان کیا تو صوبہ سرحد میں بھی استصواب رائے کے ذریعے عوام سے فیصلہ کروانا مقصود تھا کہ وہ پاکستان میں شامل ہوں گے یا بھارت میں ۔ ان حالات میں صوبہ سرحد کی کانگرسی حکومت نے تقسیم کے اعلان کے فیصلے پر عمل درآمد کی بجائے صوبہ سرحد کو ایک آزاد ریاست 'پختونستان' بنانے کا اعلان کر دیا ۔ آخر گورنر جنرل کی مداخلت پر پختونستان کے معاملے پر استصواب رائے روک دیا گیا اور پاکستان میں شمولیت کے قضیئے پر استصواب رائے ہوا ۔ اس میں مسلم لیگ کو زبردست کامیابی ہوئی ۔ سرحد کی پاکستان میں شمولیت کے حق میں 2 لاکھ 89

ہزار دو سو چوالیس اور مخالفت میں 2 ہزار آٹھ سو چوہتر ووٹ ڈالے گئے ۔ اس طرح ڈالے گئے ووٹوں میں سے 99 فیصد ووٹ پاکستان کے حق میں گئے اور صوبہ سرحد پاکستان کا ایک حصّہ بن گیا۔

یاددہانی

* دوسری جنگ عظیم کے دوران ہندوستان پر شدید اثرات مرتب ہو رہے تھے ۔ اِس جنگ کے دوران حکومت برطانیہ ہر قیمت پر ہندوستان اور یہاں کی سیاسی جماعتوں کا تعاون چاہتی تھی ۔

* اگست 1940 ء میں حکومتِ برطانیہ نے ہندوستان کو خود اختیاری کے سلسلے میں چند مراعات دینے کا اعلان کیا ۔ مگر وفائی کونسل کی تشکیل میں مسلم لیگ کو اس کے غیر نامزد کردہ افراد کو شامل کرنے پر سخت اعتراض تھا ۔ اس سے سیاسی فضا خراب ہو گئی ۔

* کرپس تجاویز کا مقصد ہندوستانی سیاسی جماعتوں کا جنگی صورتحال میں ضروری تعاون حاصل کرنا تھا ۔ اس کی تجاویز کو مسلم لیگ اور کانگرس دونوں بڑی جماعتوں نے رد کر دیا ۔

* کابینہ مشن سے پہلے ہندوستانی سیاست میں بہت سے اتار چڑھاؤ آئے اور اس دَور میں یہ بات واضح ہو گئی کہ کانگرس اور مسلم لیگ دو مختلف نظریات رکھنے والی جماعتیں ہیں اور ان دونوں کا نصب العین بھی ایک دوسرے سے مختلف ہے ۔

* 1944 ء میں لارڈ ویول نے ہندوستان کو متحد رکھنے کے سلسلے میں اپنی تجاویز مرتب کیں اور اس سلسلے میں شملہ میں ایک کانفرنس بھی منعقد ہوئی مگر اس کو بھی دونوں جماعتوں نے منظور نہ کیا ۔

* 1945 ء میں ہندوستان میں انتخابات منعقد ہوئے اور ان میں مسلم لیگ نے نمایاں کامیابی حاصل کر کے یہ ثابت کر دیا کہ وہی مسلمانانِ ہند کی نمائندہ جماعت ہے ۔ اس

انتخاب میں یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ مسلمانانِ ہند کو مسلم لیگ کے قیام پاکستان کے نظریے سے بھی مکمل اتفاق ہے۔

* کابینہ مشن پلان کی تجاویز کے نفاذ کے موقع پر انگریزوں اور کانگرس کی ملی بھگت کے خلاف مسلم لیگ نے اگست 1946ء کو یوم راست اقدام منایا۔

* عبوری حکومت میں مسلم لیگ کے نمائندے نواب لیاقت علی کو محکمہ خزانہ کا وزیر بنایا گیا۔ ان کے پیش کردہ بجٹ سے کانگرس کے حلیف صنعت کاروں کو سخت زک پہنچی۔ کانگرس نے مسلم لیگ کو وزارت خزانہ دینے کو غلطی قرار دیا۔

* تین جون پلان اور بعد ازاں آزادئ ہند کے قانون کے تحت 14- اگست کو ہندوستان میں برطانوی راج ختم ہو گیا اور یہاں ہندوستان اور پاکستان کے نام سے دو آزاد مملکتیں وجود میں آگئیں۔

* ریڈ کلف ایوارڈ میں مسلم علاقوں کو محض سیاسی فیصلے کے تحت ہندوستان میں شامل کیا گیا۔

غور و فکر کے لیے چند نکات

(الف)

1- یہ بات طے ہے کہ انگریز اور کانگرس ہندوستان کی تقسیم نہیں چاہتے تھے، ان عناصر کا تجزیہ کریں جن سے ہندوستان کی تقسیم ممکن ہوئی۔ اس سلسلے میں دوسری جنگِ عظیم کی ابتدا سے لے کر 14- اگست 1947ء تک کے واقعات کا جائزہ لیں؟

2- 1945-46ء کے انتخابات سے مسلم لیگ کو جو سیاسی فوائد حاصل ہوئے، ان کا تجزیہ کریں؟

(ب) مختصر جواب دیں۔

1- دوسری جنگِ عظیم کے دوران برطانوی حکومت نے ہندوستان کی سیاسی جماعتوں سے تعاون حاصل کرنے کے لیے جو تجاویز پیش کیں، ان کا ہندوستانیوں کے نقطۂ نظر

سے جائزہ لیں؟

II- کابینہ مشن اور عبوری حکومت کے قیام کے سلسلے میں انگریزوں ، ہندوؤں اور مسلمانوں کے نقطۂ نظر کی وضاحت کریں؟

III- ہندوستان کی تقسیم کے سلسلے میں برطانوی حکومت کے اعلانات پر مختصر نوٹ لکھیں؟

(ج) ہاں یا نہیں میں جواب دیں ۔

1- دوسری جنگِ عظیم سے پہلے برطانیہ ، ہٹلر کا حامی تھا ۔

2- اگست 1940ء کے وائسرائے کے اعلان میں ہندوستان کو مکمل آزادی دینے کا اعلان کر دیا گیا تھا ۔

3- دوسری جنگ عظیم میں برطانیہ کی حالت خراب ہونے پر ، حکومت برطانیہ نے کرپس مشن ہندوستان بھیجا ۔

4- کرپس مشن میں ہندوستان کو تین زونوں میں تقسیم کرنے کا اعلان کیا گیا تھا ۔

5- جنگِ عظیم دوم کے دوران ، کانگرس کا سب سے بڑا مطالبہ ہندوستان کی آزادی تھا ۔

6- 1945-46ء کے انتخابات کے نتیجے میں مسلم لیگ نے پنجاب اور سرحد میں اپنی وزارتیں قائم کیں ۔

7- کابینہ مشن پلان کو مسلم لیگ نے رد کر دیا ۔

تیار کردہ: پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور
منظور کردہ: وفاقی وزارتِ تعلیم حکومتِ پاکستان اسلام آباد

فرمانِ قائدِاعظم رح

آپ کی توجہ صرف حصُولِ علم کے لیے وقف رہے، صِرف اِسی صورت میں آپ اپنے مُلک کو دُنیا کا عظیم، طاقتور اور ترقی یافتہ ملک بنا کر سرخروئی حاصل کر سکتے ہیں۔ (نوجوانوں سے خطاب)

سیریل نمبر 27[illegible]9

ایڈیشن	طباعت	تاریخ اشاعت	تعداد اشاعت	قیمت
اوّل	اوّل	ستمبر 1993	5000	20.75